بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں تاریخی مآخذ

(انیسویں صدی)

پروفیسر ڈاکٹر ام سلمیٰ

شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

مقدمہ

پروفیسر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری

شعبۂ اُردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، انڈیا

مرتب

پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی

شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

مرکز ادبیات وتحقیقات

সাহিত্য ও গবেষণা কেন্দ্র

(Center for Literature & Research)

بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں تاریخی مآخذ (انیسویں صدی)

پروفیسر ڈاکٹر ام سلمیٰ

مقدمہ : **پروفیسر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری**

مرتب : **پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی**

+8801817660636,grabbanidu@du.ac.bd

ناشر : **ڈاکٹر انیس مالک**

مرکز ادبیات وتحقیقات

1/11 بنگلہ بازار، ڈھاکہ، بنگلہ دیش

اشاعت اول : اکتوبر ۲۰۲۱

اشاعت ثانی : اگست ۲۰۲۶

کمپوزنگ: محمد شفیق الاسلام

نظرِ ثانی : ڈاکٹر رشید احمد، تسریب ابراہیم ماہین

قیمت: ۶۰۰ ٹاکا

Price: 600 Taka ($ 7)

ISBN : 978-984-34-8533-5

Bangladesh ke Farsi awr Urdu adab me tarikhi makhaz [Historical Sources in Persian & Urdu Literature of Bangladesh (19th Century)] by **Professor Dr. Umme Salma.** Edited by **Professor Dr. Mohammad Golam Rabbani**. Published by **Dr. Anis Malek**, Sahitya o Gobeshona Kendra (Center for Literature & Research), Dhaka, Bangladesh

Publisher's Note

When we were growing up, we found that my mother, Professor Dr. Umme Salma, was devoted to her academic works most of the daytime. She used to work in the Urdu Department, University of Dhaka and served as the Head of the Department before her sad demise in 2008. We often visited her office, and we found her sincere consecration towards her duty. We found that she was mostly guiding some of her students, checking exam scripts, or in discussions with other professors. Even when she returned home after her office work, we still remember writing in her diary. Our father, Dr. Md. Abdul Malek, Professor of the Bangabandhu Sheikh Mujib Medical University, usually came late. We could still remember that he often urged the mother to finish the writing with some encouraging words. Once, we asked her about what she was doing, and she replied, 'This is history, and you will not understand.' This memory of childhood is still alive in our thoughts.

After my mother's demise, Professor Dr. Golam Rabbani, to whom we consider as good as our family members, came to us with my mother's thesis and urged that this would be an excellent document to publish as a book. Dr. Rabbani kindly took the responsibility to assemble the writings of Dr. Umme Salma with other notes of her and finally compiled it as the book titled,

بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں تاریخی مأخذ (انیسویں صدی)
'Historical Sources in Bangladeshi Persian & Urdu Literature (19th Century)'. We want to convey our heartfelt thanks to Dr. Golam Rabbani for his relentless efforts. We hope that this book will inspire the students and researchers to take action, have an impact and move forward, and eventually revitalize the knowledge of the history of linguistics.

We sincerely hope that the passionate energy of Dr. Umme Salma, which is reflected through her writings, will flow towards the future generation and, in turn, will become medium of what's achievable.

Dr. Anis Malek
Dr. Shirin Malek
Dr. Arif Malek

فہرست

ڈاکٹر ام سلمیٰ اور ان کی کتاب ۹
مقدمہ ۱۳
پیش لفظ ۲۷
باب اول: بنگلہ دیش: ایک مختصر تعارف ۳۱
باب دوم: بنگال میں فارسی ادب کی تاریخ ۵۵
باب سوم: بنگال میں اردو ادب کی تاریخ ۱۰۹
کلکتہ میں اردو ادب: انیسوی صدی تک ۱۱۵
مرشد آباد میں اردو (انیسویں صدی تک) ۱۳۲
ہوگلی میں اردو (انیسویں صدی تک) ۱۳۹
مٹیا برج میں اردو (انیسویں صدی تک) ۱۴۲
ٹالی گنج میں اردو (انیسویں صدی تک) ۱۴۶
ڈھاکہ میں اردو (انیسویں صدی تک) ۱۴۸
سلہٹ میں اردو (انیسویں صدی تک) ۱۵۵
باب چہارم: بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں سیاسی تاریخ کے مآخذ ۱۶۷
جامع التواریخ ۱۶۷
احادیث الخوانین ۱۷۳

صحیفۃ الاعمال ۱۷۹
گنج تواریخ ۱۸۵
کنز تواریخ ۱۸۷
ریاض النور ۱۸۹
تاریخ کشمیریان ڈھاکہ ۱۹۰
تواریخ خاندان کشمیریہ ۱۹۱
جنگ ہفت سالہ ۱۹۶
تاریخ نصرت جنگی ۱۹۹
صولت عالم گیری ۲۰۲
تواریخ ڈھاکہ ۲۰۴
تواریخ ہند ۲۱۰
باب پنجم: بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں سماجی تاریخ کے مآخذ ۲۱۷
خیالات آزاد ۲۱۷
نوابی دربار ۲۲۱
روئداد طوفان آفت نشان ۲۲۴
خدا کی شان ۲۲۵
بیمار بلبل ۲۳۱
قصیدہ در تہنیت ملکۂ معظّمہ وکٹوریا ۲۳۴
پند نامۂ کاظم ۲۳۶
روئداد زلزلہ ۲۳۸
انجمن احباب اسلامیہ ڈھاکہ ۲۴۱

باب ششم: بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں مذہبی تاریخ کے مأخذ ۲۴۸

سہیل یمن ۲۴۸

گلزار نعت ۲۵۲

احسن العقائد ۲۵۴

براہین جیاد فی سد باب الالحاد ۲۵۵

رسالہ چراغ ایمان ۲۵۷

کلمۂ حق ۲۵۹

فتاوی شوکت محبوب سبحانی ۲۶۰

مقامات محبوب سبحانی ۲۶۲

صحیح شمس العارفین ۲۶۳

دافع الشبہات فی جواز الاستیجار علی الطاعات ۲۶۴

نظم العقائد ۲۶۵

مصدر فیض محمدی ۲۶۶

رکن الاعظم ۲۶۸

دیوان ویسی ۲۷۰

طریق الرشاد فی تحقیق جواز اقامۃ الجمعہ والاعیاد فی ہذہ البلاد ۲۷۲

نصرۃ المسلمین فی الرد علی غیر المقلدین ۲۷۳

تحفۃ المحسنین ۲۷۵

جام توحید ۲۷۷

تحفۂ مجددیہ ۲۷۸

مکاشفات رحمت ۲۷۸

تزکیۃ العقائد ۲۸۲

حجت قاطعہ ۲۸۳

مقامع المبتدعین ۲۸۵

قول الامین ۲۸۸

مراۃ الحق ۲۸۹

اطمینان القلوب ۲۹۰

مراد المریدین ۲۹۱

باب ہفتم: بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں ادبی تاریخ کے مأخذ ۲۹۵

سخن شعراء ۲۹۵

قطعہ منتخب ۲۹۸

قند پارسی ۳۰۱

زبان ریختہ ۳۰۳

تذکرۃ المعاصرین ۳۰۴

باب ہشتم: بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں شخصی تاریخ کے مأخذ ۳۰۹

خودنوشت سوانح حیات عبدالغفور نساخ ۳۰۹

تحفۂ محبوب سبحانی ۳۱۵

داستان عبرت بار ۳۱۶

اختتام ۳۲۱

کتابیات ۳۲۷

ڈاکٹر ام سلمیٰ اور ان کی کتاب

الحمدللہ رب العالمین۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کتاب کوشائع کرنے کا موقع فراہم فرمایا ہے۔ ہم اس معتبر کتاب کو قارئین اور محققین کے سامنے پیش کر سکے۔

شعبۂ اردو اور فارسی کے پروفیسر ڈاکٹر ام سلمیٰ ایک مثالی استاد تھیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے ۳۴ سال شعبۂ اردو اور فارسی میں گزارے۔ ۲۰۰۷ میں جب شعبہ فارسی اور شعبۂ اردو الگ ہوئے تو انہیں شعبۂ اردو کے چیئر مین کی ذمہ داری سونپی گئی۔ انہوں نے اس ذمہ داری کو پوری لگن اور مستعدی کے ساتھ نبھایا اور شعبۂ اردو کی ترقی کی۔ وہ "ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو اور فارسی" کے مدیر کے طور پر خدمت انجام دیں۔ انہوں نے اپنی مختلف بیماریوں کے باوجود انتھک محنت کی۔ بالآخر ۱۱ اکتوبر ۲۰۰۸ بروز ہفتہ صبح ۷ بجے کولکاتا کے اپولو ہسپتال میں ۶۱ سال کی عمر میں اپنے مالک حقیقی کی پکار پر لبیک کہا اور ڈھاکہ کے میر پور میں مدفون ہوئیں۔

ڈاکٹر ام سلمیٰ کی زندگی کا آغاز ۲ جون ۱۹۴۷ کو (سند کے مطابق) ضلع کملا (موجودہ برہمن باریا ضلع) کے قصبہ تھانے کے دھرم پور گاؤں میں ہوا۔ اپنے والد شمس الدین احمد کی ملازمت کے سلسلے میں وہ پاکستان کے مختلف علاقوں میں مقیم تھیں۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم راولپنڈی، پاکستان میں شروع کی۔ انہوں نے ۱۹۶۲ میں راولپنڈی کے سینٹ میری ہائی

سکول سے میٹرک پاس کیا۔ پھر ۱۹۶۴ میں راولپنڈی گورنمنٹ کالج برائے خواتین سے انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ انہوں نے اسی کالج سے ۱۹۶۶ میں بی اے پاس کیا۔ انہوں نے ۱۹۶۹ میں پنجاب یونیورسٹی کے تحت اردو میں ایم اے کیا۔ پنجاب سے ۱۹۷۰ میں بی ایڈ بھی کی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی سے ۱۹۹۱ میں شعبۂ عربی کے پروفیسر ڈاکٹر محمد ابوبکر صدیق کے زیر نگرانی اپنے تحقیقی مقالہ بعنوان ''بنگلہ دیش میں فارسی اردو ادب کے تاریخی مآخذ'' پیش کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

ڈاکٹر ام سلمیٰ نے ۱۹۷۴ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے فارسی اور اردو شعبے میں بطور لکچرار شمولیت اختیار کی۔ لکچرار ہوتے ہوئے، انھوں نے ۱۹۷۹ میں فارسی میں ایم اے کیا۔ ۱۹۷۹ سے ۱۹۸۳ تک انھوں نے انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز کے تحت عربی پڑھائی اور فارسی میں مختلف کورسز مکمل کئے۔ اسی دوران ۱۹۸۱ میں ان کو اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر ترقی ملی۔ ۱۹۸۸ میں ایسوسی ایٹ پروفیسر اور ۱۹۹۴ میں انہیں پروفیسر کے عہدے پر ترقی دی گئی۔
۱/۷/۱۹۸۵ سے ۳۰/۶/۱۹۸۸ تک آپ نے شعبۂ فارسی اور اردو کے چیئر مین کے طور پر خدمات انجام دیں۔ دوسرے مرحلے میں وہ ۱۰/۳/۲۰۰۷ سے ۸/۷/۲۰۰۸ تک شعبۂ اردو کے چیئر مین رہیں۔

ان کی تصنیفات ادبی معیار پر اترتی ہے۔ وہ اردو، بنگالی، فارسی اور انگریزی میں یکساں مہارت سے لکھ سکتی تھیں۔ ان کی متعدد تحریریں بنگالی، اردو، فارسی اور انگریزی تحقیقی جرائد اور اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی تحریریں بنگلہ دیش، پاکستان، ہندوستان اور ایران کے

مختلف اخبارات میں شائع ہوئیں۔ وہ اندرون و بیرون ملک کے مختلف سیمینارز میں شرکت کی۔ پاکستان میں رہنے کی وجہ سے ان کا اردو تلفظ اور لہجہ بالکل اردو بولنے والوں جیسا تھا۔ ان کے الفاظ کا چناؤ منفرد ہے۔ اس کے جملے کی ساخت بہترین ہے۔ وہ بنگلہ دیش کی ایشیا ٹک سوسائٹی، انجمن اردو، بنگلہ دیش اتحاش پریشد سمیت مختلف تنظیموں اور انجمنوں کے رکن کے طور پر کام کرچکی ہیں۔

وہ بنگلہ دیش میڈیکل کالج کے مائیکرو بایولوجی ڈیپارٹمنٹ کے پروفیسر ڈاکٹر عبدالمالک کی اہلیہ اور دو بیٹے ڈاکٹر انیس مالک اور ڈاکٹر عارف مالک اور ایک بیٹی ڈاکٹر شیریں مالک کی ماں تھیں۔ وہ ہمیشہ صاف ستھری زندگی گذارتی تھیں۔ عاجزی انکساری اور شفقتانہ صفات کی حامل تھیں۔ ان کی محبت اور شفقت آج بھی ہمیں ان کی یاد دلاتی ہیں۔ ان کے مضامین، تحقیقی کام آج بھی ہمارے ساتھ ہیں۔

میں نے ڈاکٹر ام سلمیٰ کی زیر نگرانی ایم فل کیا۔ ۲۰۰۴ میں شعبۂ اردو و فارسی میں بحیثیت لکچرار میرا بھی شمولیت ہوگیا۔ ۲۰۰۶ میں ڈاکٹر ام سلمیٰ کی قیادت میں شعبۂ اردو کے ۸ اساتذہ نے پاکستان کا دورہ کیا۔

ہماری شائع کردہ یہ کتاب دراصل ان کی پی ایچ ڈی (PhD) کا مقالہ ہے۔ انہوں نے اسے ۱۹۹۰ میں لکھا۔ اس وقت بنگلہ دیش سے اردو کتابوں کی اشاعت میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس لئے اُس وقت یہ مقالہ کتابی شکل میں شائع کرنا ممکن نہ ہوسکا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے ڈاکٹر انیس ملک ٹیپو نے مجھے ۲۰۱۱ء میں اس کی اشاعت کی

ذمہ داری سونپی۔ اسے مرتب کرنے کا معاملہ آسان نہیں تھا۔ کمپوز ہونے کے بعد ضروری ایڈیٹنگ کی گئی۔ کتاب کی بہت سی معلومات ۱۹۹۰ کی تھی، جو ۲۰۲۱ میں کافی بدل گئی ہیں۔ اس لیے مصنفہ کی تحریری شکل کو بالکل درست رکھتے ہوئے ایڈیٹر کی حیثیت سے میرے جانب سے شامل کردہ حصے تیسری قوسین [] میں پیش کیا۔ اگر آپ کو پرنٹنگ کی کوئی غلطی یا معلوماتی غلطی نظر آئے تو ہمیں ضرور اطلاع فرمائیں۔

چوہدری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ، انڈیا کے پروفیسر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اس کتاب کے لیے ایک مقدمہ بہت محنت سے لکھا ہے۔ اس لیے میں محترم پروفیسر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کا خاص طور پر مشکور ہوں۔

کتاب کی اشاعت کے لیے مالی تعاون، جسمانی محنت اور حوصلہ افزائی کرنے والوں کو اللہ جزائے خیر عطا فرمائے۔ خاص طور پر شعبۂ اردو کے پروفیسر ڈاکٹر رشید احمد، میرے شاگرد شفیق الاسلام، تسریب ابراہیم ماہین، میری اہلیہ ماہین فردوس، زمزم کے امرأ القیس نعیم، بیساکھی کریئشن کے ریاض حیدر وغیرہ کے تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری ڈاکٹر انیس مالک، ڈاکٹر عارف مالک، ڈاکٹر شیریں مالک اور عبداللہ المعید نے لی۔ ہم ان کے خدمت کا شکرگزار ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری کاوشوں اور عملوں کو قبول فرمائے۔

ڈاکٹر محمد غلام ربانی
پروفیسر، شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی

مقدمہ

بنگلہ دیش میں اردو فارسی کے حوالے سے اہم تحقیقی کارنامہ

پروفیسر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری

بنگلہ دیش کے وجود اور اس کی اردو و فارسی میں حیثیت کو ظاہر کرنے والی یہ کتاب ''بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں تاریخی ماخذ'' انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ بنگلہ دیش سے متعلق فارسی اور اردو ادب کے حوالے سے کسی بھی تحقیق کرنے والے کے لئے ناگزیر ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر ام سلمٰی جو شعبۂ اردو فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی کی صدر بھی رہ چکی ہیں، نے اس کتاب کے ذریعہ نہ صرف بنگلہ دیش کی اہمیت و افادیت کو واضح کیا ہے بلکہ سیاسی ،سماجی ، مذہبی ، تاریخی ،لسانی اور معاشی زندگی کو عمدگی سے پیش کیا ہے۔ پروفیسر ام سلمٰی نے تحقیق کے اصولوں کا بھی پاس رکھا ہے اور حقائق کو حوالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ کتاب جہاں ڈاکٹر ام سلمٰی کو ایک محقق ثابت کرتی ہے وہیں بنگلہ دیش کے تعلق سے بہت ساری غلط

فہمیوں کا ازالہ بھی کرتی ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر ام سلمٰی نے مختلف ابواب کے تحت ہزاروں کتب کا نہ صرف مطالعہ کیا ہے بلکہ انہیں عام قاری کے لئے اہل بنا کر پیش کیا ہے۔ دراصل یہ ڈاکٹر ام سلمٰی کا پی۔ ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ جسے انہوں نے ڈاکٹر ابو بکر صدیق جو کہ علی گڑھ سے پی۔ ایچ ڈی تھے اور شعبۂ عربی ڈھاکہ یونیورسٹی کے صدر بھی تھے، کی رہنمائی میں ''بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں تاریخی ماخذ انیسویں صدی میں'' موضوع پر ڈھاکہ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ مقالہ دیگر مقالوں سے یوں منفرد ہے کہ اس میں جن کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے وہ مستند ادبی کتابیں ہیں۔ فارسی اور اردو کی بنگال کے حوالے سے تاریخ کا مطالعہ کرنا ہو تو یہ کتاب بہت معاون ثابت ہوتی ہے۔

اسے کتابی شکل میں مرکز ادبیات وتحقیقات کے ذریعہ شائع کرنے کا فیصلہ لائق تحسین ہے۔ اس کے مرتب پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی (سابق صدر، شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی) ہیں۔

کتاب کی اہمیت کی پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب تحقیق کرنے والوں کے لئے انتہائی اہم اور ضروری ہے۔ کتاب کے آٹھ ابواب ہیں۔ ان آٹھوں ابواب میں بنگلہ دیش کا تعارف اور بنگلہ دیش میں فارسی اردو کے حوالے سے گفتگو شامل ہے۔ پہلا باب جس کا عنوان ''بنگلہ دیش : ایک مختصر تعارف'' ہے۔ میں ایک طرف بنگال اور بنگلہ کے معنی اور اس کا اشتقاق دیا ہے۔ ڈاکٹر ام سلمٰی نے یہ بھی واضح کیا ہے کی سنسکرت میں بنگال لفظ کی دلیلیں ملتی ہیں خود ابوالفضل نے ''آئینہ اکبری'' میں بنگال لفظ کے تعلق سے لکھا ہے:

> ''ابوالفضل نے "آئین اکبری" میں بنگال لفظ کے اشتاق کے بارے میں جو بیان دیا ہے وہ زیادہ مدلل اور صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ان کی رائے میں

لفظ "بنگال" "بنگ" اور "ال" ان دو الفاظ سے مرکب ہے۔ "ال" کے معنے زراعتی زمین جس کے چاروں طرف مٹی کا بند باندھا جاتا ہے تاکہ اس میں پانی داخل نہ ہو سکے۔ چنانچہ "بنگال" کے معنی "قوم بنگ کی زمین" ہے۔''

(پروفیسر ڈاکٹر ام سلمی، بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں تاریخی مأخذ (انیسویں صدی)، ص، ۳۱)

یہ بات سب کو پتہ ہے کہ جب 1947ء میں ہندوستان آزاد ہوتو مسلم اکثریتی علاقوں کو پاکستان کے نام سے الگ ملک کی حیثیت دی گئی۔ اس میں پاکستان کے دو حصے ایک مغربی پاکستان اور ایک مشرقی پاکستان شامل تھے۔ مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان سے تقریباً دو ہزار کلومیٹر دو تھا۔ جس کا اثر پاکستان کی حکومت پر پڑنا ہی تھا۔ ایک تو دوری اور دوسرے زبان کا مسئلہ یعنی مشرقی پاکستان کے کونے کونے میں بنگلہ زبان بولنے والے مسلمان آباد تھے۔ ان کا مزاج مغربی پاکستان سے میل نہیں کھایا۔ مشرقی پاکستان کی مختلف سیاسی جماعتوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کی جس کے نتیجہ میں مغربی پاکستان کی افواج نے مشرقی پاکستان کے لوگوں پر ظلم وستم ڈھانے شروع کر دیے۔ لیکن شیخ مجیب الرحمٰن نے ہندوستان کی مدد سے پاکستانی افواج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ نتیجہ کے طور پر 19/ دسمبر 1971ء کو مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان سے آزاد اور الگ ہوا اور اس کا نام بنگلہ دیش رکھا گیا۔ بنگلہ دیش میں تقریباً 99 فیصد لوگ بنگلہ زبان بولنے والے تھے۔ اس لئے بنگلہ زبان کو وہاں کی قومی زبان طے کیا گیا۔ بنگلہ دیش کے تین طرف ہندوستانی صوبے ہیں ایک طرف برما اور سمندر کا علاقہ ہے جس سے وہاں ہر سال سیلاب آیا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی بڑے طوفان بھی وہاں کی بڑی آبادی کو نقصان پہنچا جاتا ہیں۔

اس باب میں ڈاکٹر ام سلمٰی نے بنگلہ دیش کے تعلق سے تمام ضروری معلومات فراہم کیں مثلاً معیشت ،زبان، آبادی، جنگلات، کھیتی باڑی، معدنیات، فن تعمیر، نقاشی، نشر واشاعت، رسائل یعنی نقل وحمل، تعلیمی نظام وغیرہ کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔

کتاب کے دوسرے باب ''بنگال میں فارسی ادب کی تاریخ'' میں ڈاکٹر ام سلمٰی نے تحقیق سے کام لیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ بہت پہلے فارسی زبان کو یہاں سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا۔ کیا ہندو کیا مسلمان سب فارسی بولا کرتے تھے۔ ڈاکٹر ام سلمٰی لکھتی ہیں:

''جیسے تندکی "چتینا منگل" سے ہمیں ملک کے ہندوؤں پر مسلمانوں کے رہن سہن اور فارسی ادب کے بتدریج اثرات کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ ہندوؤں کے آداب کا نقشہ یوں کھینچتا ہے۔

برہمن داڑھی رکھتا ہے۔ فارسی پڑھتا ہے۔ موزے پہنتا ہے۔ ایک ہاتھ میں لکڑی۔ دوسرے میں کمان رکھتا ہے۔ مثنوی بھی سناتا ہے۔ قدرتی طور پر ہندو بھی فارسی ادب اور زبان سے اثر پذیر تھے یہ اثرات زیادہ تر نفس مضمون، تخیل اور اس ملک کی زبان اور تراجم میں نمایاں ہیں۔''

(پروفیسر ڈاکٹر ام سلمی، ص، ۵۶)

بنگال میں فارسی کی پہلی کتاب علی مردان خلجی (1209-1216) کے عہد میں لکھی گئی۔ جسے سنسکرت کی مشہور کتاب (امرت اخوند) کا ترجمہ مانا جاتا ہے۔ جو ایک معروف برہمن نے لکھی تھی جو بعد میں اسلام لے آیا تھا۔ جو سلمان علی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہی امرت اخوند نام کی کتاب بنگال میں فارسی کی پہلی تصنیف مانی جاتی ہے بعد میں غیاث الدین بلبن اور بنگال کے گورنر بغراخاں کے زمانے میں شاعری کے بڑے چرچے

ملتے ہیں۔ بغرا خاں خود ادب کے دلدادہ تھے اس لئے وہ ایسے لوگوں کی بہت قدر کرتے تھے ۔ان قابل ذکر لوگوں میں شمس الدین مدبّر بھی تھے جنہوں نے گورنر بنگالا کی تعریف میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا۔جس کا ذکر عبدالقادر بدایونی نے اپنے تذکرہ منتجب التواریخ میں بھی کیا ہے۔اس طرح بنگال میں فارسی شعر و ادب کی مختلف و متعدد کتابوں کا ذکر ڈاکٹر ام سلمیٰ نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔خواہ وہ شرف نامہ ہو، سکندر نامہ ہو، صُبح صادق، گنج راز ہو یا پھر فتح الیسریہ، جو تاریخ کے موضوع پر بہت مشہور کتاب ہے۔اس طرح تاریخ بنگالا ہو یا دیوان عبیدی ہو یا خورشید جہاں نماں ہو، الغرض یہ کہا جاسکتا ہے کہ فارسی کے حوالے سے بنگال میں جو اہم کتابیں شائع ہوئیں سب کا ذکر اس کتاب میں سمیٹا گیا ہے۔

تیسرے باب ''بنگال میں اردو ادب کی تاریخ'' میں ڈاکٹر ام سلمیٰ نے اردو کے ابتدائی نقوش کا ذکر مختلف حوالوں سے کچھ اس طور کیا ہے۔

''اس قسم کی اردو دسویں صدی ہجری کے شعراء مثلاً شیخ عبدالقادر گنگوہی اور بہاء الدین برماوی کے کلام میں بھی عام ہے۔شیخ جیون، محبوب عالم اور مولا ناعبدی گیارہویں صدی کے مشہور شعراء گذرے ہیں۔

بنگال میں شیخ نور الحق پنڈوی (متوفی ۸۱۳ھ) کے اردو جملے اور اقوال برابر ملتے ہیں۔حضرت مخدوم اشرف جہانگیر کی اردو سے بنگال، بہار اور اودھ کو شرف حاصل ہوا اور شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری بنگال میں بھی رہے۔

اس دور کے بنگالی ادب میں بھی ایسے الفاظ ملتے ہیں جس میں عربی اور فارسی اور ہندی کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔اس کی مثال مسلمانوں کے

ابتدائی دور کی ایک کتاب ''شینہ پران'' کے ایک عنوان ''نرنجن رشمہ'' میں موجود ہے جس میں شاعر نے حسب ذیل الفاظ استعمال کئے ہیں۔

کالوٹوپی، کمان، خدا، نام، اوتار، ازار، آدمنا (آدم)، محمد، پیغمبر، نمازی، قاضی، شیخ، مولانا، حیابی بی، بی بی نو، ایک من، پکڑ و وغیرہ۔

بنگال میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سے اس ڈھانچے کے نمونے مقامی بولیوں میں بھی ملتے ہیں۔''

(پروفیسر ڈاکٹر ام سلمی، ص،۱۱۱)

بنگال میں بہت سی زبانیں پہلے بولی جاتی تھیں جن میں سندھی، ملتانی، پنجابی، ہندوستانی (کھڑی بولی) برج راجستھانی وغیرہ بولیوں کا چلن تھا۔بنگال میں ان کا ایک ابتدائی ڈھانچہ تیار ہو رہا تھا جس کا سب سے بڑا سبب بنگال میں مسلمانوں کی آمد تھی۔اور بعد میں یہ زبان بنگال کے عوام کی مقبول زبان بن گئی تھی لیکن ایڈم رپورٹ کے مطابق کچھ اور ہی نقشہ سامنے آتا ہے مسٹر ایڈم لکھتے ہیں:

''بنگال کے اضلاع میں زیادہ تر بنگلہ زبان رائج ہے۔لیکن مجھے خاص مرشد آباد میں اردو استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئی اردو بنگال اور بہار کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی زبان ہے ساتھ ہی یہ بازاری زبان بھی ہے لیکن اردو کا استعمال کسی بھی تعلیم گاہ میں نہیں کیا جاتا۔بنگال کے ہندو بنگالی کتاب پڑھتے ہیں اور بہار کے ہندوؤں کے اسکولوں میں ہندی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔حالانکہ اردو عام فہم زبان ہے اور مندرجہ بالا دونوں زبانوں سے ترقی یافتہ ہے اس زبان میں خیالات کی ترجمانی بہتر طور پر کی جاسکتی ہے اور اس کا ادب نسبتاً ترقی یافتہ ہے لیکن تعجب ہے کسی اسکول میں اردو کی کوئی

> کتاب ہی نہیں ۔ یہ زبان محض روزانہ استعمال کی بازاری زبان ہے اور کاروباری لوگ اسے بولتے ہیں۔ مدرسوں میں فارسی اور عربی کے سبق اسی زبان کی مدد سے اساتذہ طلباء کو سمجھاتے ہیں لیکن اردو کے لئے صرف اردو کی خاطر کوئی اردو نہیں پڑھتا نہ اردو زبان مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے یہ زبان فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور جو لوگ فارسی جانتے ہیں ضرورت کے تحت اس زبان کو فارسی رسم الخط میں لکھ لیتے ہیں اسی لئے فارسی رسم الخط ہی کو اردو نے اپنا لیا ہے لوگ گیت اور کہانیاں اس زبان میں لکھی جاتی ہیں اور اس کا استعمال عورتوں کو خط لکھتے وقت بھی کیا جاتا ہے۔''

(پروفیسر ڈاکٹر ام سلمٰی، ص،۱۱۳)

ڈاکٹر ام سلمٰی نے بڑی محنت سے ''کلکتہ میں اردو ادب: انیسویں صدی تک'' کے تحت فورٹ ولیم کالج، مدرسہ عالیہ، ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ یونیورسٹی وغیرہ کی اردو خدمات (شعرونثر) کا ایک مکمل جائزہ پیش کیا ہے۔ اس باب کے تحت جہاں ام سلمٰی نے پورے کلکتہ میں اردو زبان وادب کا جائزہ پیش کیا ہے وہیں کچھ خاص علاقوں مثلاً مرشد آباد میں اردو، ہوگلی میں اردو، مٹیا برج میں اردو، کالی گنج میں اردو، ڈھاکہ میں اردو، سلہٹ میں اردو، کا بھی ایک تفصیلی جائزہ اور اردو شعرونثر میں تحریر کردہ تقریباً سبھی اہم کتب کا ذکر کیا ہے۔

باب چہارم ''بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں سیاسی تاریخ کے ماخذ'' چوتھے باب میں ڈاکٹر ام سلمٰی نے فارسی اور اردو کی ایسی کتابوں کا انتخاب کیا ہے جن سے سیاسی تاریخ کا پتہ چلتا ہو۔ اس باب میں ڈاکٹر ام سلمٰی نے بنگلہ دیش کے پس منظر میں ان حوالوں کے ساتھ بات کی ہے جو فارسی اور اردو ادب کی کتابوں میں ملتی ہے ساتھ ہی جن کا تعلق سیاسی

تاریخ سے ہے۔ اس سلسلے میں صاحب کتاب نے متعدد کتابوں کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ ان کو بہتر طور پر اپنی کتاب میں پیش بھی کیا ہے۔ ان میں سے چند خاص کتابوں کے اسماء گرامی اس طرح ہیں، جامعہ التواریخ (قاضی فقیر محمد)، احادیث الخوانین (حمید اللہ خان)، صحیفۃ الاعمال (عبدالعلی دری)، گنج تواریخ (عبدالغفور نساخ)، کنز تواریخ (عبدالغفور نساخ)، ریاض النور (مولانا اجیرالدین مدحت)، تاریخ کشمیریان ڈھاکہ (خواجہ عبدالرحیم صبا)، تواریخ خاندان کشمیریہ (خواجہ احسن اللہ شاہین)، جنگ ہفت سالہ (خواجہ محمد اصغر نقش بندی)، تاریخ نصرت جنگی (نواب نصرت جنگ)، صولت عالم گیری (سید ابوالفضل رنگ پوری)، تاریخ ڈھاکہ (رحمٰن علی طیش)، تواریخ ہند (مولوی عبدالکریم) وغیرہ۔

مذکورہ بالا کتب میں ڈاکٹر ام سلمٰی نے سیاسی تاریخی ماخذ کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ یہاں ان کی تحریر کردہ حوالہ جاتی کتابوں میں سے چند کے متعلق میں ضرور لکھنا چاہوں گا۔ ڈاکٹر ام سلمٰی نے کنز تواریخ جو دراصل گنج تواریخ کا ہی ایک حصہ ہے اور مشاہیر کی تاریخ وفات کے تعلق سے ہے۔ کتاب کی ابتداء حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ وفات سے ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ نساخ نے اپنے ہم عصر اور اپنے سے پہلے کے لوگوں کی تاریخ وفات کو پیش کیا ہے۔ یہاں ڈاکٹر ام سلمٰی نے تنقید نگار کا کردار ادا کرتے ہوئے کتاب کی خامی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ڈاکٹر صدرالحق فرماتے ہیں:

> ''گنج تواریخ'' ان کی ماہرانہ مہارت کی یہ رسالہ ایک زندہ و پائندہ دلیل ہے۔ نیز بنگالی کی بعض شخصیتوں، شعراء و ادبا سے متعلق واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس رسالے سے بہتر کوئی دوسری سند ملنی دشوار ہی نہیں محال بھی ہے۔''

''لیکن کہیں کہیں تاریخ وفات درج کرتے ہوئے اپنے موضوع سے ہٹ گئے ہیں یعنی صفحہ ۳۷ پر تاریخ کدخدائی جناب مرزا محمد شیرازی مخمور اور صفحہ ۲۷ پر تاریخ کدخدائی شاہ عضد الدین رئیس ہیبت نگر ضلع میمن سنگھ درج ہے۔صفحہ ۳۷ اور صفحہ ۴۶ پر تاریخ ترتیب مثنوی ''ذو بحرین'' مسمی بہ ''منتھے الافکار'' تصنیف جناب سید محمود آزاد اور تاریخ ترتیب دیوان خواجہ عبدالغفار اختر ،صفحہ ۴۵ پر مولوی عبید اللہ عبیدی کی ''دستور پارسی آموز'' کی تاریخ ترتیب ،صفحہ ۴۸ پر تاریخ جلوس حضرت سلطان مراد افندی سلطان روم اور اسی صفحہ پر تاریخ مراجعت سید محمد باقر (شاعر ڈھاکہ) صفحہ ۴۸ پر تاریخ جلوس حضرت سلطان عبدالحمید خان سلطان روم اور تاریخ لقب کوئین وکٹوریا ملکہ معظمہ انگلستان درج ہیں۔''

(پروفیسر ڈاکٹر ام سلمی،ص،۱۸۶)

اس سے ڈاکٹر ام سلمیٰ کی نگاہ نقد کا بھی پتہ چلتا ہے۔

جنگ ہفت سالہ دراصل امریکہ کی آزادی کی لڑائی کی کہانی ہے جسے ام سلمیٰ نے اپنی کتاب میں بہتر طور پر پیش کیا ہے۔

''تعارف: ''جنگ ہفت سالہ'' امریکہ کی سات سالہ جدوجہد آزادی کے واقعات پر مبنی ہے۔جس کے مصنف خواجہ محمد اصغر ہیں۔کتاب میں صفحات کی تعداد ۱۱۵ ہے۔بنگلہ دیش میں امریکہ کی جنگ آزادی کے موضوع پر اردو میں یہ واحد کتاب ہے۔''

(پروفیسر ڈاکٹر ام سلمی،ص،۱۹۶)

صولت عالمگیری ایک ڈرامہ ہے جو تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔اس ڈرامے میں

دکن میں اورنگ زیب اور شواجی کے بیٹے سمبھا کے درمیان ہوئی لڑائی کو ڈرامے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔یہ ڈرامہ اورنگ زیب کی فتح اور مرہٹوں کے سردار کی شکست پر ختم ہوتا ہے۔

پانچویں باب ''بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں سماجی تاریخی ماخذ'' میں ڈاکٹر ام سلمیٰ نے فارسی اور اردو کتابوں سے سماجی تاریخ کے ماخذ دریافت کئے ہیں۔اس سلسلے میں انھوں نے بہت سی کتابوں کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ تحقیق کی رو سے ان کو اختصار کے ساتھ کتاب میں شامل بھی کیا ہے۔اس باب میں موصوفہ نے بہت ساری کتابوں کے ساتھ ساتھ ناول،اور ڈراموں کو بھی شامل کیا ہے۔

طنز وظرافت کی کتاب،خیالات آزاد (سید محمد آزاد)،ڈرامہ نوابی دربار (سید محمد آزاد)، مثنوی رویداد طوفان (خواجہ عتیق اللہ شیدا)، اوپیرا ڈرامہ ''بیمار بلبل'' (سید احمد حسین)،قیصدہ در تہنیت ملکۂ معظمۂ وکٹوریہ (عبداللہ العبیدی)،شیریں تفسیر ہند نامۂ کاظم (ابو ناظم کاظم ریاض گنجی) رویداد زلزلہ (مولانا عبداللول جونپوری) وغیرہ۔

درج بالا کتب کے علاوہ انجمن احباب اسلامیہ ڈھاکہ (1883ء)،انجمن احباب اسلامیہ (1885ء) کا بھی حال احوال اور سماج میں کئے گئے ان کے کاموں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔''خدا کی شان'' ایک ناول ہے جس کا مقصد عورتوں کی تعلیم کو سامنے لانا ہے، دراصل یہ ایک اصلاحی ناول ہے۔اس میں انیسویں صدی کی عورت کی بے بسی کو ناول کی ہیروئن دیبی چودھرائن کی شکل میں پیش کیا ہے۔دراصل دیبی چودھرائن نے انگریزوں کے خلاف تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ڈاکٹر ام سلمیٰ اس ناول کے تعلق سے لکھتی ہیں:

''ہندوستان کے طاقت ور انگریز حکمران بھی اس کے نام سے کانپتے تھے۔ گھر گھر اس کی بہادری کا چرچا تھا۔آخر میں اس بدکردار سسر کو اپنی زیادتیوں

پر نادم ہونا پڑا اور انجام کار اپنے شوہر کے گھر آبرومندانہ زندگی بسر کرتی ہے۔

''دیبی چودھرائن'' کے ذکر سے مصنف کا مقصد بنگال کے فقیروں اور سنیاسیوں کی اس تحریک کا ذکر کرنا تھا جس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام کو بہت متاثر کیا یہ بنگال کے مختلف علاقوں میں منظّم حملے کرتے پھرتے تھے۔ سنیاسیوں اور فقیروں کا گروہ بنگال میں بہت عرصے سے موجود تھا۔ ابتداء میں یہ پرامن زندگی گزارتے تھے۔ لوٹ مار سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا یہ مختلف دیہاتوں میں جاتے اہل دیہ بخوشی ان کی خور پوش کا انتظام کرتے ایک جگہ کچھ روز قیام کرتے اور کسی دیگر بستی کا رخ اختیار کرتے۔''

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ام سلمٰی نے نہ صرف گہرا مطالعہ کیا بلکہ اس ناول کی ہیروئن کو بہت بہتر ڈھنگ سے پیش بھی کیا یعنی انیسویں صدی کا معاشرہ کس طرح انگریزوں کے خلاف انگڑائی لے رہا تھا۔ یہ بات ناول کی ہیروئن کے پس منظر میں با آسانی سمجھ میں آجاتی ہے۔

چھٹے باب ''بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں مذہبی تاریخ کے ماخذ'' ڈاکٹر ام سلمٰی نے اس باب کے تحت فارسی اور اردو ادب کی ایسی کتابوں کا انتخاب کیا ہے جن سے اس علاقے کی نہ صرف مذہبی تاریخ سامنے آتی ہے بلکہ مذہبی سرگرمیوں کا بھی اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ام سلمٰی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے حسب ضرورت تحقیقی اور تنقیدی رویہ اپنایا ہے۔ آپ نے اس باب میں متعدد کتابوں کا، ان کے مصنفین کے حالات کا، اور ان کتابوں کی خاص باتوں کا احاطہ اپنی کتاب میں کیا ہے۔ سہیل یمن (مولوی نصیرالدین حیدر سامی)،

گلزار نعت (رضوان علی طپش)، احسن العقائد (مولانا عبدالرحمٰن رئیس)، براہین جیادفی سد باب الالحاد (محمد عبدالحی اختر) رسالہ چراغ ایمان (عبدالکریم خاکی)، کلمۃ حق (عبدالحی اختر) فتاویٰ شوکت محبوب سبحانی (شاہ خلیل الرحمٰن) مقامات محبوب سبحانی (شاہ خلیل الرحمٰن) صحیح شمس العارفین (شاہ خلیل الرحمٰن) دافع الشبہات فی جواز الاستیجاز علی الطاعات (مولانا امین الحق) نظم العقائد (مولوی محمد سیف اللہ جوہر) مصدر فیض محمدی (عبدالعلی دری) رکن الاعظم (رحیم اللہ) دیوان ولیسی (فتح علی ولیسی) تحفۃ الحسنین (الہٰ بخش مجموعہ دار سلہٹی) جام توحید (مولانا عبدلرشید شہزاد پوری) مکاشفات رحمت (مولانا کرامت علی جونپوری) تزکیۃ العقائد (مولانا کرامت علی جونپوری) مقامع المبتدعین (مولانا مخلص الرحمٰن) قول الامین (مولانا کرامت علی جونپوری) مراۃ الحق (مولانا کرامت علی جونپوری) اطمینان القلوب (مولانا کرامت علی جونپوری) مرادلمریدین (مولانا کرامت علی جونپوری) وغیرہ کتب کے ذریعہ ڈاکٹر ام سلمٰی نے مذہبی تاریخ کے ماخذ کی دریافت کی ہے۔ ہر کتب اور اس کے مصنف کے تعلق سے اچھا خاصا مواد تحقیقی انداز میں پیش کر کے ڈاکٹر ام سلمٰی نے اردو تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ رسالہ چراغ ایمان کے تعلق سے وہ لکھتی ہیں:

''مولوی عبدا کریم بڑے فاضل اور مولوی عدالت تھے۔ جب عہدہ مولوی عدالت کا زائل ہوا تو ڈپٹی مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔ اور اسی عہدے سے پینشن لے کر حج کو گئے اور زیارت حرم شریف سے واپس آکر ذکر الٰہی میں مصروف ہوگئے۔ ان کی سن وفات کا پتہ نہ چل سکا۔

تاریخی اہمیت: آج کل اسلام میں گوناگوں فرقے پیدا ہوگئے ہیں۔ جن میں کچھ سود لینے کو برا نہیں سمجھتے ہیں۔ ''حقیقت میں سود لینا'' اس زمانے

میں مروج ہوگیا ہے۔ اور اس کی حرمت پر کسی کو کچھ باک اور پرواہ نہیں ہے۔ یہ لوگ احکام شرعی کو یک قلم بھول گئے ہیں۔ لیکن مصنف نے مختلف قرآنی آیات اور احادیث کی روشنی میں ثابت کر دکھایا ہے کہ سود لینا حرام ہے۔ اور سود لینے والے قیامت کے دن ہمیشہ معذب رہیں گے۔''

ساتویں باب ''بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو میں ادبی تاریخ کے ماخذ'' میں ڈاکٹر ام سلمٰی نے فارسی اور اردو کی ایسی کتابوں کا انتخاب کیا ہے جس سے ادبی تاریخ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان میں زیادہ تر کتاب تذکرے ہیں۔ ان تذکروں سے فارسی اور اردو کے پس منظر میں ادبی تاریخ کے ماخذ کو تلاش کرنے میں ڈاکٹر ام سلمٰی نے کامیابی حاصل کی ہے۔ اس باب میں انہوں نے سخن شعراء (عبدالغفور نساخ)، قطعۂ منتخب (عبدالغفور نساخ)، کند فارسی (عبدالغفور نساخ)، تذکرۃ المعاصرین (عبدالغفور نساخ) جیسی اہم کتابوں کا ذکر اس باب کے پہلے حصہ میں ہوا ہے۔

آٹھویں باب ''بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں شخص، تاریخ کے ماخذ'' میں ڈاکٹر ام سلمٰی نے انیسویں صدی کی معروف سوانحی عمریوں کو شامل کیا ہے جن میں سے چند کے نام اس طرح ہیں۔ خودنوشت سوانح حیات (عبدالغفور نساخ)، تحفۂ محبوب سبحانی (شاہ خلیل الرحمٰن)، داستان عبرت بار (مولانا عبیداللہ عبیدی) کا خاص ذکر اس باب میں ہوا ہے۔

ڈاکٹر ام سلمٰی تحقیق و تنقید کے شعبے میں اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہیں۔ مذکورہ بالا کتاب میں انہوں نے تحقیق کا حق ادا کیا ہے اور جہاں بھی ان کو محسوس ہوا انہوں نے تنقید بھی کی ہے۔ ان کی نگارشات سے نہ صرف بنگلہ دیش بلکہ پورے بنگال کا فارسی اور اردو ادب کا منظر نامہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ خصوصاً اگر بنگلہ دیش کی بات کی جائے تو ان کی یہ کتاب

ایسے محققین کے لئے جو بنگلہ دیش کی فارسی یا اردو ادب پر تحقیق کرنا چاہتے ہیں، کے لئے بہت مفید ہے۔ آپ کی اس کتاب سے بہت ساری غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی بنگلہ دیش کے وجود، تحریک آزادی، حدود اربعہ اور زبان کے تعلق سے بھرپور مواد مذکورہ کتاب میں موجود ہے۔

ڈاکٹر ام سلمٰی کا شمار بنگلہ دیش کے ہی نہیں بلکہ برصغیر کے اہم محققین و ناقدین میں ہوتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ ڈاکٹر ام سلمٰی کی تحریر میں تحقیق کے معیارات کا خاص اہتمام ملتا ہے۔ اپنے تقریباً 350 صفحات کے اس مقالے میں ام سلمٰی نے کئی سو کتابوں کا نہ صرف خود مطالعہ کیا بلکہ قارئین کو بھی ان کتب کے مشمولات سے مختصراً آگاہ کیا۔ ہر باب کی بات کی جائے تو یہ بات بالکل صاف اور واضح ہے کہ انہوں نے ہر باب پر خاص محنت کی ہے۔ مانا کہ ان کا یہ مقالہ پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے تھا لیکن آج کل اتنی محنت سے مقالہ لکھنے کا چلن نہیں ہے۔ اب تو زیادہ تر مقالے شخصیات پر مبنی ہوتے ہیں جبکہ آپ نے بنگلہ دیش کے حوالے سے ایک پورے عہد پر کام کیا ہے۔

ہاں یہ بھی درست ہے کہ آپ کے اس تحقیقی مقالے کے ساتویں اور آٹھویں باب میں وہ محنت نہیں ہوئی جو دوسرے ابواب میں نظر آتی ہے۔ جہاں تک کتابیات کا تعلق ہے آپ نے اس کا حق ادا کیا ہے اور تقریباً تیس صفحات میں انگریزی، اردو، عربی اور فارسی کتابوں کی ایک طویل فہرست مقالے میں شامل ہے۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ام سلمٰی نے تحقیق کا حق ادا کیا ہے اور بنگلہ دیش کے حوالے سے ایک اہم مقالہ سپردِ قلم کیا ہے۔

پیش لفظ

برصغیر کے دیگر علاقوں کی مانند فارسی اور اردو زبان بنگال کے علاقوں کی مقبول زبان رہی ہے اور بنگلہ دیش میں فارسی زبان صدیوں سے مروج رہی۔ مسلمانوں کی فتح بنگال کے بعد اسے سرکاری حیثیت حاصل ہوئی اور عوام میں بھی یہ زبان مقبول رہی۔ یہ زبان تہذیب وتمدن کی نمائندہ رہی ہے۔ اس کے بعد مغلیہ سلطنت کے قیام کے بعد آہستہ آہستہ اردو نے بھی اس علاقے میں اپنے قدم جمانے شروع کئے اور عوام حلقوں میں یہ زبان بہت مقبول ہونے لگی۔ اس طرح اردو اور فارسی دونوں زبانوں کو ہی یہاں قبول عام حاصل ہوا۔ یہاں کے عوام نے اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لئے ضرور اس زبانوں میں کچھ نہ کچھ لکھا ہوگا۔

مگر تصنیف وتالیف کا یہ حصہ ابھی تک اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں چھاپہ خانہ اور ٹائپ مشین کی ایجاد نہ ہوئی تھی کہ ان ذرائع سے ادبی تخلیقات کو محفوظ رکھا جا سکے۔ انیسویں صدیوں کی شروع ہوتے ہی ہندوستان میں بھی سائنس کی کچھ ترقی شروع ہوئی تھی۔ چھاپہ خانے اور ٹائپ مشین بھی ایجاد ہوئیں۔ اور اس کے ساتھ ادبی تصنیفات کو محفوظ رکھنے کی ایک سبیل بھی شروع ہوئی۔ اس لئے انیسویں صدی میں بنگال کے عوام نے جو کچھ لکھا اس کے بیشتر نمونے کتابی شکل میں ہمارے سامنے دستیاب ہیں۔ ان میں خالص ادبی کتب کے علاوہ وہ کتابیں بھی ہیں جن کا موضوع سخن 'تاریخ' ہے۔ میں نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی مقالے میں مختلف کتابوں میں منتشر ان حالات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور انہیں کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔ تا کہ پڑھنے والے ان حقائق سے باخبر ہوسکیں کہ

بنگلہ دیش میں اردو فارسی لکھنے والے تاریخ نگاری سے بھی باخبر تھے۔ ان کی نظر سماج اور اس کے مختلف مسائل پر بھی گہری تھی۔ اور ان کا سیاسی شعور بھی بیدار تھا۔

سب سے پہلے میں خداوند کریم کی شکر گزار ہوں کہ جس کے فضل وکرم اور مہربانی کی وجہ سے میں اپنے پی ایچ۔ ڈی 'مقالۂ نگاری کے کام کو تکمیل تک پہنچا سکی۔

میں نے اپنے پی ایچ۔ ڈی کے مقالے کو تاریخی موضوعات کے اعتبار سے پانچ ابواب میں منقسم کیا ہے۔ ۱۔ سیاسی تاریخ ۲۔ سماجی تاریخ ۳۔ مذہبی تاریخ ۴۔ ادبی تاریخ ۵۔ شخصی تاریخ۔

میرے مقالے کا موضوع ''بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں تاریخی ماخذ (انیسوی صدی'' ہے۔ اس موضوع کو شعبۂ اردو اور فارسی کی Academic Committee پھر Faculty of Arts بعدازآں Board of Advanced Studies اور آخر میں Academic Council نے منظور کیا۔ اس لئے میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس موضوع پر کام کرنے کا موقع فراہم کیا اور اس سلسلے میں کام کرنے کی میری جو دیرینہ خواہش تھی اسے تکمیل تک پہنچانے میں بھرپور تعاون دیا۔

مگر کام کی انجام دہی میرے لئے ناممکن ہی تھی اگر میرے گائیڈ ڈاکٹر ابوبکر صدیق صاحب ایم.اے ڈھاکہ پی۔ ایچ۔ ڈی علی گڑھ، صدر ومعلم شعبۂ عربی، ڈھاکہ یونیورسٹی میری رہنمائی نہ کرتے۔ میں تہی دل سے ان کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے اتنی مصروفیات کے باوجود میری ہمیشہ رہنمائی ومدد کی۔ اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ جب بھی اپنا کام دکھانے گئی انہوں نے ہمیشہ خندہ روئی کا مظاہر کیا۔ جہاں بھی ترمیم واصلاح کی ضرورت محسوس کی کر دی۔ وہ میرے کام کی جلد ترقی کے خواہاں رہے۔ اور ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

میرے کام کی تکمیل میں ان کے حسن سلوک، قیمتی مشوروں اور ان کی معلومات کا پورا پورا ہاتھ ہے۔ان کے ساتھ ان کی بیوی مسز سلطانہ رضیہ کا کردار بھی نا قابل فراموش ہے۔ایک عورت ہونے کے ناطے انہوں نے ہمیشہ میری دشواریوں اور الجھنوں کو محسوس کیا۔وہ ہمیشہ مجھے تشفی دیتی رہیں اور میری حوصلہ افزائی کرتی رہیں۔

میں شعبۂ اسلامیک سٹڈیز کے پروفیسر وسابق صدر جناب سراج الحق صاحب اور شعبۂ بنگلہ کے پروفیسر وسابق صدر ڈاکٹر منیر الزمان صاحب کی بھی شکر گزار ہوں کہ ان دونوں پر خلوص حضرات نے ہمیشہ میری ہمت افزائی کی اور میرے کام کی ترقی کے ہمیشہ خواہاں رہے۔ گاہے گاہے میری پرستش کرتے رہے۔ اور مجھے تسلی و تشفی دیتے رہے۔انکی قیمتی نصیحتوں اور مشوروں نے میری ذہنی و دلی خوراک کا کام دیا۔میں شعبۂ اردو و فارسی کے پروفیسر اور صدر ڈاکٹر محمد عبداللہ صاحب کی بھی متشکر ہوں کہ انہوں نے مجھے بہت سی قیمتی معلومات فراہم کیں اور میں ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب صدر و پروفیسر شعبۂ عربی اسلامک اسٹڈیز کی بھی شکر گزار ہوں کہ وہ بھی ہمیشہ میرے لئے دعا گو رہے اور ان کا رویہ میرے ساتھ ہمیشہ مخلصانہ رہا۔

میں ڈھاکہ یونیورسٹی لائبریری کے کارگزران کی بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے لائبریری میں پڑھنے اور وہاں کی کتابیں اور مخطوطات استعمال کرنے کی سہولت عطا کی۔میں نے حکیم حبیب الرحمٰن کی ڈھاکہ یونیورسٹی کو عطا کردہ کتابوں سے زیادہ استفادہ حاصل کیا ہے۔میرا مقالہ زیادہ تر انہی کتابوں پر مبنی ہے۔اگر حکیم صاحب یہ کتابیں یونیورسٹی کو عطا نہ کر جاتے تو شاید مقالہ لکھنا میرے لئے ناممکن ہوتا۔اس کرم فرمائی کے لئے مرحوم حکیم صاحب شکریے کے مستحق ہیں۔میں جناب دیوان نور الانوار حسین چودھری ڈپٹی سکریٹری وزارت مذہب کی بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے کچھ قلمی نسخے فراہم کئے۔

میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے پی۔ایچ۔ڈی سے متعلقہ شعبے کی بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے پانچ ہزار روپے کی گراں قدر رقم عطا کی تاکہ میں مقالے کو ٹائپ اور بعد ازاں جلد سازی کا کام کرواسکوں۔

میں اپنی والدہ صاحبہ اور اپنے شوہر ڈاکٹر محمد عبدالمالک کی بھی خوب شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری گھریلو الجھنوں کے حل میں میرے ساتھ پورا تعاون کیا۔اور میری حوصلہ افزائی و اعانت کی اور آخر میں مجھے اپنے مقالہ ٹائپ کرنے والے جناب ابوالفتح کا بھی شکر گزار ہونا چاہئے کہ جنہوں نے اتنی دیدہ اور جانفشانی کے ساتھ ٹائپ کا کام انجام دیا۔

ام سلمٰی

جولائی ۱۹۹۰ء

شعبۂ اردو و فارسی

ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈھاکہ، بنگلہ دیش

باب اول

بنگلہ دیش: ایک مختصر تعارف

بنگال کو قدیم عہد میں بنگ کہا جاتا تھا۔ رگ وید کتاب کے ایک حصے "ایتاریرارناک" میں قدیم بنگال کا نام "بنگ" ہی لکھا ہوا ہے۔ ساتویں صدی ہجری تک بنگال مندرجہ ذیل علاقوں پر مشتمل تھا۔

''بنگ، پونڈرور، گوڑ، راڑ، سمو، برمو، وتمرولپتو اور سموتط وغیرہ۔ ساتویں صدی ہجری میں مالک شتانکو نے ان تمام علاقوں کو گوڑ کا نام دیا۔ مالک شتانکو کے بعد پونڈرو، گوڑ اور بنگ کو بنگلہ دیش کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اکبر کے زمانے میں بھی ان علاقوں کا نام بنگلہ دیش یا صوبہ بنگال تھا برطانوی عہد میں بنگال کے کچھ حصے عظیم بنگال سے جدا ہو گئے۔ اور موجودہ بنگلہ دیش اپنے موجودہ نام کے ساتھ ہی برقرار رہ گیا۔

قدیم سنسکرت ادب میں بھی "بنگال" کے بارے میں اسی قسم کی دلیلیں ملتی ہیں کیونکہ اسی ادب میں 'بنگا' اور 'گوڑا' کے الفاظ پائے گئے ہیں جہاں لفظ 'بنگ' 'اہل بنگ' اور 'گوڑا' 'اہم گوڑا' کے لئے مستعمل ہوئے ہیں۔ اس ادب کے مطابق اس علاقے میں جو قوم بستی تھی ان کو 'قوم بنگ' کہتے تھے جو بعد ازاں 'بنگا' کے نام سے مشہور ہو گئے۔ اسی "بنگ" سے "بنگال"، "بنگلہ" اور "بنگلا" جیسے الفاظ مشتق ہوئے۔

ابوالفضل نے "آئین اکبری" میں بنگال لفظ کے اشتاق کے بارے میں جو بیان دیا ہے وہ

زیادہ مدلل اور صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ان کی رائے میں لفظ "بنگال" "بنگ" اور "ال" ان دو الفاظ سے مرکب ہے۔ "ال" کے معنے زراعتی زمین جس کے چاروں طرف مٹی کا بند باندھا جاتا ہے تاکہ اس میں پانی داخل نہ ہو سکے۔ چنانچہ "بنگال" کے معنی "قوم بنگ کی زمین" ہے۔

فارسی ادب میں بنگال کو "بنگالہ" کے نام سے بھی پکارا گیا ہے۔ ملک بنگال کی جغرافیائی حد باگھیرتی ندی کے مشرقی ساحل سے لے کر آسام کی مغربی حد تک محدود تھی۔ لیکن بعد میں اس علاقے میں کانٹ چھانٹ کے بعد ایک علاقہ مشرقی پاکستان کے نام سے وجود میں آیا جو بعد میں بنگلہ دیش کے نام سے موسوم ہوا۔ [1]

بنگلہ دیش کی تخلیق: بنگلہ دیش ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ کو دنیا کے نقشے پر ایک نئے ملک کی حیثیت سے ابھرا۔ ۱۹۴۷ سے ۱۹۷۱ تک بنگلہ دیش پاکستان کا ایک حصہ رہا جسے مشرقی پاکستان پکارا جاتا تھا۔ پاکستان، مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان دو حصوں پر مبنی تھا۔ ۔ پاکستان لاکھوں مسلمانوں کی قربانیوں کے بعد ۱۴ آگست ۱۹۴۷ میں عالم وجود میں آیا تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں کے چنگل سے آزادی حاصل کر کے یہاں انسان امن و چین کی زندگی بسر کر سکیں۔ جس کی یقین دہانی مسٹر جناح نے اپنی ایک تقریر میں یوں کی تھی۔

> "You may belong to any religion of cast and creed- that has nothing to do with the business of the state and we will find that in course of time Hindus would cease to be Hindus and Muslims would cease to be Hindus, not in the religious sense, because that is the personal faith of every individual, but in the political sense as

citizens of the state" [2]

لیکن جلد ہی بنگالی مسلمانوں نے محسوس کیا کہ اس وقت کا حکمراں طبقہ جو زیادہ تر مغربی پاکستان سے تعلق رکھتا تھا، اس نے مشرقی پاکستان کی طرف ہمیشہ بے اعتنائی برتی۔ اس حقیقت کا ذکر کرتے ہوئے A.M.A Muhith کہتے ہیں:۔

"West Pakistan soon started treating Bangladesh as a milch cow and milked her drier during the twenty three years."

ایک اور ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

"A parochially motivated administration and a unitary form of government did everything possible to convert Bangladesh into a colony of west Pakistan ."[3]

اس کے علاوہ بنگلہ دیش کے عوام جغرافیائی، لسانی اور ثقافی لحاظ سے مغربی پاکستان کے لوگوں سے ایک دم جدا ہیں۔ دونوں حصوں میں اس عدم مسابقت نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کے دلوں میں ایک طاقت ور علیحدگی پسندگی کا رجحان پیدا کیا۔ [4]

گنجان آباد لیکن صنعتی لحاظ سے پست ماندہ، مشرقی حصے کے لوگوں نے سیاسی طور پر برسر اقتدار مغربی حصے کے لوگوں کی بے اتفاقی اور بے توجہگی کو پورے طور پر محسوس کر لیا تھا۔[5] ان ہی حالات میں مشرقی پاکستان میں اس وقت کی طاقت اور سیاسی جماعت عوامی لیگ کے رہنما شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنے چھ نکات پیش کئے جن کا مقصد مرکز سے مشرقی پاکستان کی خود مختاری تھا۔[6] ان ہی حالات میں جنرل یحیٰ خان نے ملک میں عام انتخابات کا اعلان کیا اور اس کے لئے ۷ دسمبر ۱۹۷۰ کا دن مقرر کیا گیا۔ ۷ دسمبر سے پہلے ہی ہزاروں کی تعداد

میں عوام ڈھاکہ کی سڑکوں پر امڈ سے چلے آئے جن کا مقصد شیخ مجیب اور ان کی صوبائی خود مختاری کی پالیسی کی واضح حمایت تھا۔[7] ملک کی تاریخ میں پہلی بار بلا واسطہ انتخابات ہوئے۔ عوامی لیگ صوبائی اسمبلی میں ۳۰۰ نشستوں میں ۲۸۸ اور مرکزی اسمبلی میں ۳۱۳ نشستوں میں سے ۱۶۹ نشستیں حاصل کیں۔ یہ شیخ مجیب کی عظیم فتح اور بنگالیوں کا پاکستانی سرکار کے خلاف عدم اعتماد کا واضح اظہار تھا۔[8]

اس کامیابی سے خائف ہو کر جنرل یحیٰی اور ذوالفقار علی بھٹو نے مرکزی اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے میں ٹال مٹول شروع کر دی اور عام لباس میں مشرقی پاکستان میں فوج بھیجنی شروع کر دی۔ خبر رساں نمائندوں کا بیان ہے کہ اس ہنگامہ سے پہلے اس علاقے میں فوج کی تعداد ۲۵،۰۰۰ تھی لیکن اب تعداد ۶۰،۰۰۰ ہو گئی تھی۔ ۲۵ مارچ کو یحیٰی خان نے نہتے عوام پر فوجی کاروائی کرنے کا حکم دے دیا۔[9] اور عوامی لیگ کی سرگرمیوں کو وطن دشمن اور ممنوع قرار دیا۔ جس کے نتیجے میں لیگ کے بہت سے رہنما سرحد عبور کر کے ہندوستان داخل ہو گئے جہاں انہوں نے جلاوطنی میں اپنی ایک حکومت قائم کر لی۔[10] ۱۱ اپریل ۱۹۷۱ کو مجیب نگر (بنگلہ دیش میں) میں رسمی طور پر آزادی کا اعلان کر دیا گیا اور خود مختاری کے حصول کے لئے جد جہد کرنے کے فرمان جاری کئے گئے۔ آزادی کا اعلان جنرل ضیاء الرحمٰن کی جانب سے یوں تھا۔

"Major Zia, provisional commander -in-chief of the Bangladesh Liberation Army, hereby proclaim, on behalf of Shiekh Mujibur Rahman, the independence of Bangladesh."[11]

آخر ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ کو لاکھوں انسانوں کی قربانیوں کے نتیجے میں بنگلہ دیش آزاد ہو گیا۔ بنگلہ

دیش مکتی فوج، ہندوستانی سپاہ کے ساتھ بغیر کسی مزاحمت کے ڈھاکہ وارد ہوئی۔ ہزاروں عوام نے نعرہ ہائے مسرت بلند کر کے ان کا استقبال کیا۔اور پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال کر اپنی شکست کا اعتراف کرلیا۔[12]

بنگلہ دیش کی زمین کی ساخت

بنگلہ دیش کی زمین کی سطح ڈیلٹائی اور دریا گنگا اور برہما پترا سے برآمدہ مٹی سے تیار شدہ ہے۔

بنگلہ دیش کا میدانی علاقہ دنیا کا سب سے بڑا ڈیلٹا ہے۔ [13]

جنوب مشرقی اور مشرقی علاقوں میں پہاڑی سلسلہ ہے اسی لئے بنگلہ دیش کی سطح زمین کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) دریائے گنگا کا نشیبی علاقہ

(۲) چٹاگانگ کا پہاڑی خطہ اور سلہٹ اور میمن سینگھ کی نیچی پہاڑیاں بنگلہ دیش میں دریاؤں کا جال بچھا ہوا ہے۔[14]

ان میں پدما، میگھنا، جمنا، برھما پترا قابل ذکر ہیں۔ان کے علاوہ سرما، گومتی، بوڑھی گنگا، دھلیشوری، سیتا لکھیا، تیستا، کاروٹیا، آترائی، کرنافلی، سنگھو، ماتا موہری، بھاگ کھالی، اور ناف بھی بنگلہ دیش کے دریاؤں میں شامل ہیں۔[15]

چوحدی

بنگلہ دیش تین اطراف بھارت کے ذریعے گھرا ہوا ہے۔ دونوں ممالک کی ۱۵۰۰ میل لمبی مشترکہ سرحدیں ہیں۔اس لئے دونوں ممالک ایک ہی طرح کے سماجی، ثقافتی اور معاشی مسائل سے دوچار ہیں۔[16]

بنگلہ دیش کے شمال میں آسام، کوچ بہار اور جلپائی گوڑی ہے۔جنوب میں خلیج بنگال، مشرق میں برما، آسام اور ریاست تری پورہ اور مغرب میں مغربی بنگال اور بہار ہے۔[17] اس کا رقبہ ۱۴۲،۷۷۶ مربع کیلومیٹر (۵۵ ۱۲۶ مربع) میل ہے۔[18]

بنگلہ دیش ۲۰.۳۰ سے لے کر ۲۶.۴۵ درجہ جنوبی عرض بلد اور ۸۸ سے لے کر ۹۲.۵۶ درجہ مشرقی طول بلد واقع ہے۔[19]

ہند۔ بنگلہ دیش کی سرحدیں ۱۹۴۷ کی تقسیم پاکستان و ہندوستان کے وقت راڈکلف ایوارڈ (Radcliff Award) نے متعین کی تھیں ۱۹۷۴ میں بنگلہ دیش کی قانون ساز اسمبلی نے دوبارہ ان سرحدوں کی توثیق کی۔ بنگلہ دیش ۔ برما کی سرحدیں ۱۹۳۷ میں برما کی ہندوستان سے علیحدگی کے وقت کی گئی تھیں۔وہ جوں کی توں قائم ہیں۔اور اس سلسلے میں کوئی سرحدی تنازعہ پیدا نہیں ہوا۔[20]

آب وہوا

بنگلہ دیش کی آب وہوا گرم اور مرطوب ہے۔شدید درجہ حرارت، تند بارش اور نم ناک یہاں کی آب وہوا کی نمایاں خصوصیات ہیں[21]

بنگلہ دیش سمندر سے زیادہ فاصلے پر نہیں اور گردونواح میں اونچے پہاڑ بھی نہیں اس لئے سال بھر آب وہوا نمناک رہتی ہے۔[22] ہوا میں نمی زیادہ موسم گرما میں ہوتی ہے۔ جب کہ بارش بھی شدید پڑتی ہے۔موسم گرما اور موسم سرما کسی بھی موسم میں شدت پیدا نہیں ہوتی۔ جس کی وجہ سے یہاں کی آب وہوا زیادہ تر معتدل ہی رہتی ہے۔[23] صحیح معنوں میں بنگلہ

دیش میں موسم سرما کا وجود ہی نہیں۔[24] سردیوں کے موسم میں ملک کے بعض حصوں میں کم سے کم درجہ حرارت ۴۷۰F ہوتا ہے۔[25]

بنگلہ دیش موں سوں ہواؤں کے خطے میں واقع ہے۔[26] خلیج بنگال کا موں سوں ہواؤں کی گزر اسی علاقے سے ہوتی ہے۔اس لئے جون سے ستمبر تک شدید بارش ہوتی ہے۔[27] راجشاہی میں اوسطاً ۴۸.۱۱ بارش، نرائن گنج میں اوسطاً ۵۸.۳۴ بارش، کاکس بازار میں اوسطاً ۱۲۷ اور سلہٹ میں اوسطاً ۲۰۰ انچی بارش ہوتی ہے۔سب سے کم بارش راجشاہی میں لال پور کے مقام پر ہوتی ہے۔ جہاں اوسطاً ۴۷.۹۰ً بارش ہوتی ہے۔ اور سب سے زیادہ بارش سلہٹ لال کھال مقام پر ہوتی ہے۔ جہاں بارش کی مقدار تقریبا ۲۵۵.۷۶ً ہوتی ہے۔[28] نومبر سے فروری کے مہینے تک بارش بالکل نہیں ہوتی۔[29]

بارش کی کثرت کی وجہ سے بنگلہ دیش میں ہر سال سیلاب آتے ہیں، فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ بہت مالی نقصان ہوتا ہے۔[30] موسم گرما شروع ہونے سے قبل ماہ اپریل میں اس علاقے میں طوفان اور برق و باراں جسے مقامی زبان میں "کال بیساکھی" کہتے ہیں، برپا ہوتا ہے۔ اس طوفان کی شدت اس علاقے کے لوگوں کے لئے ایک عظیم مصیبت بن جاتی ہے۔جس سے ملک جانی و مالی دونوں لحاظ سے بہت متاثر ہوتا ہے۔[31]

بنگلہ دیش میں چھ موسم ہیں۔موسم برسات جون کے نصف سے اور موسم خزاں اگست کے نصف سے شروع ہوتا ہے۔اس کے بعد موسم سرما آتا ہے۔جب ہوا معتدل،خوشگوار ہو جاتی ہے۔ پھولوں کی فراوانی اور دھان کی فصل کٹتی ہے۔اس کے ساتھ موسم بہار شروع ہوتا ہے اور جنوری کے نصف سے مارچ کے نصف تک برقرار رہتا ہے۔ موسم بہار اور موسم برسات

کے درمیان کا زمانہ موسم گرما ہے۔جب درجہ حرارت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ہوا میں خشکی بڑھ جاتی ہے۔[32]

بنگلہ دیش کے باشندے: بنگلہ دیش آبادی لحاظ سے دنیا کے گنجاں ترین ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ دس [۲۰۲۱ کی حساب سے اٹھارہ] کڑوڑ لوگ یہاں بستے ہیں۔ ہر مربع میل میں ۲۰۰۰ لوگ آباد ہیں، اس طرح رقبے کے لحاظ سے آبادی میں بنگلہ دیش سنگاپور کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔[33]

لیکن آبادی کا تناسب ہر جگہ یکساں نہیں۔ زرخیز میدانی علاقوں میں لوگ زیادہ آباد ہیں، شہروں کے گرد ونواح میں بھی لوگ زیادہ رہنا پسند کرتے ہیں۔ پہاڑ، جنگل و ساحل کے نزدیکی علاقوں میں آبادی قدرے کم ہے۔[34]

بنگلہ دیش کے زیادہ تر لوگ ہزارہا برس پہلے برما، تبت اور شمالی ہندوستان سے آکر یہاں آباد ہوئے۔اب ملک کی آبادی کا زیادہ تر حصہ بنگالی لوگوں پر مشتمل ہے جن کے جسم کا رنگ گندمی گوں اور قد چھوٹا ہے۔[35]

بنگلہ دیش کے ۹۰ فی صد لوگ کاشتکار ہیں۔ یہاں ۸۷۱۹۱ گاؤں ہیں، ہر گاؤں میں افراد کی تعداد چار سو سے لے کر ایک ہزار تک ہے۔ یہاں کے دیہاتی سماج کا نقشہ کھینچتے ہوئے Charles Peter O, Donnell کہتے ہیں:۔

"The fundamental social unit, the ectended family is the social arbiter of the peasantry. It educates its members in their rights and duties, confirms their social and economic status, and preserves their religious

tradition. It protects the aged and, to the extent economic condition permit, gives job secutity to its members."[36]

بنگلہ دیش میں نوے فی صد لوگ مسلمان ہیں، اس طرح دنیا میں انڈونشیا کے بعد یہ دوسرا اسلامی ملک ہیں۔ یہاں کے مسلمان مذہب کے بہت پابند ہیں۔ سماج میں مذہبی اثرات کا ذکر کرتے ہوئے Charles Peter O, Donnell کہتے ہیں:

"Islamic modes of life pervade Bangali society. Most peasants follow Islamic marriage customs; they call on Allah to give them better crops and cuildren to till their fields. Mullahs (teachers) who live in the villages exert considerable authority as religious leaders. Sufism, a mystical Islamic movement that originated in the eight century A.D., influences Bangali Muslims more than Muslims in other countries." [37]

دوسرے نمبر پر ہندو مذہب کے پیروکار لوگ ہیں۔[38] چٹا گانگ میں پہاڑی علاقوں کے قبائل لوگ، چکمہ، مرنگ، تپرہ، مرو وغیرہ زیادہ تر بدھ مت کے پیروکار ہیں۔ ان کے علاوہ قلیل تعداد میں عیسائی اور پارسی عقیدے کے لوگ بھی رہتے ہیں۔[39] بنگلہ دیش میں تمام لوگوں کو مذہبی آزادی اور تحفظ حاصل ہے۔[40]

چاول اور مچھلی یہاں کے لوگوں کی مرغوب غذا ہے۔ یہاں کے لوگوں کا لباس زیادہ تر لنگی، قمیص، پائجامہ اور کرتہ ہے۔ عورتیں ساڑی پہنتی ہیں۔

بنگلہ دیش کے لوگ سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ نرم دل لیکن مستقل مزاج ہیں غریب اور

جاہل ہونے کے باوجود سرفراز اور ملنسار ہیں۔ یہاں کے باشندوں کی ان خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے Muhith, A.M. A. کہتے ہیں:۔

" A melting pot of races, they represent a liberal attitude and an extreme individualism."[41]

زبان

بنگلہ دیش کی عوام کی زبان بنگالی ہے۔ بنگلہ زبان، زبانوں کی ہند آریائی شاخ سے تعلق رکھی ہے۔[42] زبان کے رشتے نے یہاں کے لوگوں کو ثقافتی اور قومی بندھن میں جوڑ رکھا ہے۔[43] ۴ نومبر ۱۹۷۲ کے آئین میں بنگلہ زبان کی حیثیت کو اس طرح متعین کیا گیا ہے:

"The state language of the Republic is Bengali"[44]

پاکستان سرکار نے اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ بنگالی یہاں کے ۹۸.۴۷ فی صد لوگوں کی زبان ہے۔ اردو کو بحیثیت سرکاری زبان کے تھوپنے کی کوشش کی۔ جس کے خلاف کئی تحریکیں چلیں۔ ۲۱ فروری ۱۹۵۲ میں اس نے شدت اختیار کر لی۔ جس کے نتیجے میں اس دن کئی طلباء شہید ہوئے۔ اس دن کی اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر رفیق الاسلام کہتے ہیں:۔

"As a matter of fact, events of 21 February has shaped the future destiny of the Bengalis of Pakistan and it is now considered that the freedom movement of Bangladesh owed its genesis from tha date."[45]

اس حقیقت کے پیش مجیب سرکار نے سب سے پہلا جو سرکاری ڈاک ٹکٹ جاری کیا تھا وہ انہیں طلباء کی شہادت کی یادگار منانے کے لئے تھا۔[46] یہاں کے لوگوں کو اپنی زبان سے بے حد پیار ہے۔ ٹیگور اور نذرالاسلام اس زبان کے دو مشہور شاعر گذرے ہیں۔ ٹیگور کی

کوشش سے بنگلہ میں لطافت ، لچک، تاثر اور جامعیت پیدا ہوئی۔ انہوں نے احساس و ادراک کی حدود کو وسیع کیا۔اور عالمگیر انسانی موضوعات پر زور دیا۔۱۹۱۳ میں انہیں ادب کا نوبل انعام ملا۔ان کا گیت ''امار سونار بنگلہ'' بنگلہ دیش کا قومی ترانہ ہے۔
نذر الاسلام کی شاعری میں قوت، جوش اور روانی کے علاوہ الفاظ ایک تیز دھارے کی طرح اُمڈے چلے آئے ہیں۔جس کے باعث ان کی شاعری میں ایک تیز حرکت کا احساس ہوتا ہے۔انہوں نے بنگلہ میں فارسی اور اردو تعلق کو از سر نو زندہ کیا اور غزل کو ایک وقیع صنف سخن کا درجہ بخشا۔ان کی غزلیات نے اپنی شرین بحروں ،لطیف و دلکش انداز ،سریع الفہم زبان اور حسن ترنم سے بنگالی عوام کو مسحور کر دیا۔[47]

بنگالی بولنے والوں کو اس بات پر فخر ہے کہ دنیا کی زبانوں میں بنگالی زبان کو آٹھواں درجہ حاصل ہے۔[48] اس زبان کے لکھنے والے کو ادب کا بین الاقوامی نوبل انعام ملا۔

طرز حکومت

۱۹۷۲ میں بنگلہ دیش میں پارلیمانی طرز حکومت کی بنیاد ڈالی گئی اور ملک کا آئین ذیل اصولوں پر مبنی تھی۔(۱) سوشلزم (۲) مذہبی مساوات (۳) جمہوریت (۴) اور قومیت[49]

لیکن شیخ مجیب الرحمٰن کے دور حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی حکومت کے ڈھانچے میں تبدیلی پیدا ہوگئی۔صدارتی طرز حکومت جاری ہوگیا۔اور ملک کو اسلامی قدروں سے از سر نو روشناس کرایا گیا۔۱۹۷۷ کے آئین میں حکومت سازی کے جو آئین وضع کئے گئے،ان میں

خدا پر کامل یقین، جمہوریت،قومیت اور سوشلزم کے اصول کارفرما تھے۔جن کا مطلب سماجی اور اقتصادی انصاف کا تحفظ تھا۔۱۹۸۸ میں اسلام کو سرکاری سطح پر سرکاری مذہب کی حیثیت سے قبول کر لیا گیا۔دوسرے مذاہب بھی امن امان کے ساتھ گذر بسر کر سکیں گے۔اس فیصلے کا اندرونی اور بیرونی ہر سطح پر گرم خوشی سے استقبال کیا گیا۔
انتظامی سہولت کے لئے بنگلہ دیش کو ۸ ڈویژن میں منقسم کیا گیا ہے۔جیسے ڈھاکہ، چٹاگنگ، راجشاہی، کھلنا، سلہٹ، بریسال، میمن سنگ اور رنگ پور۔پھر انہیں ۶۸ ضلعوں اور ۴۹۲ اپو ضلعوں (Upazilas) میں منقسم کیا گیا ہے۔بنگلہ دیش میں ۸۷۱۹۱ گاؤں اور ۹۰ سے زائد شہر ہیں۔
بنگلہ دیش کے جھنڈے کا رنگ گہرا سبز ہے۔جو جسامت کے لحاظ سے مستطیل ہے۔جس کے درمیان میں لال رنگ کا دائرہ ہے۔سبزہ رنگ بنگلہ دیش کی ہریالی اور لال رنگ آزادی کے سورج کے طلوع ہونے کی نشان دہی کرتا ہے۔" আমার সোনার বাংলা আমি তোমায় ভালবাসি میرا سونے جیسا بنگلہ دیش، مجھے تجھ سے محبت ہے" اس کا قومی ترانہ ہے۔اور اس کا قومی پھول کنول (Water Lily) ہے۔
معیشت: بنگلہ دیش ایک ترقی پذیر ملک ہے۔روٹی، کپڑا، مکان، صحت و تعلیم ، فی کس آمدنی میں اضافہ یہاں کے عام انسان کی بنیادی ضروریات ہیں۔[50]

ملک کی معیشت کا انحصار زیادہ تر زراعت پر ہے لیکن کھاد کی کمی اور آب پاشی کے ذرائع کا نہ ہونا اور وقتاً فوقتاً قدرتی مصائب کا آنا، ملک کی زراعتی ترقی میں حائل ہو جاتے ہیں۔
بنگلہ دیش کی پیداوار میں چاول کو خاص اہمیت حاصل ہے۔یہاں کی ۸۷ فی صد زمین میں

دھان کی کاشت کی جاتی ہے۔جن میں آوس (Aus)، آمن (Aman) اور بوڑو (Boro) نامی دھانیں قابل ذکر ہیں۔ ملک میں غذا کی ضرورت کوم پورا کرنے کے لئے حکومت بنگلہ دیش اور بین الاقوامی غذائی امداد کے پروگرام نے ایک نئے قسم کا چاول اری (Irri) کونہایت کامیابی کے ساتھ ملک میں متعارف کرایا ہے۔ یہ تجزیہ غذائی ضروریات کو مٹانے میں خاصہ کامیاب ہوا ہے۔[51]

دوسری قابل ذکر فصل پٹ سن ہے۔ پٹ سن کے لئے یہ علاقہ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ساری دنیا میں سب سے زیادہ پٹ سن بنگلہ دیش میں ہوتی ہے، جولائی سے ستمبر کے مہینے تک اس کی کاشت ہوتی ہے۔اس کے ریشے سے قالین، چٹائی ،صوفہ سازی، تھیلے اور پاپوش تیار کئے جاتے ہیں۔ یہ کپڑا بننے کے بھی کام آتا ہے۔خام پٹ سن سے ملک کا پچاسی (۸۵) فی صد زرمبادلہ حاصل کیا جاتا ہے۔[52]

۱۹۸۳ میں ڈھاکہ میں ایک "بین الاقوامی تنظیم پٹ سن (Internatioal Jute Organization) کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ جس کے سربراہی "پٹ سن کی بین الاقوامی اراکین مجلس"(International Jute Council) کرتی ہے۔اس تنظیم کا کام پٹ سن کی ترقیاتی منصوبوں کی تشکیل و تکمیل، نئی تجارتی منڈیوں کی کھوج اور وہاں کم داموں میں پٹ سن کی فروخت کرنا ہے۔[53]

چائے کی کاشت ضلع سلہٹ میں زیادہ کی جاتی ہے۔ چاٹگام کے پہاڑی علاقوں بھی چائے کی کاشت کی جاتی ہے۔ جوملکی ضروریات کے لئے کافی ہے۔[54]

ملک میں پھل کی پیداوار بھی بہت ہے۔کیلا، آم، اناناس، ناریل، لیچو، سنگترہ وغیرہ یہاں بہت ہوتے ہیں۔ان کے علاوہ گنا، مختلف سبزیاں، روئی، دالیں، سپاری، مصالحے جن میں مرچ، ہلدی، دھنیا، ادرک، لہسن شامل ہیں بہت ہوتی ہے۔تمباکو کی کاشت رنگپور اور میمن سنگھ میں اور سپاری کھلنا اور بریسال میں فراوانی سے ہوتی ہے۔[55]

بنگلہ دیش میں مچھلیوں کی کاشت بھی کافی ترقی یافتہ ہے۔خلیج بنگال کے ساحل اور اندرون ملک میں لاتعداد دریا، نالے، تالاب، دلدل اور جھیل میں اس کثرت سے مچھلی پائی جاتی ہے کہ ملکی ضروریات مٹانے کے بعد بھی بیرونی ممالک کو برآمد بھی کی جاتی ہے۔[56]

بنگلہ دیش گھنے جنگلات کی وجہ سے لکڑیوں کے بارے میں خودکفیل ہے۔

یہاں سندر بن کا جنگل بہت بڑا اور گنجان ہے۔ ان جنگلات میں سال، ساگوان، گرجن، سندری، کیوا، بیت اور بانس کے درخت لاتعداد اگتے ہیں۔سندر بن جنگلات کے شیر دنیا بھر میں ''رائل بنگال ٹائیگر'' کے نام سے مشہور ہیں۔ان جنگلات میں چیتے، ہرن، ہاتھی، بھالو، سور اور بندر بھی رہتے ہیں۔[57]

معدنیات

معدنیات میں قابل ذکر صرف قدرتی گیس ہے۔ ملک میں تقریبا دوسو کروڑ کیوبک فٹ (20 million cubic feet) گیس دریافت کی جاچکی ہے۔[۲۰۲۱ء تک ۳۱ قدرتی گیس کا میدان ملے ہیں۔ملک میں تقریبا ہر روز ۲۵۷ کروڑ کیوبک فٹ گیس استعمال ہوتا ہے۔اس وقت بنگلہ دیش میں گیس کی موجودگی ۱۱ ٹریلین کیوبک فٹ (11 trillion cubic feet) ہے]۔اور مزید تلاش جاری ہے۔خلیج بنگال کے ساحلی علاقوں میں تیل کے

ذخیرے تلاش کئے جا رہے ہیں۔ بنگلہ دیش کے جنوبی علاقوں میں کوئلے کی کانیں دستیاب ہوئی ہیں۔ چونکہ ان کی گہرائی تین ہزار فٹ سے نیچے ہے لہذا ان کا نکالنا دشوار ہے۔ سلہٹ اور چٹاگانگ میں چونے کے پتھر کی کانیں پائی جاتی ہیں۔ بنگلہ دیش میں نمک کی کوئی کان نہیں۔لیکن سمندر کا کھاری پانی سکھا کر نمک حاصل کیا جاتا ہے۔ ملک میں کہیں کہیں تانبا بھی دستیاب ہوا ہے۔[58]

بنگلہ دیش کی صنعتوں میں سب سے قابل ذکر پٹ سن کی صنعت تھی۔ ملک میں ۸۲ پٹ سن کے کارخانے تھے۔ نرائن گنج کے مقام پر' آدم جی جوٹ ملز' ساری دنیا میں مشہور ہے۔[اس وقت صرف ۲۵ پٹ سن کے کارخانے باقی ہیں۔ اس وقت سوتی کپڑے کے کارخانوں کا نمبر درجہ اول میں ہے۔ ملک میں تقریباً ۵۰۰۰ سے زائد کپڑے کے کارخانے ہیں۔] ان کارخانوں میں ملکی ضروریات کے لئے ساڑھی، دھوتی، لنگی، لٹھا، پوپلین، مارکین، سالو، ڈرل اور قمیص بنانے کے کپڑے تیار ہوتے ہیں۔[59]

ملک کے شمالی علاقوں میں چینی کے جو کارخانے ہیں وہ ملکی ضروریات مٹانے کے لئے کافی ہیں، کاغذ کے کارخانے چاٹگام میں کرنا فلی کے مقام پر اور کھلنا میں قائم ہیں۔ کاغذ ملکی ضروریات پورے کرنے کے بعد دساور کو بھی بھیجے جاتے ہیں۔ کھاد کے کارخانے چٹاگانگ، ڈھاکہ، سلہٹ اور کومیلا میں قائم ہیں۔ لوہے کا کارخانہ بھی بہت ہیں۔ان کے علاوہ، چمڑہ، لکڑی، دیاسلائی۔ سگریٹ، مشروبات، دواسازی، رنگ، صابن، ربڑ، شیشے کے برتن و دیگر اشیاء ایلمونیم، سیمنٹ، مختلف مشینیں ڈیزل، انجن، ڈیزل پائپ، بجلی کے تار، بلب، ریڈیو، ٹیلی ویزن اور ٹیلی فون سیٹ بنانے کے کارخانے بھی ملک میں موجود ہیں۔[60]

پیشے کے لحاظ سے ملک کا اسی فی صد حصہ کاشتکاری کرتا ہے اس کے بعد ملازمت اور دست کاری کے کام ہیں۔ بہت سے بنگلہ دیشی قطر، عمان، کویت، سعودی عرب، شرط العرب، مالیشیا، سنگاپور، اٹالی، مال ڈیپ، مشرق بعید اور دیگر بیرونی مالک میں اپنی خدمات سے ملک کے لئے زرمبادلہ کما رہے ہیں۔[61]

ملک میں مالی زر کا پیمانہ ایک ٹاکا ہے جس میں سکوں کی تعداد ۱۰۰ پیسے ہوتے ہیں جسے ۱، ۲، ۵، ۱۰، ۲۵ اور ۵۰ پیسوں [۱، ۲، اور ۵ روپیہ] کے سکے میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ملک میں ۱، ۲، ۵، ۱۰، ۲۰، ۵۰، ۱۰۰، ۵۰۰ اور [۱۰۰۰] مالیت کے نوٹ جاری ہیں۔ ملک اپنی معاشی ترقی کے لئے غیر ملکی امداد پر زیادہ منحصر ہے۔ بنگلہ دیش کو زیادہ تر مالی امداد جاپان، ترکی، سعودی عرب، امریکہ اور بین الاقوامی بنک سے حاصل ہوتی ہے۔[اس وقت غیر ملکی امداد پر بھروسہ کم کر کے اپنی ذاتی آمدنی پر زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے۔ بنگلہ دیش میں اس وقت سب سے زیادہ آمدنی افرادی قوت (Manpower) سے حاصل ہوتی ہے۔] بجٹ کی دو تہائی رقم عوامی ٹیکس کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے۔[62]

بنگلہ دیش بیرونی ممالک کو تیار شدہ ملبوسات، خام پٹ سن تیار کردہ اشیاء، خام چمڑہ، چمڑے سے تیار کردہ اشیاء، چائے، سبزہ اور پھل وغیرہ برآمد کرتا ہے۔ بنگلہ دیش کی درآمدی اشیاء میں مشینیں، ادویات، کیمیاوی اشیاء، تیل و پیٹرول، گندم وغیرہ شامل ہیں۔ بنگلہ دیش کی تجارت زیادہ تر امریکہ، انگلستان، فرانس، چین، جاپان، جرمنی، یوگوسلاویہ، کنیڈا اور سارک میں شامل ممالک کے ساتھ ہوتی ہے۔[63]

ثقافت: ناچ: دنیا کے دیگر زراعتی ممالک کی مانند ناچ اور گیت بنگلہ دیش کے لوگوں کا

ثقافتی، سماجی اور مذہبی تہواروں کا ایک حصہ بن گیا ہے۔[64] یہاں کی موسیقی صدیوں کے ارتقا کے بعد اس ترقی یافتہ حال کو پہنچی ہے۔ جن کے دھارے کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ عوامی گیت، کلاسیکل گیت اور جدید گیت۔ عوامی گیت یہاں کے لوگوں کا من پسند گیت ہے۔ میٹھے سر، محبت و جدائی کی دلنشین، کیفیت و عارفانہ عقیدت کے جذبات سے بھرپور عوامی گیت یہاں خوب مقبول ہیں۔ ان میں بھاٹیالی، باول، معرفتی، مرشدی، جاترا، گھمبیرا، جاری و ساری گیت شامل ہیں۔[65]

بنگلہ دیش کے ناچ کا دھارا بھی برصغیر کے دیگر ممالک کی مانند ہے۔ قبائلی ناچوں میں منی پوری اور سانتال ناچ مشہور ہیں۔ بنگلہ دیش بلبل اکاڈمی آف فائن آرٹس نے ناچ کو ترقی دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ شلپ کلا اکاڈمی (Shilpakala Academy) نیشنل اکاڈمی آف فائن آرٹس اور اسی طرح کے دوسرے ثقافتی ادارے ناچ کے فن کی ترقی کے لئے کوشاں ہیں۔

فن تعمیر: گذشتہ زمانہ سے بنگلہ دیش کی فن تعمیر پر یہاں کی تاریخ کے مختلف ادوار کی چھاپ نمایاں نظر آتی ہے۔ یہاں کی فن تعمیر پر انسانی و فطری دونوں عوامل کارفرما ہیں۔ یہاں کا مخصوص موسم، موسلا دھار بارش، بانش اور لکڑیوں کی بہتات نے یہاں کی فن تعمیر پر اپنے مستقل تاثرات چھوڑے ہیں۔ بنگلہ دیش کی سرزمین ڈیلٹائی ہے۔ اس لئے موسم برسات میں لاتعداد دریاؤں کی دریا برآمدہ مٹی کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے۔ یہ دستیاب مٹی لچک دار اور صورت پذیری کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جس سے اینٹیں بنانا نہایت سہل ہے۔ اس لئے ہر عمارت میں اینٹ کا استعمال یہاں کی مخصوص خصوصیات ہے۔ پتھر کا استعمال یہاں کی تعمیر میں شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ ڈیلٹائی مٹی میں چونے کا پتھر معدوم ہے۔

بنگلہ دیش میں گوناگوں لکڑی و بانس کی بھی بہتات ہے۔ بانس میں خمیدگی کی جو فطرت ہے۔ اس نے یہاں کی عمارتوں کی ساخت میں خم اور گولائی پیدا کرنے کا رجحان پیدا کیا ہے۔ جو کہ اکثر عمارتوں میں دکھائی دیتا ہے۔[66]

اسلام سے پہلے کی تعمیر شدہ مندروں اور خانقاہوں میں مقامی اثرات زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ لیکن مغلوں نے اس کی ہیئت میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کیں۔ گنبد اور اونچی لمبی دہلیز اس کی طرف نشان دہی کرتی ہیں۔ بنگال میں یورپین اقوام کی آمد نے اپنے فن تعمیر کا مظاہرہ گرجا گھروں کی تعمیر میں کیا پھر انیسویں صدی میں ایک مخلوط یورپین اور مغل فن وجود میں آیا۔ موجودہ عہد میں بھی مشرق و مغرب کا وہ حسین امتزاج نظر آتا ہے۔[67]

نقاشی:- نقاشی کا فن بھی یہاں خوب ترقی یافتہ ہے۔ یہاں کے قدرتی حسن کا اظہار مٹی سے تیار کردہ آرائشی برتن و قالب، دستکاری و کشیدہ کاری میں نظر آتا ہے۔ ان کے علاوہ اس کے بہترین نمونے ملاح، مچھیرا، کاشتکار، قبائلی عورت منیپرا اور مویشیوں کے ریوڑ جیسی تصویروں میں ظہور پذیر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔[68]

نشر و اشاعت: بنگلہ دیش میں سرکاری اشاعت کا ذریعہ ریڈیو بنگلہ دیش ہے۔ اس کے چھ مقامی اسٹیشن ڈھاکہ، چٹاگانگ، کھلنا، سلہٹ، راجشاہی اور رنگپور میں ہیں۔ ہر روز نوے گھنٹے کا اشاعتی پروگرام چلتا ہے۔ اندرون ملک کے علاوہ بیرونی ممالک کے لئے چھ زبانوں یعنی انگریزی، عربی، ہندی، بنگالی، اردو اور نیپالی زبانوں میں ۶ گھنٹے ۴۵ منٹ کا پروگرام نشر کیا جاتا ہے۔ اپنے نشری پروگراموں کی کامیاب انجام دہی کے لئے ریڈیو بنگلہ دیش دس میڈیم ویو (Medium wave) پانچ شارٹ ویو (Short Wave) اور چودہ

ایف ایم (FM) ٹرانسمیٹرز کا استعمال کرتی ہے۔[69]

بنگلہ دیش ٹیلی ویژن بھی ایک سرکاری ادارہ ہے۔اس کا اصلی اسٹیشن بمقام ڈھاکہ ہے۔ جہاں سے اس کے پروگرام چٹاگانگ ، کھلنا،سلہٹ، راجشاہی ، رنگپور، میمن سنگھ ،نوا کھالی ، رانگاماٹی ،کوکس بازاراور سات کھیرا میں دکھائے جاتے ہیں۔[70]

اس کے علاوہ یہ ادارہ بین الاقوامی اہم واقعات مسلط کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔ ۱۹۸۰ء سے یہ رنگین آلہ ترسیل استعمال کر رہا ہے۔[71]

وزارت اطلاعات کے تحت فلم اور پبلیکیشنز کا شعبہ پراز معلومات فلمیں بنا رہا ہے۔جن کا موضوع ملک کی سماجی، معاشی اور سیاسی رفتار ہے اور جن کا مدعا ملک میں لوگوں کو ان سے روشناس کرانا ہے۔بنگلہ دیش میں سنیما ہال کی تعداد ۵۰۰ [تھی اب ٦٢] ہے۔[72]

ملک سے اس وقت ٦٢ روزنامے نکلتے ہیں۔جن کی کاپیوں کی کل تعداد دس لاکھ بتیس ہزار ہے۔(1.32 million) ہے۔اس کے علاوہ ۲۴۲ ہفتہ وار، ۲٦ پندرہ روزہ، ۱۳۲ ماہنامہ ۴۲، سہ ماہی اور ۷ دیگر مجلّات چھپتے ہیں۔[73]

[ملک سے اس وقت ۵٦۲ روزنامے نکلتے ہیں۔اس میں ۳۲ انگریزی میں ہیں۔اس وقت اردو میں کوئی روزنامہ شائع نہیں ہوتا ہے۔ مرتب]

خبر حاصل کرنے کے ادارے بنگلہ دیش شونگباد شونگستھا (The Bangladesh News Agency) ، ایسٹرن نیوز ایجنسی (Eastern News Agency) اور پریس انفورمیشن ڈیپارٹمنٹ (Press Information Department) ہیں۔[74]

تہوار: بنگلہ دیش کے مسلمانوں کا سب سے بڑا تہوار عید الفطر ہے اور اس کے بعد عید الاضحی ہے۔دوسرے مذہبی تہواروں میں عید میلاد النبی اور شب برات بھی دھوم دھام سے منائے جاتے ہیں۔غیر مسلم مذہبی تہواروں میں ہندوؤں کا درگا پوجا،عیسائیوں کا بڑا دن اور بدھ مت والوں کا بدھا پورنیا بہت اہم ہیں۔غیر مذہبی تہواروں میں بنگلہ نیا سال، یوم فتح اور یوم آزادی سرکاری سطح پر منائے جاتے ہیں۔[75]

رسل ورسائل:۔ بنگلہ دیش کے نظام رسل ورسائل میں ندی نالوں اور دریاؤں میں چلنے والی کشتیوں کو مخصوص اہمیت حاصل ہے۔اس لئے کہ یہ نقل وحمل کا ایک سستا ذریعہ ہے۔ بنگلہ دیش میں لاتعداد چھوٹی چھوٹی باربردار کشتیاں چلتی ہیں۔جن میں کئی چپو ہوتے ہیں اور یہ کشتیاں تقریباً ۳۵ ٹن مال ڈھونے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ سیکڑوں کی تعداد میں مسافر کشتیاں بھی چلتی ہیں۔[76]

بنگلہ دیش شپنگ کارپوریشن (Bangladesh Shipping Corporation) کے تحت سمندر اور ندی میں ۱۰ ہزار سے زائد چھوٹے بڑے جہاز چلتے ہیں۔ملک میں تین سمندر بندرگاہ ہیں:ایک چٹاگانگ، دوسری منگلا اور تیسری پائیرا بندرگاہ۔ملک کی ۲۰ فی صد تجارت کا انحصار اس کارپوریشن پر ہے۔اس کا سمندری رشتہ امریکہ، چین، جاپان، مشرق بعید، ہندوستان، پاکستان، خلیج فارس اور مغربی ایشیاء جیسے ممالک سے استوار ہے۔

بنگلہ دیش ریلوے لائن کی لمبائی ۲۹۰۰ کیلومیٹر ہے۔جہاں ۵۰۳ اسٹیشن اور ۱۴۷ مال اور مسافر گاڑیاں چلتی ہیں۔[77]

ہوائی سفر کے لئے بنگلہ دیش بیمان ایرلائنز کی خدمات حاضر ہیں۔جس کا ایشیا، یورپ اور

افریقہ کے ۲۳ ممالک کے ساتھ ہوائی رابطہ قائم ہے۔ اندرون ملک میں ۸ خانگی اڈے ہیں۔ ڈھاکہ [، سلہٹ اور چاٹگام] کے بین الاقوامی ہوائی اڈہ میں بیمان کے علاوہ دنیا کے دیگر ممالک سے ہوائی جہاز آتے اور پرواز کرتے ہیں۔ [78]

تعلیم:۔ بنگلہ دیش کی حکومت تعلیمی ترقی اور ناخواندگی کو دور کرنے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔ ملک میں اب بچوں کے لئے پرائمری سطح تک ضروری اور مفت تعلیم کا انتظام ہے۔ ۸۶-۱۹۸۷ء کے سروے کے مطابق ملک میں ۴۳۹۹۲ پرائمری اسکول، ۸۹۸۳ سکنڈری اسکول، ۸۳۳ عام مروجہ کالج، ۱۰ میڈیکل کالج، ۴ انجینیر نگ کالج، ۲۲ لاء کالج، ۲ زراعتی کالج ، ۳۸ یونیورسیٹیاں، اساتذہ کے لئے ۱۰ تربیتی کالج، ۱۸ پولیٹکنیک کالج، ۲۲ ہومیوپیتھیک کالج اور ۲۸۷۲ مدرسے قائم ہیں۔ [79]

[۲۰۲۰ کے سروے کے مطابق ملک میں ۱۲۹۲۵۸ پرائمری اسکول، ۲۰۶۶۰ سکنڈری اسکول، ۴۵۵۱ عام مروجہ کالج، ۹۶ میڈیکل کالج، ۱۶ انجینیر نگ یونیورسٹیاں، ۱۷ لاء کالج، ۱۴۸ یونیورسیٹیاں، اساتذہ کے لئے ۲۱۶ تربیتی کالج، ۴۳۹ پولیٹکنیک کالج، ۵۴ ہومیوپیتھیک کالج اور ۹۳۴۱ مدرسے قائم ہیں۔ یہ سب تعلیمی ادارے ملک میں تعلیمی ترقی میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ مرتب]

حوالہ جات

۱۔ انعام الحق ڈاکٹر، بنگالی ادب، مجلّہ الثقافہ (ڈھاکہ شمارہ اول ستمبر ۱۹۷۳) ص۔ ۱۱-۱۲

2. Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah, Speeches, (Lahore, Shaikh Mohammad Ashraf, 1980, p.9

3- Muhit, A.M.A., Bangladesh emergency of a Nation (Dacca; Bangladesh books international Ltd.1978, P.74

4- Sukhwant Sing, The Liberation of Bangladesh, (Dacca; Bangladesh Edition, 1980), P. 2

5. RaunaqJahan, Pakistan's Failure in National Integration (Dacca: Oxford University press, 1977), P. 139

6. Bangladesh Emergency of a Nation, P. 71 (۲)

7. Ibid, P. 46 (۳)

8. Mahmood, S. Haider, Resurrection of Bangladesh, (Dhaka National Book Centre, 1983), P. 36

9. Bangladesh Emergency, P. 91

10. Bhatnagar Yatindra, Bangladesh Birth of Nation, (New Delhi: ISSD Publication,1971), Pp 152- 54

11. Resurrection of Bangladesh, P. 62

12. Ibid, P,90

13. Fazlul Karim, M. Geography, (Dacca: Dacca press, 1968) .P. 5

14. George Thomas Kurian, Encyclopaedia of the Third world, Vol, 1, (London: Mansell Publishing Limited, 1982) p. 125

15. Ibid, P. 125

16. Charles Peter o Donnell, Bangladesh Biography of a Muslim Nation, (London: Westview press, 1984), P. 6

17. Ahmed Kazi, S.A., Geography of Pakistan , (Karachi: Pakistan Publishing House, 1959), P. 2

18. Encyclopaedia of the Third world, Vol, 1, P. 125

19. Nafis Ahmed, An Economic Geography of East Pakistan (New Dehli: Vikas Publishing House, 1976) p. 2.

20. Incyclopaedia of the Third World, P. 125

21. Haroun-er Rashid, Geography of Bangladesh,(Dhaka: University Press Limited, 1977) p. 90

22. A Geography of Pakistan, P. 29

23. An Economic Geography of East Pakistan, p. 40

24. Tayyab. A, Pakistan A Political Geography (London: Oxford University Press, 1966), P. 12

25. Bangladesh Emergency of a Nation, p. 8

26. Spate, O.H.K, India, Pakistan and Ceylon: The Region

(London, Methuen, 1960) p. 573
27. Geography, P. 25
28. Rashid, H. East Pakistan- A Systematic Regional Geography (Larore: Ks. Ghulam Ali and Sons, 1965) Pp 52-53
29. Whitaker's Almance, 1983, 115 Edition, P. 733
30. Bangladesh- Biography of a Muslim Nation P. 9
31. India, Pakistan and Ceylon- The Region P. 575
32. Bangladesh Emergence, P. 9
33. Encyclopaedia of the Third World, p. 126
34. Preliminary Report of Bangladesh Population Census, 1981, p.
35. The World Book Encyclopaedia Vol. II (Chicago, World Book Inc, 1988) P. 78
36. Bangladesh Biography of a Muslim Nation (U.S.A Westview Press, 1984) P. 16
37. Ibid, P. 27
38. Ibid, p. 27
39. Encyclopaedia of the Third World , P. 128
40. Meet Bangladesh (Third Edition) (Dhaka: Department of Films and Publication , 1978) P. 39
41. Bangladesh: Emegence, P. 17
42. Encyclopaedia of the Nation: Asia and Australia. (London: The New Caxton Library Service Limited, 1976), P. 30
43. Abdur Rahim, Social Cultural History of Bengal (Chittagong: Baitush Sharaf Islamic Research Institute, 1985) P. 4
44. Government of Bangladesh: The Constitution of the People's Republic of Bangladesh, 1972, P. 2
45. Chakravarty, S.R. (ed) Bangladesh: History and Culture (New Delhi : South Asian Publishers, 1985) P. 154
46. Bangladesh: Biography of Muslim Nation, P. 26
۴۷۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (دانش گاہ پنجاب، لاہور جلد ۴، ۱۹۶۹) ص ۹۷۱
48. Bangladesh: Biography, P. 26
49. Encyclopaedia of the Third World, P. 125
50. A.R Khan, Basic Needs Targets: An illustrative Exercice in Independent and qualification (Geneva: ILO, 1977) P. 80
51. Encyclopaedia of the Nation: Asia and Australia, P. 32

52. Ibid, P. 31
53. The Far East and Australia (England: Europe Publication Limited, 1984) P. 209.
54. The New Encyclopaedia Britannica, vol. 1 (The University of Chicago, 1986) P. 867
55. Ibid, P. 867
56. Ibid , P. 867
57. Ibid, P. 867
58. Ibid, P. 867
59. Ibid, P. 867
60. Ibid, P. 867
61. Ibid, P. 867
62. Encyclopaedia of the Third World, P. 134
63. Statistical Year book of Bangladesh (Dhaka: Bangladesh Bureau of Statistics, Secretariate, 1989) Pp. 230-261
64. Bangladesh Emergence, P. 32
65. Meet Bangladesh (Third Edition) (Ministary of press and Information, 1987) P. 84
66. Nazimuddin Ahmad, Discover the Monuments of Bangladesh (Dhaka: The University Press Limited, 1984) pp. 11-12
67. Meet Bangladesh, P. 50
68. Encyclopaedia of Britinnica Vol. II, 1986, P. 694
69. Meet Bangladesh, P, 167
70. Ibid , P. 167
71. Ibid , P. 167
72. Ibid , P. 164
73. Ibid, P. 243,
Bangladesh film and publication department report 05.05.2021
74. Encyclopaedia of the Third World. P, 127
75. Meet Bangladesh, P. 44
76. Bangladesh Biography of a Nation, P. 10
77. Meet Bangladesh, P. 202
78. Ibid, P. 130
79. Statistical Yearbook of Bangladesh, P 489

باب دوم

بنگال میں فارسی ادب کی تاریخ

۱۲۰۲ء/ ۵۹۹ھ میں محمد بختیار خلجی نے بنگال فتح کیا اور اس علاقے میں ہندوؤں کا دور حکومت ختم ہوا اور اس کی جگہ مسلمانوں کی حکومت نے لی۔ ترکوں کے ڈیڑھ سو سالہ دور حکومت (۱۳۵۰- ۱۲۰۲) میں چھوٹی موٹی شورشوں کے باوجود ایک اسلامی فضا پیدا ہوگئی تھی۔ ویسے بھی ترکوں سے بہت پہلے صوفیوں اور درویشوں کی تبلیغ اور سوداگروں کی آمد و رفت سے بنگال اسلام سے روشناس ہو چکا تھا۔ ترکوں کے اقتدار سے مسلمان مستحکم ہوگئے۔ ترکوں نے صرف جنگیں ہی نہیں لڑیں ملک ہی فتح نہیں کئے وہ اپنے ساتھ ایک ترقی یافتہ کلچر اور اسلامی عقائد پر مبنی تہذیب بھی لائے۔ جس نے مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ غیر مسلموں کو بھی متاثر کیا۔ ان نو واردوں کا مذہب اسلام تھا اور ثقافت ایرانی۔ اپنے گھروں میں وہ ترکی بولتے تھے اور سیاسی اور سرکاری کام فارسی میں انجام پاتا تھا۔ اور مذہبی اغراض کے لئے عربی استعمال ہوتی تھی۔ اس بارے میں Narendra Nath Law کہتے ہیں:

"The Muhammadan invasions of India, marked the beginings of momentous changes not only in the social and political spheres but also in the domain of education and learning."[1]

ترکوں کے تسلط کے ساتھ فارسی چونکہ سرکاری زبان کا درجہ اختیار کر چکی تھی اس لئے عوام کی توجہ اس جانب مبذول ہوگئی۔ ہندو اور مسلمان دونوں یہ زبان پڑھا کرتے تھے۔ بعض تو محض اس وجہ سے کہ یہ درباری زبان تھی لیکن بہت سے اس لئے کہ مسلمانوں کے کلچر کو سمجھ سکیں۔ جیسے تندی کی ''چتینا منگل'' سے ہمیں ملک کے ہندوؤں پر مسلمانوں کے رہن سہن اور فارسی ادب کے بتدریج اثرات کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ ہندوؤں کے آداب کا نقشہ یوں کھینچتا ہے۔ برہمن داڑھی رکھتا ہے۔ فارسی پڑھتا ہے۔ موزے پہنتا ہے۔ ایک ہاتھ میں لکڑی۔ دوسرے میں کمان رکھتا ہے۔ مثنوی بھی سناتا ہے۔ قدرتی طور پر ہندو بھی فارسی ادب اور زبان سے اثر پذیر تھے یہ اثرات زیادہ تر نفس مضمون، تخیل اور اس ملک کی زبان اور تراجم میں نمایاں ہیں۔[2]

مسلمانوں کے دور فرمانروائی کے ساتھ اسلام ملک میں مستقل طور پر قائم ہوگیا۔ مسلمان جرنیلوں نے نئے نئے علاقے فتح کئے۔ صوفیوں اور درویشوں نے زور شور سے تبلیغ جاری رکھی۔ ان مبلغوں کی زبان عربی اور فارسی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ترکوں کی فتح بنگال کے بعد غیر ملکوں کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بنگال آنے لگی۔ جن میں سے کچھ تو قسمت آزمانے آتے تھے کچھ تجارت کے سلسلے میں اور کچھ اپنے ملکوں سے بھاگ کر پناہ لینے کے لئے۔ بختیار اور اس کے جرنیلوں کے ساتھ آئے ہوئے سپاہی یا تو غیر شادی شدہ تھے یا بیویاں ساتھ نہ لائے تھے۔ انہوں نے نیز بہت سے دوسرے مسلمانوں نے بنگال میں شادیاں کر لیں اور یہیں کے ہو رہے۔ تھوڑے سے عرصے بعد فارسی اور عربی بولنے والے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بنگال میں ایک تہذیبی قوت بن گئی۔

اس عہد کے مسلمان اپنی ادبی تشنگی مٹانے کے لئے ضرور کچھ نہ کچھ لکھتے ہوں گے۔ لیکن تصنیف و تالیف کا یہ حصہ ابھی تک اندھیروں میں ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں پریس کا کوئی انتظام نہ تھا کہ ادب پاروں کو محفوظ رکھا جا سکے۔ مگر پھر بھی کتابی وسائل سے چند ادبی شہ پاروں کا سراغ ملتا ہے۔

بنگال میں سب سے پہلی فارسی کتاب علی مردان خلجی (۱۲۱۶ع۔ ۱۲۰۹ ع) کے عہد میں لکھی گئی۔ یہ فارسی کتاب، سنسکرت کتاب "امرت اخوند" کا ترجمہ تھا اس کا مقدمہ عربی زبان میں لکھا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان علی مردان کے عہد میں ایک نامور ہندو جوگی بنام بھوجر برہمن تھا۔ یہ برہمن مسلمان درویشوں کے ساتھ مذہبی معاملات میں بحث کرنے لکھنوتی گیا۔ وہاں مقیم سمرقند کے قاضی رکن الدین کے ساتھ گفتگو کے دوران اتنا مرعوب ہوا کہ فوراً اسلام قبول کرلیا۔ اور "امرت اخوند" کو قاضی صاحب کی خدمت میں نذرانے کے طور پر پیش کیا۔ قاضی صاحب نے بعدازاں اس کتاب کا فارسی اور عربی ترجمہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ”امرت اخوند“ کا ترجمہ بنگال میں سب سے پہلے فارسی تصنیف ہے۔[۳]

بعدازاں بنگال میں فارسی شعر و ادب کے چرچوں کے اثرات شاہ دلی، غیاث الدین بلبن (۱۲۸۷-۱۲۶۵ء) کے گورنرِ بنگال بغرا خان (۱۲۹۱-۱۲۸۲ء) کے عہد میں ملتے ہیں۔ بغرا خان غیاث الدین کا بیٹا تھا۔ ۶۷۸ھ/۱۲۷۹ء میں بنگال میں طغرل بیگ نے بغاوت کی اور شاہی لشکر کو بار بار سکشتیں دیں۔ بالآخر سلطان غیاث الدین نے خود اس مہم پر جانے کی تیاریاں کیں۔ اور بغرا خان کو ساتھ لیا ۔ امیر خسرو بھی اس سفر میں ساتھ

گئے۔ سلطان غیاث الدین اس بغاوت کو فرو کر کے دلی واپس آ گیا۔ اور بنگالہ کی حکومت بغرا خان کو عنایت کی۔ امیر خسرو کے ساتھ دربار کے شعراء میں شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر بھی قیام پذیر تھے۔[۴]

بغرا خان کو بنگال کی سرزمین اتنی بھائی کہ اس نے وہاں مستقل طور پر رہنے کا ارادہ کرلیا۔ ۶۸۳ھ / ۱۲۸۴ء میں سلطان غیاث الدین کا لائق شہزادہ اور ولی عہد سلطان محمد خان والی ملتان لشکر مغل کے مقابلے میں شہید ہوگیا۔ اس لائق شہزادے کی موت نے بوڑھے باپ کا دل بٹھا دیا۔ تو چھوٹے بیٹے ناصرالدین

3- Ikram, S.M. The Cultural Heritage of pakistan (London: Oxford University Press, 1955) P. 111

۴۔ شبلی نعمانی، شعرالعظم (حصہ پنجم) (لاہور ایم فرمان علی اینڈ سنز، ۱۹۵۰ء) ص۔ ۸۶

بغرا خان کو لکھنوتی سے طلب فرمایا کہ اس کے دیدار سے خان شہید کا غم غلط کرے مگر شہزادہ بغرا خان بنگالہ کی خودمختار حکومت اور وہاں کی حشمت و دولت پر ایسا فریفتہ تھا کہ عرصة تک باپ کا حکم ٹالتا رہا۔ تاکید مزید کے بعد آیا تو دلی کی درباداری اور باپ کی خدمت گزاری میں جی نہ لگا ان دونوں سلطان کی حالت بھی علاج معالجہ سے کچھ سنبھل گئی تھی اور تخت کا جلد خالی ہو جانا مشتبہ نظر آتا تھا۔ لہذا بغرا خان ایک روز شکار کے بہانے سے نکلا اور بے اذن شاہی لکھنوتی کی راہ لی۔[۵]

بغرا خان کے بنگال قیام کے دوران دلی سے بہت سے تجربہ کار رکن وعملہ دار اور تصنیف و تالیف کے فرائض انجام دینے والے دلی سے بنگال پہنچے۔ ان میں قابل ذکر شمس الدین مدبر

تھے جو دربار میں میر منشی کے فرائض انجام دیتے تھے۔انہوں نے گورنر بنگالہ کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا۔جن میں سے کچھ اشعار عبدالقادر بدایونی نے اپنے تذکرہ "منتخب التواریخ" میں درج کئے ہیں۔اس کے چند اشعار یہ ہیں:۔

ایں ہمہ کار دلم از تو بنادانی خام
دادۂ دوش مرا وعدۂ مہمانی خام۔
پختہ دارم دل از اندیشہ رویت کہ چراست
رنگ تو پختہ ہمیں نقرۂ پیشانی خام
گفتم ہیچ مسلمان نہ خودر خام بہ بین
غم تو می خوردم اینست مسلمانی خام
سحر فرعون چہ آرد و چہ فرو خواہد برد
ازدہای علمی ازدم ثعبانی خام
خسروا شمس بیراست قوی پختہ سخن
نیست چودفتر یان سوختہ دیوانی خام
ست آو پختہ شعرش چوز و پختہ ونیست
سخنش جوں سخن پختہ خاقانی خام ۶

امیر خسرو بھی بغرا خان کے ساتھ قیام پذیر تھے۔لیکن بنگال میں قتل و غارت اور وہاں کی مرطوب آب وہوا امیر خسرو کا جی نہ لگا۔بغرا خان نے روک لیا۔پھر بھی وہ چھ مہینے کے اندر اندر ماں اور عزیزوں سے ملنے کا عذر کر کے دلی چلے آئے۔ ۷

بنگال میں لکھی گئی ایک اور کتاب کا نام "نامِ حق" ہے۔ یہ شعری مجموعہ جس کا موضوع سخن، نماز، روزہ اور غسل کے احکام ہیں اور جن کا تعلق ایک مسلمان کی روزمرہ زندگی سے ہوتا ہے۔ "نام حق" بغرا خان کے بیٹے رکن الدین کیکاؤس کے عہد (۱۲۹۱۔۱۳۰۰) میں بمقام سنارگاؤں لکھی گئی۔ ۸

صغیر حسین المعصومی کا خیال ہے کہ "نام حق" شیخ شرف الدین ابوتوامہ نے لکھی تھی لیکن عبد الکریم مندرجہ ذیل اشعار کی بنا پر کہتے ہیں کہ "نام حق" شرف الدین نے نہیں بلکہ ان کے کسی ایک شاگرد نے لکھی تھی۔وہ اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

من بعجز و قصور معترفم   نی چو نادان احمق و خرفم
پیش ازیں گفتہ اند اہل سلف   عذر من صنف قد استہدف
لیک برقدر خویش کوشیدن   بہ زبیکاری و خموشیدن
من بقدر مجال کوشیدم   فقہ را برد نظم پوشیدم
نکنی عیب گر تو بتوائے   کہ در و حلہ بپوشائے
اسپ تازی اگرچہ بہ تازد   لاشہ خو یشتن نیند از و
صدو ہشتاد بیت و دہ بابست   لائق روزگار اصحاب است
موجز دو دلپسند افتادست   لاجرم بے نظیر افتاد است
ایں ترا یادگار از شرف است   نام او در جہاں ہر طرف ست
از بخاراست مولد و نسبش   در خراسان علوم مکتبش

مندرجہ بالا شعر نمبر ۹ میں شرف سے مراد غالباً شرف الدین ابوتوامہ ہیں۔جن کی اس عہد میں

کافی شہرت تھی۔اور جونجارا میں پیدا ہوئے تھے۔اگر "نام حق" شرف الدین کی تصنیف ہوتی تو شعر نمبر ۹ اور ۱۰ میں انہوں نے صیغہ واحد غائب کا استعمال نہ کیا ہوتا جبکہ ان کے علاوہ باقی تمام اشعار میں صیغہ واحد متکلم کا استعمال کیا ہے۔مگر اتنا ضرور ہے کہ یہ شعری مجموعہ شرف الدین ابوتوامہ کی بنگال آمد کے بعد ان کے کسی شاگرد نے تصنیف کیا تھا۔ [9]

"نام حق" ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۵ء میں مطبع محمدی واقع شہر کانپور سے چھپی تھی۔سلطان غیاث الدین بن سلطان سکندر (۱۳۹۶۔۱۳۸۹ء) سلطان بنگال کے زمانے میں بھی فارسی شعر و ادب کی سرپرستی ملتی ہے۔غیاث الدین نے ۱۳۸۹ء / ۷۸۹ھ سے لے کر ۱۴۰۹/ ۸۱۶ھ تک بنگال پر حکمرانی کی۔اور موجودہ ڈھاکہ کے نزدیک سنار گاؤں میں دفن ہوئے۔

کہتے ہیں سلطان غیاث الدین حاکم بنگال کی تین کنیزیں تھیں جن کا نام سرو، گل اور لالہ تھا۔ وہ سلطان کو غسل دینے کی خدمت انجام دیتی تھیں۔سلطان غیاث الدین ان کنیزوں کے نام پر ایک مصرعہ موزون کیا:۔

ساقی! حدیث سرو و گل و لالہ می رود

اور حافظ شیرازی کو بھیج دیا اور ان سے درخواست کی کہ اس کے ساتھ کا دوسرا مصرع موزوں کر دیں تاکہ شعر مکمل ہو جائے اور اس زمیں میں ایک غزل بھی لکھ بھیجیں۔

اور انہیں بنگال میں آنے کی دعوت دی۔حافظ شیرازی از خود نہ آسکے لیکن دس اشعار پر مشتمل ایک غزل ضرور بھیج دی۔جس کا مطلع یہ ہے:۔

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود
وین بحث با ثلاثہ غسالہ می رود [10]

حضرت نور قطب عالم اچھے فارسی دانوں میں تھے۔بادشاہ وقت سلطان غیاث الدین آپ کا ہم درس تھا۔بادشاہ نہ صرف آپ کی روحانی پاکیزگی کا معتقد تھا بلکہ بچپن سے دونوں میں دوستانہ تعلقات تھے۔ اس زمانے کے واقعات بھی ایسے پیش آئے کہ حضرت نور قطب عالم کو معاملات ملکی میں دخل دینا پڑا۔حضرت نور قطب عالم صرف ایک بڑے خدا رسیدہ اور خادم خلق بزرگ اور صاحب طرز اہل قلم نہ تھے بلکہ بنگال کی تاریخ "ریاض السلاطین" کے بیان کے مطابق واقعات نے انہیں مجبور کیا کہ وہ ملکی معاملات میں بھی حصہ لیں۔[11]

نور قطب عالم نے ۱۴۱۰ء/ ۸۱۳ھ میں وفات پائی اور پنڈوہ میں مدفون ہوئے۔تالیفات شیخ میں "مکاتیب" اور ''انیس الغرباء'' شامل ہیں۔[12]

نور قطب عالم کے ''مکتوبات'' کا ایک مجموعہ بانگی پور لائبریری میں موجود ہے۔[13] ان کے مکاتیب کے بارے میں شیخ عبدالحق کہتے ہیں کہ وہ نہایت شرین ولطیف ہیں اور اہل درد و محبت کی زبان میں لکھے گئے ہیں۔[14]

''انیس الغرباء'' اٹھاون صفحات کا یہ رسالہ ۱۸۹۹ء میں گلزار احمد پریس مراد آباد میں چھپا تھا، جس میں رسول اکرم ﷺ کی بعض احادیث ان کا ترجمہ اور صوفیانہ رنگ میں ان کی شرح کردی ہے۔

بنگال میں نویں صدی ہجری میں لکھی گئی ایک اور قابل ذکر کتاب ابراہیم قوام فاروقی کی لکھی ہوئی ''شرفنامہ'' ہے۔یہ ایک فارسی لغت ہے۔بنگال جب سلطنت دہلی سے آزاد ہو گیا تو یہاں حاجی شمس الدین الیاس (۱۳۸۵۔ ۱۳۳۹ء) نے ایک نئی سلطنت کی بنیاد رکھی۔جسے تاریخ میں ''خاندان الیاس شاہی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اس خاندان کے بادشاہ ابو

المظفر رکن الدین باربک شاہ (۱۴۷۳-۱۴۵۹) کے زمانے میں ''شرفنامہ'' کی تدوین ہوئی۔

''شرفنامہ'' کا ایک افادی پہلو یہ ہے کہ اس نے اپنے معاصرین میں بنگال کی مشہور اور قابل ذکر مسلم شخصیتوں کا تذکرہ کیا ہے جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نویں صدی ہجری یعنی پندرہویں صدی عیسویں میں ''آزاد سلاطین بنگال'' کے عہد میں فارسی نہ صرف سرکاری زبان تھی بلکہ اس زبان کے شاعر و ادیب ایک مستقل اور مسلمہ حیثیت کے مالک تھے اور انہوں نے اس زبان میں تصنیف بھی کی ہے یہ الگ بات ہے کہ ان کے شعری و ادبی کارنامے ہم تک نہ پہنچ سکے اور جن کے نام معلوم ہو سکے اب وہ کتابیں ناپید ہیں۔اس لئے صحیح طور پر ان کی ادبی حیثیت کا تعین ممکن نہیں۔ان میں افتخار الحکماء امیر شہاب الدین کرمانی کی ''فرہنگ شہاب الدین کرمانی'' کا اس طرح پتہ چلتا ہے کہ ''شرفنامہ'' میں ابراہیم قوام فاروقی نے اس سے بعض الفاظ کے سلسلے میں سند پیش کی ہے۔دوسرے شخص جن کا تذکرہ ''شرفنامہ'' میں آیا ہے وہ شیخ واحدی ہیں جن کی ''حبل المتین'' سے کئی جگہ اشعار کے حوالے پیش کئے گئے ہیں۔تیسرے شخص امیر زین الدین ہروی ہیں جو اس زمانے میں بنگال کے ملک الشعراء تھے۔چوتھے شیخ منصور شیرازی ہیں جن کا خاندان بنگال میں آباد ہو گیا تھا۔منصور ایک بلند پایہ شیخ تھے جن کے اشعار ''شرفنامہ'' میں نقل کئے گئے ہیں۔پانچویں شخص ملک یوسف ابن حمید ہیں جن کا شمار یہاں کے مقامی شعراء میں ہوتا ہے۔ان پانچ کے علاوہ اور تین شاعروں کا تذکرہ ''شرفنامہ'' میں پایا جاتا ہے جن کے نام سید جلال، سید محمد رکنی اور سید حسین ہیں۔ [۱۵]

بنگال میں حسین شاہی دور (۱۵۳۸-۱۴۹۴ء) اپنی ادبی سرگرمیوں کے لئے مشہور ہے۔اس عہد میں فارسی کے ساتھ بنگلہ ادب کو خوب ترقی حاصل ہوئی۔جادوناتھ سرکار، علاء الدین حسین (۱۵۲۰-۱۴۹۴ء) کے بارے میں کہتے ہیں:۔

> "His literary appreciation was not confined to Arabic and Persian only, but was extended in an increasing degree to the vernacular literature."

لیکن اس کے باوجود فارسی ہی سرکاری زبان تھی۔ایس۔ایم۔اکرام لکھتے ہیں:۔

> "But the court language of Alauddin Hussain Shah was Persian, and though he, like many other Muslim kings, patronized writers in regional language, his primary interest was Persian and Arabic."

ڈاکٹر محمد اسحاق Indian's contribution to the study of Hadith Literature میں لکھتے ہیں:۔

> " Ala Al-Din Hasyn Shah b-Sayyid Ashraf al-Makki, the king of Bengal 900-24/1493-1518, whose memory has been associated as the earliest promoter of Bengali language and literature, was also responsible for the great advance, the study of the Quran and al -Hadith made in this dominion, On his accession to the throne of Bengal in 905/1499, Husayn Shah invited scholars from far and near to come and settle down in his kingdom." [16]

چنانچہ حسین شاہی دور میں مقامی زبان بنگلہ کے علاوہ فارسی زبان بھی بنگال میں کافی مقبول

تھی۔ پندرہویں صدی کی نصف کی ابتدائی دہائیوں میں چینی سیاح مہوان (Mahwan) نے بنگال میں فارسی زبان کے قوی اثرات کا مشاہدہ کیا۔

الیاس شاہی عہد میں بنگال میں خود مختار حکومت کی بنیاد پڑی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی فارسی کو بطور سرکاری زبان کے مروج رکھا۔ اور اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ عربی کو فارسی زبان کی حیثیت دے دی گئی تھی۔ کیونکہ سرکاری خطابات کے لئے جو الفاظ ہوتے تھے وہ سب کے سب فارسی زبان کے تھے مثلاً شرابدار، جمعہ دار، لشکر سرخیل، کارفرمان بر گماشتہ، کوتوال، قاضی، وزیر، مجموعہ دار، اجارہ دار، خان اعظم، خاقان، معظم، مجلس، دربار عام وخاص وغیرہ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ دربار کی زبان فارسی ہی تھی اگر چہ اس عہد کے بیشتر سکے اور کتبے عربی زبان میں لکھے ملتے ہیں۔ لیکن بہت سے ایسے کتبے بھی دستیاب ہوئے ہیں جن میں عوام کے لئے شاہی فرمان و ہدایت کے لئے فارسی زبان کا سہارا لیا گیا ہے۔ حسین شاہ کی کان پور اور اڑیسہ فتح کے موقع پر سلہٹ سے جو کتبے دستیاب ہوئے ہیں وہ فارسی زبان میں ہیں۔[17]

اگر چہ حسین شاہی دور میں بنگال کی روزمرہ زندگی پر فارسی کے اثرات بہت گہرے تھے مگر فارسی ادب کو اس عہد میں پہنچنے کا موقع نہ ملا کیونکہ اس عہد کا کوئی بھی ادبی نمونہ اب تک دستیاب نہیں ہو سکا۔ ادبی لحاظ سے پیچھے رہنے کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس عہد کا بنگال سیاسی طور پر جنوبی ہندوستان سے یک دم جداگانہ حیثیت رکھتا تھا۔ اس طرح بنگال ادبی و ثقافی لحاظ سے بھی علیحدہ ہو گیا مگر دوسری جانب دہلی میں ایران اور دیگر گردونواح کے ممالک سے عالم فاضل وارد ہوتے رہتے تھے، جس کی وجہ سے دہلی میں ایک طاقت ور فارسی ادب و

ثقافت نے جنم لیا۔ اور جس کے موقع بنگال کو میسر نہیں آئے کیونکہ اس کے دہلی کے ساتھ ثقافتی رشتے استوار نہ ہو سکے تھے۔ یہ حالت مغل عمل داری تک یوں ہی برقرار رہی۔[18]

بنگال میں فارسی کو بڑا عروج مغل عہد میں حاصل ہوا۔ اگر چہ مغلوں سے پہلے بھی فارسی دربار کی زبان تھی۔ لیکن عربی اعلی طبقہ کے لوگوں کی زبان تھی۔ فارسی دربار کی زبان تھی اور روزمرہ کی بول چال بنگلہ میں ہوتی تھی لیکن مغل عہد میں نہ صرف دربار میں بلکہ معاشرہ کے ہر حصہ میں فارسی زبان کا سکہ رواں تھا۔ مغل عہد کے بعد سے شاید ہی کوئی کتبہ عربی زبان میں لکھا گیا ہو۔ فارسی متمدن طبقہ کی زبان تھی۔ مسجدوں میں اور سکہ جات پر اسی زبان میں عبارتیں درج ہوتی تھیں۔ یہی دربار میں بولی جاتی تھی۔ مال گزاری وغیرہ کے کاغذات اسی میں مرتب ہوتے تھے۔ کسی شخص کے معاشرتی اور تعلیمی معیار کی کسوٹی اس کی فارسی دانی ہی متصور ہوتی تھی۔ سرکاری ملازمت کے لئے فارسی زبان بہترین سفارش تھی۔ اس لئے ہندو اور مسلماں بلکہ سبھی اقوام فارسی تعلیم پر وقت اور محنت صرف کرتی تھی۔[19]

مغلیہ عہد میں حکمراں طبقہ ادبی ذوق رکھتا تھا اور ادب نواز بھی خوب تھا اس سلسلے میں عبد الرحیم اپنی کتاب Social and Cultural History of Bengal میں کہتے ہیں:

> "The Mughal rule was an illustrious age in learning and culture, The Mughal Emperors, princes, nobles and officers were highly educated and cultured people and their courts were centres of men of knowledge and letters. The intellectual life radiating from the courts illuminated all the provinces of Mughal empire. Bengal was specially fortune in this respect.[20]

مغل عہد کی ایک اہم شعری تصنیف ''گنج راز ''،تھی جس کے شاعر عبدالرحمٰن ہیں،اس کا مخطوطہ فتح آباد سے دستیاب ہوا ہے اور چٹا گانگ یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ اسی میں مقام تحریر سال وسن بھی درج ہے۔جو ۱۵ ذوالحجہ ۹۶۶ ہجری مطابق ۱۵۵۹ نکلتی ہے۔ڈاکٹر عبدالکریم اس کے مقام تحریر کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں چٹا گانگ کے علاوہ فرید پور میں بھی ایک مقام کا نام فتح آباد ہے لہذا وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کون سا فتح آباد ہے تاہم اس بارے میں اس طرح ایک فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ لکھنو سے ''گنج راز '' شائع ہوئی تھی۔جس کے صفحات کی تعداد ۴۴ درج ہے جس پر تحریر ہے۔مولانا عبدالحی کی وفات کے بعد ''گنج راز'' کے نسخے انکی ذاتی لائبریری سے دستیاب ہوئے تھے۔ بعد ازاں ان کے تین شاگردوں نے ''گنج راز'' کو لکھنو سے شائع کرادیا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ ''گنج راز'' فتح آباد چٹا گانگ ہی میں لکھی گئی تھی۔ ۲۱

حکمراں طبقے کی ادب نوازی کی شہرت پا کر ہندوستان کے مختلف علاقوں سے فارسی لکھنے والے بنگال کی طرف رجوع کرنے لگے۔جن میں منیر لاہوری کا نام قابل ذکر ہے۔

منیر لاہوری ۱۶۱۰ء/ ۱۰۱۹ھ میں لاہور پیدا ہوئے۔ابوالبرکات نام تھا۔بچپن ہی سے شعر کا فطری ذوق رکھتے تھے۔چودہ سال کی عمر میں فلکی،سنائی اور انوری کے تتبع میں شعر کہنے لگے اور جوانی ہی میں ان کی شاعری اور انشاء پردازی کا چرچا ہوگیا۔۱۶۳۵ء/ ۱۰۴۵ھ میں وہ آگرہ میں نواب سیف خان کے ملازم ہوگئے۔ ۱۶۳۹ء/ ۱۰۴۹ھ میں وہ بنگال گئے تو یہ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ۲۲

منیر ایسے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی مثنویوں میں سرزمیں پاکستان و ہند کی اشیاء کا ذکر کیا ہے

اور ان کی تعریف و توصیف کی ہے۔مثنوی ''مظہر گل'' جسے '' مثنوی در صفت بنگالہ'' بھی کہتے ہیں،طویل مثنوی ہے جس میں بنگال کے پھلوں، پھولوں، جانوروں اور مناظر فطرت کا بیان ہے۔انہوں نے بنگال کی سرزمیں،اس کے چشموں اور اس کی سرسبزی و تری کا ذکر کر کے پھولوں کی صفات لکھی ہیں۔ عام مشہور پھولوں کے علاوہ چند اجنبی پھولوں مثلاً گل عجائب،گل قدم،گل جہانگیری،گل ہندی،گل فرنگی،گل دو پہری،گل لیلی و مجنوں کا ذکر کیا ہے۔ پھلوں میں بڑھل ، کٹھل، اناس، ہر یاڑیوری اور کوملہ کی خصوصیات بیان کی ہیں،جانوروں اور پرندوں میں سے چیونٹی، ہاتھی، مینا اور مور کا ذکر کیا ہے۔۲۳

مغلیہ عہد میں نہ صرف شعراء بلکہ اساتذہ،طبیب، کاریگر اور گوناگوں ہنرمند بھی بنگال کی طرف کھینچے چلے آئے۔جنہوں نے یہاں کی ادبی اور ثقافی ماحول کو متاثر کیا۔مغلیہ فوج کا ایک ادنی سپاہی بھی اچھا ادبی ذوق رکھتا تھا۔ یہ آپس میں بیت بازی اور مشاعرے منعقد کرتے۔'' بہارستان غیبی'' میں مرزا نتھن کہتے ہیں:

'' آسام میں وہاں کی ہر فتح کے بعد مغلیہ فوج کے سپاہ رنگ رلیاں مناتے موسیقی، گیت،قصہ بیانی اور کتاب خوانی شعر و شاعری کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔''۲۴

سترہویں صدی میں بنگال میں لکھی گئی کتابوں میں ایک نہایت اہم کتاب ''بہارستان غیبی'' ہے۔'' بہارستان غیبی'' کے مصنف مرزا نتھن ہیں۔غیبی ان کا تخلص تھا۔اسی مناسبت سے کتاب کا نام'' بہارستان غیبی'' رکھا۔ اس کتاب میں انہوں نے شہنشاہ جہانگیر (۱۶۲۸ء/۱۶۰۵) کے دوران حکومت میں پیش آنے والی بنگال اور آسام کی جنگی مہمات کا ذکر کیا ہے جن میں انہوں نے بذات خود حصہ لیا۔ ناتھن بنگال میں ۲۰ برس قیام پذیر

رہے۔لہذا وہ یہاں کی جغرافیائی ،طبعی سیاسی اور انتظامی نظم ونسق سے خوب واقف تھے۔ اس لئے یہ کتاب سیاسی لحاظ سے نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ اور جہانگیر کے عہد میں بنگال کے حالات کی پوری عکاسی کرتی ہے۔یہ کتاب بنگال کی سب سے پہلی باضابطہ تاریخ ہے۔ ''بہارستان غیبی'' کے مطالعے سے سترہویں صدی کے بنگال کی ادبی سرگرمیوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔مرزا نتھن مغل سپاہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آسام میں ہر فتح کے بعد جشن مسرت منعقد ہوتا تھا اور قصہ خوانوں موسیقاروں گویوؤں اور شاعروں کا اجتماع ہوتا۔لشکر کے ساتھ شاعر اور موسیقار بھی میدان جنگ میں جاتے۔ سپاہ میں سے کچھ خود بھی شاعر تھے۔ جو رزمیہ نظمیں لکھتے تھے مولانا لقمان ایک اچھے درجے کے شاعر تھے۔جنہوں نے مغلوں کی ڈاکچیرا (Dachra) فتح [۲۵] اور مرزا نتھن کی بندر نہر کی بحری جنگ میں موسی خان کو مغلوب کرنے کے موقع پر ''جنگ نامہ'' نظمیں کیں۔[۲۶]

اور جب افتخار خان نے علی اکبر کو پورنیہ کی جنگ میں شکست فاش دی تو اس موقع پر بھی لقمان نے ایک منظوم ''جنگ نامہ'' لکھا۔[۲۷]

ایک اور شاعر مولانا میر قاسم نے افغان سردار عثمان کو مغلوب کرنے کے موقع پر ''جنگ نامہ'' تحریر کیا۔[۲۸]

مولانا ملک مبارک نے سلہٹ کے افغان سردار بایزید[۲۹] اور کوچ بہار میں مغلیہ کامیابی کے بعد ''جنگ نامہ'' نظم کیں۔[۳۰] اور اس نے صادق بہادر کی موت پر ایک مرثیہ لکھا۔[۳۱] سترہویں صدی بنگال کی ایک اہم تصنیف ''صبح صادق'' ہے۔مصنف محمد صادق ہیں۔یہ

جہانگیر نگر ڈھاکہ میں لکھی گئی تھی۔ ۱۶۳۹ء/۱۰۴۹ھ میں شاہزادہ شجاع کا بنگال میں بحیثیت گورنر تقرر ہوا تو محمد صادق نے اپنی خدمات شاہ شجاع کے دربار سے منسلک کر دیں اور ''صبح صادق'' کو لکھنے کے بعد اسے شاہ شجاع کے نام سے منسوب کر دیا۔''صبح صادق'' کو انہوں نے ۱۶۳۱ء /۱۰۴۱ ھ میں لکھنا شروع کیا اور ۱۶۲۸/۱۰۴۸ھ میں اتمام کو پہنچایا۔ چار جلدوں پر مشتمل اس کتاب پر نظر ثانی کا کام ۱۶۳۹ء/۱۰۴۹ھ میں ختم ہوا۔

محمد صادق کے بیان کے مطابق شاہ جہاں (۱۶۵۹ء۔۱۶۲۸ء) کے عہد میں جہانگیر نگر ڈھاکہ علم وادب کا مرکز تھا۔''صبح صادق'' میں انہوں نے ان چند فضلاء کا ذکر کیا ہے جو اس عہد میں جہانگیر نگر میں رہتے تھے۔پہلے قابل ذکر شخص قاسم خان جوینی (۱۶۳۲۔۱۶۲۸ء) ہیں جو ادبی ذوق اور شاعرانہ صلاحیت کے مالک تھے۔[32]

قاسم ان کا تخلص تھا اور صاحب دیوان تھے۔[33] میر علاء الملک شاہزادہ شجاع کے اتالیق اور دربار میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ان کے ادبی کارناموں میں علم منطق کے موضوع پر'' مہذب'' اور مذہبی مسائل پر''انوار الہدایت'' اور''سیرت الواسط'' شامل ہیں۔ وہ اچھے مرتبہ کے شاعر بھی تھے میر علاء الملک کے بھائی میر ابوالمعالی بھی اچھے شاعر تھے۔اس کے علاوہ محمد یزدی بھی نہایت قابل شخص تھے۔جو اعظم خان کی صوبہ داری کے زمانے میں بنگال کے قاضی تھے۔عبدالرحیم تخلص حیدری اور خواجہ سید الدین محمد مشہدی کامیاب شاعر اور محمد حسین منیری غفاری شاعری کے علاوہ فن خطاطی میں بھی ماہر تھے۔اس کے علاوہ محمد صادق نے مولانا ندیم جیلانی اور احمد بیگ اصفہانی کی شاعرانہ صلاحیتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔اس کے علاوہ ان کا بیان ہے۔کہ مغلیہ فوج کا تقریبا ہر سپاہی شاعری، خطاطی اور دیگر علوم وفنون میں دستگاہ رکھتا تھا۔[34]

بنگال میں فارسی کی ترویج میں شاہزادہ محمد شجاع (۱۶۶۰۔۱۶۳۹ء) گورنر بنگال بھی قابل ذکر ہیں۔ ایس۔ایم۔اکرام شاہزادہ شجاع کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"Shuja's prolonged tenure of governorship is landmark in the literary and cultural history of Bengal." 35

جادو ناتھ سرکار History of Bengal میں شاہزادہ شجاع کے بارے میں کہتے ہیں:۔

> "This prince (Shuja) could not help appreciating the highly cultured and intellectual society of the many able Persian scholars and administrators whom he met with in Bengal." 36

شاہزادہ شجاع خود بھی شاعر تھا اور کبھی کبھی شغل شاعری کرتا تھا اس کی ایک رباعی کا نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

دردیست اجل کہ نیست درمان او را
بر شاہ و گداست حکم فرمان او را
شاہی کہ بحکم دوش کرمان می خورد
خوردند امروز حیف کرمان او را۔ ۳۷

شاہ جہاں کے پرانے نمک خواروں میں میر معصوم بن حسن بن صالح تھے۔ انہوں نے شاہ شجاع کی خدمت میں بیس برس گزارے شاہ شجاع، اپنے باپ شاہ جہاں کے عہد میں بنگال اوراڑیسہ کا گورنر تھا۔لیکن اپنے بھائی اورنگ زیب کے ہاتھوں میں ۱۰۷۰ھ/۱۶۶۰ میں قتل کر دیا گیا۔تو میر معصوم نے مالدہ میں قیام اختیار کرلیا۔ جہاں انہوں نے "تاریخ شاہ شجاع" (۱۶۶۰ء) لکھی۔ یہ تاریخ شاہ شجاع کی زندگی، اس کا بحیثیت صوبہ دار اور تخت نشینی کے لئے اس کی جد جہد کے واقعات پر مبنی ہے۔ 38 میر معصوم بن حسن اچھے شاعر بھی تھے۔ 39

صدیق حسن خان ان کی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں۔ "ہم طرح ابوالکلام و میرزا صائب بود" ان کا نمونہ کلام:۔

مرا کشایش خاطر نہ از گلستانست
کلید قفل دلم برہ بیابان ست
ای کہ ہمراہ موافق ز جہاں می طلبی
آن قدر باش کہ عنقا ز سفر باز آید
خراب ہمت خویشم کہ صبح جو گردون
گر آفتاب بدستم فتاد شام نماند
نام قاصد چوں بر آمد قالب من شد تہی
مرغ روح من جواب نامہ دلدار بود ۴۰

شاہ شجاع کے بنگال قیام کے دوران علاول (۸۰۔۱۶۰۹ء) بھی ان کے درباری شاعر تھے۔ انہوں نے ۱۶۶۰ء میں "ہفت پیکر" کا بنگلہ ترجمہ اور ۱۶۶۴ء میں یوسف گدا کی فارسی کتاب "تحفہ" کا بنگلہ ترجمہ کیا۔، ۱۶۷۹ع میں "سیف الملک" کا بنگلہ ترجمہ کیا اور ۱۶۷۳ میں نظامی کی "سکندر نامہ" کا بھی بنگلہ ترجمہ کیا۔ ۴۱

احادیث الخوانین میں حمید اللہ خان علاول کے بارے میں کہتے ہیں:۔

> "در فارسی ہم شاعر بود۔ چنانچہ از اشتراق مضامین وتشبیہات وطور گفتارش ظاہر می شود۔ اما شعرش در فارسی ندیدہ مگر بعلت قلت فارسی دانان آن وقت محفوظ و مکتوب نماندہ۔" ۴۲

شاہزادہ شجاع کی ادبی سرپرستی حاصل کے لئے ایران سے فارسی لکھنے والے بنگال پہنچے۔اس کے علاوہ برصغیر کے مختلف گوشوں سے فارسی شاعر شہزادہ کی فیاضی کی خبر سن کر اس دیار میں حاضر ہوئے جن میں قابل ذکر لاہور کے شاعر منعم ہیں۔[۴۳]

بنگال میں لکھی جانے والی ایک اور اہم کتاب ''فتح الیسریہ'' ہے۔اس کا موضوع تاریخ اور مصنف شہاب الدین طالش ہیں۔وہ بنگال کی مغلیہ فوج میں واقعہ نویس کے فرائض انجام دیتے تھے۔اور صوبہ دار میر جملہ (۱۶۶۳ء۔۱۶۶۱ء) کے ساتھ کوچ بہار اور آسام کی مہم (۱۶۶۳ء۔۱۶۶۱) پر گئے۔ پھر شائستہ خان (۱۶۷۷ع۔۱۶۶۴) تک، بعد ازاں ۱۶۸۸۔ ۱۶۸۰ء تک) کی صوبہ داری خصوصا مغلوں کی چٹا گانگ فتح (۱۶۶۶ء) کے تجربات بھی قلم بند کئے ہیں۔اس طرح یہ کتاب تاریخی نقطہ نظر سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس لئے کہ اس میں شہاب الدین نے بنگال کے دو قابل کا ذکر صوبہ داروں کے عہد کے اہم واقعات کو قلم بند کیا ہے۔اس کے مطالعے سے اس عہد کے بنگال کے سیاسی سماجی اور اقتصادی حالات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

بنگال میں فارسی ادب کی ترقی میں مرشد قلی خان (۱۷۱۷۔۱۷۱۴ء) کے عہد کو خصوصیت حاصل ہے مرشد قلی خان خود بھی سخن فہم شاعر تھا۔اس کا تخلص سرشاد تھا۔[۴۴]

ایس۔ایم اکرام مرشد قلی خان کے بارے میں کہتے ہیں:

"It was under Murshid Quli Khan, Who was first Deputy and later Subedar for nearly twenty years that Persian writters were particularly encouraged. He moved the seat of government to Murshidabad which under him and his successor

Shuja-ud Din Khan become an important cetre of Muslim Culture and literary activity in Persian."[45]

مرشد قلی خان کی ادب دوستی کا ذکر کرتے ہوئے ایم۔اے۔رحیم کہتے ہیں:

"Murshid Quli Khan increased grants to men of learning and piety. It is said that he maintained 2500 readers and beads-men who were engaged in reading the quran and performing other of devotion." [46]

مرشد قلی خان کی اس ادبیانہ فراخدلی نے ایران وعراق کو بھی اپنی جانب متوجہ کیا اور جوق در جوق پارسی گو بنگال کی طرف کھنچے چلے آئے۔ایران میں نادر شاہ (۱۷۴۷۔۱۷۳۶ء) کے قتل نے بنگال کے حالات کو اور سازگار بنانے میں مدد دی۔علماء وفضلاء کا طبقہ گوشہ عافیت کی تلاش میں بنگال کی طرف روانہ ہوا۔بنگال میں شیعہ حکمرانوں نے ان لوگوں کی طرف خاص توجہ دی کیونکہ نوابان بنگال کو ملک کا نظم و نسق چلانے کے لئے اس قسم بیدار مغز لوگوں کی ضرورت تھی۔اس لئے انہوں نے ایران سے آئے ہوئے ان شیعہ بھائیوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ادھر برصغیر میں بھی دہلی اور شمالی اضلاع میں اضطراب کا عالم طاری تھا۔یہ تمام حالات بنگال کی ثقافتی زندگی کی رونق افزائی کے لئے بہت سازگار ثابت ہوئے۔اس عالم بے چارگی میں بہت سے ادیب اور زبان دان نوابان مرشد آباد کے ہاں پناہ گزیں ہوئے۔[۴۷]

دیار غیر سے آنے والے شعراء میں اول قابل ذکر اقدس ہیں۔میر رضی اقدس شوستری (پیدائش ۱۷۱۶ء/۱۱۲۸ھ) عراق، عرب اور عجم کی سیاحت کرتے ہوئے ۱۷۳۶/۱۱۳۹ھ

میں بصرہ بندرگاہ سے سورت کی بندرگاہ پہنچے اور بحری راستے سے بنگال وارد ہوئے اور نواب شجاع الدولہ، ناظم بنگالہ کے سایۂ عاطفت میں کچھ وقت گزارا۔ نواب کے انتقال کے بعد دکن آئے اور نواب آصف جاہ کے ہاں ملازمت اختیار کر لی، مگر جلد ہی یہ سلسلہ ترک کر دیا اور گوشہ نشیں اختیار کر لی۔ نواب محمد صدیق حسن خان ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''میر درزبان خود ہی نظیر زمان بود ودر طاقت لسان وصنوف فضائل ممتاز اقرار۔ حریر کلک اقدس سامعہ می افروزد'' صدیق حسن خان نے ان کے چند شعر پیش کئے ہیں ان کا نمونۂ کلام یہ ہے:

ظالم از عریدہ بارستم خویش کشد
عقرب از کجروشی بر سر خود نیش کشد
سخت رویان فارغ انداز کاوش اہل جہاں
درزمیں سخت رسم کندن بنیاد نیست۔ [۴۸]

بنگال میں باہر سے آنے والوں میں ایک قابل ذکر نام مرزا لطف اللہ عرف مرزا لطف علی خان کا ہے ان کے والد حاجی شکر اللہ تبریز کے رہنے والے تھے۔ مرزا لطف اللہ تجارت کے سلسلے میں کلکتہ آئے۔ اور اپنی قابلیت کے بل بوتے پر نواب مرشد قلی خان کی بیٹی سے عقد کیا۔ نواب مرشد قلی خان اپنے داماد کے حق میں اپنے خطاب مرشد قلی خان دست بردار ہو گئے اور خطاب مرزا لطف اللہ کو تفویض کر دیا۔ بعد ازاں مرشد قلی دوم کے نام سے مشہور ہو گئے۔ اور ۱۷۱۸ء/۱۱۳۱ھ ڈھاکہ سے نائب ناظم مقرر ہوئے۔ [۴۹]

مرشد قلی دوم اچھے درجے کے شاعر تھے اور ان کا تخلص مخمور تھا۔ ان کا ایک دیوان بھی تھا۔ ان

کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہیں:

تعجب نیست بدطنیت اگر حاجت روا باشد
کہ زخم کہنہ را خاکستر عقرب دوا کردد
دریں چمن بچہ امید خوش کنم دل را
چو نخل موم ندارم بخود گمان اثری۔ [۵۰]

اس عہد میں بنگال میں بھی اچھے اچھے مقامی فارسی شاعر پیدا ہوئے۔ جن میں قابل ذکر برقؔ ہیں۔ ایس۔ ایم۔ اکرام ان کے بارے میں کہتے ہیں:

" Probably the most eminent was Barq, who has left poetry of higher order and has been called the ~ parrot of Bengal" [51]

آزاد حسین بلگرامی مرشد قلی خان دوم کے عہد میں جہانگیر نگر (ڈھاکہ) میں رہتے تھے۔ آزاد ایران سے ترکِ وطن اختیار کر کے ڈھاکہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ ان کی تاریخی تصنیف کا نامً ''نو بہار مرشد قلی خانی'' ہے۔ اس کتاب سے اس عہد کے سماجی، سیاسی اور معاشرتی حالات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اس تصنیف کو انہوں نے اپنے مربی مرشد قلی کے نام پر انتساب کیا۔ [۵۲]

نواب علی وردی خان (۱۷۵۶ء۔۱۷۴۰ء) کے زمانے میں بھی فارسی شعر وادب کو اچھا خاصا عروج حاصل ہوا۔ علی وردی خان خود بھی ادب دوست شخص تھا اور اہل علم کی بہت تعظیم و تکریم کرتا تھا۔

اس کی ادب نوازی کی وجہ سے اس کے عہد میں اسلامی علم، فارسی ثقافت ادبیات کے گونا گون شعبوں نے کافی ترقی حاصل کی۔ ''سیار المتاخرین'' میں غلام حسین نے بہت سے عالم و

فاضل لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں مولوی محمد نصیر، زائر حسین خان، میر محمد علیم، مولوی محمد عارف، میر رستم علی خان، شاہ محمد امین، شاہ آدم، ہیئت بیگ، شاہ خضر، سید میر محمد سجاد اور شاہ حیدری قابل ذکر ہیں۔

قاضی غلام مظفر جو مظفر علی خان کے نام سے مشہور تھے۔ اچھی ذہانت اور شاعرانہ صلاحیات رکھتے تھے۔ اور مرشد آباد میں مصنف اعلی کے عہدے پر فایز تھے۔ ایران سے مرشد آباد میں پناہ گزین۔ محمد حزین شعر و شاعری اور تصنیفی صلاحیت کی وجہ سے بہت نامور تھے۔ اس کے علاوہ وہ اسلامی علوم، علم نجوم اور سائینس پر بھی مہارت رکھتے تھے۔[۵۳]

شاہ محمد حسین جو ایران سے ترک وطن کر کے مرشد آباد آئے تھے عربی زبان، علم فقہ و علم تفسیر میں لاثانی تھے۔ ان کے شاگرد ابوالقاسم بھی اپنے عالم استاد کی مانند قابل تھے۔[۵۴]

سید محمد علی طبعیات و سائینس، اور حاجی بدیع الدین قرآن، تفسیر و فقہ میں لاجواب تھے۔[۵۵]

ان کے علاوہ علماء فضلاء میں زائر حسین خان، تقی قلی خان، علی ابراہیم خان، حاجی محمد خان، مرزا حسین سیساوی اور میر محمد علی فاضل کے نام شامل ہیں۔ ان صاحب علم و فضل کی موجودگی سے مرشد آباد علم و ثقافت کا ایک مرکز بن گیا۔

بنگال میں نوابان کا دور ادبی لحاظ سے نہایت اہمیت رکھتا تھا۔ اس عہد میں فارسی زبان میں تاریخی موضوعات پر بہت انمول کتابیں لکھی گئیں یہ کتابیں ادبی اور تاریخی دونوں لحاظ سے اہم ہیں۔ ان میں پہلی قابل ذکر '' تاریخ بنگالہ مہابت جنگی'' ہے۔[۵۶]

جو یوسف علی خان کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کتاب کی ابتداء نواب علی وردی مہابت جنگ کی ابتدائی زندگی سے ہوتی ہے بعد ازاں اس کے کارناموں اور واقعات زندگی کا بیان ہے۔

کتاب کا خاتمہ نواب کی وفات ۱۷۵۰ء/۱۱۶۴ھ اور سراج الدولہ کی تخت نشینی کے بیان پر ہوتا ہے۔

یوسف علی نے فارسی شعراء کا ایک تذکرہ بنام ''حدیقۃ الصفا'' اور کتاب '' مجموعۂ یوسفی'' بھی تحریر کیں۔ یوسف علی کے داماد علی ابراہیم خان نے بھی ایک تاریخی کتاب '' تاریخ ابراہیم خانی ''(۱۷۴۸) کے نام سے لکھی۔

دوسری اہم کتاب ''سیر المتاخرین'' ہے۔ مصنف غلام حسین خان طباطبائی ہیں۔ جو نواب علی وردی خان کے قریبی عزیز تھے۔ ''سیر المتاخرین'' صحیح حقائق پر مبنی زوال سلطنت مغلیہ کی قیمتی تاریخی دستاویز ہے۔

۱۶۶۸ء تا ۱۶۹۸ء کے واقعات پر محیط ہے۔ جس میں اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد پیش آنے والے واقعات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ متعدد بادشاہ تخت نشین ہوئے شمال سے جنوب تک بڑی ہنگامہ خیز لڑائیاں لڑی گئیں۔ تخت و تاج کے لئے سازشیں ہوئیں۔ غرض کہ زوال سلطنت مغلیہ کی ریشہ دوانیوں، قتل و غارت گری، خون ریزی کی بڑی ہی دلخراش داستان ہے۔[۵۷]

غلام حسین خان طباطبائی کی کتاب ''سیر المتاخرین'' دور متاخرین کی مستند تاریخ ہے۔ اس کام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دور متاخرین کے کسی بھی مورخ نے اس کتاب کو نظر انداز کرنے کی کوشش نہیں کی۔ غلام حسین طباطبائی کو میکائے جیسے شخص نے سراہا ہے اور ملی نے اس کے حوالے دیئے ہیں۔[۵۸]

ایک اور قابل ذکر کتاب ''مظفر نامہ'' ہے جو ۱۷۷۲ء/۱۱۷۶ھ میں لکھی گئی۔ مصنف کرم علی

ہیں جو علی وردی خان کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھے۔ ''مظفر نامہ'' بنگال کی تاریخ ہے۔اس تاریخ کا نام انہوں نے اپنے مربی محمد رضا خان کے نام پر ''مظفر نامہ'' رکھا جن کا خطاب مظفر جنگ تھا۔مظفر جنگ بنگال کے نائب صوبہ دار تھے۔ جو وارن ہسٹنگز کے زمانے (۱۷۷۲۔۱۷۸۵ء) عہد میں ۱۷۷۲ء/۱۱۸۲ھ میں اس عہدے سے برطرف کر دیئے گئے۔

''تاریخ بنگالہ'' کے مصنف منشی سلیم اللہ ہیں۔یہ ناظمان بنگال کی تاریخ ہے جو انہوں نے ہنیری وینسیٹرٹ (Henry Vansittart)، کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کے گورنر کی (۱۷۴۰۔۱۷۶۴ء) ایما پر لکھی، یہ بنگال کی ساٹھ سالہ (۱۶۹۶ء۔۱۷۵۶ء)) تاریخ ہے ۔جس کی ابتداء صوبہ دار ابراہیم خان (۱۶۸۹۔۱۶۹۷ء)) سے لے کر نواب علی وردی خان کی وفات (۱۱۷۰ھ/۱۷۵۶ء) پر ہوئی ہے۔یہ بنگال کے چھ نوابان کی ساٹھ سالہ تاریخ کو احاطہ کیئے ہوئے ہے جن میں نواب ابراہیم خان،شہزادہ عظیم الدین،جعفر خان سرفراز خان، شجاع الدولہ اور علی وردی خان (۱۶۹۶ء۔۱۷۵۷ء) شامل ہیں۔اگرچہ مصنف نے تاریخی واقعات کے بیان میں کہیں کہیں غلطی کی ہے۔مگر اس کے باوجود بنگال کی سماجی اور معاشی زندگی کی ایک اہم دستاویز ہے۔

عبداللطیف کی ''ہفت اقلیم'' جو ۱۶۰۷ میں لکھی گئی۔وہ ابوالحسن دیوان بنگال کے دربار میں خدمت گزار تھے۔اس علاقے کی سماجی زندگی کی اچھی تصویر کشی ہے۔۵۹

''حقیقت الاقلیم'' کے مصنف مرتضی حسین ہیں جنہوں نے کچھ عرصہ میر قاسم (۱۷۶۰ء۔۱۷۶۳ء) کے ہاں خدمات انجام دیں اور بعد میں کیپٹن جوناتھن اسکاٹ (Captain

Jonathan Scott) کے منشی مقرر ہوئے۔جس کی فرمائش پر انہوں نے یہ تاریخی کتاب تصنیف کی تھی۔

''خورشید جہاں نما'' بھی بنگال میں لکھی ایک تاریخی کاوش ہے۔جس کے لکھنے والے الٰہی بخش ہیں۔اس کتاب سے نوابان بنگال کے زمانے کی تاریخی و سماجی واقعات کے بارے میں آگاہی حاصل ہوتی ہے۔۶۰

ایک اور اہم تاریخی کتاب کا نام ''خلاصۃ التواریخ'' ہے۔اس کتاب کے دوسرے حصے کا نام ''واردات قاسمی'' ہے مصنف شتاب رائے ہیں۔جو ۱۷۷۳ء میں بہار کے نائب ناظم تھے۔اس کتاب کے مطالعے سے نواب میر قاسم اور مصنف کے اپنے خاندانی حالات کا پتہ چلتا ہے۔ان کے علاوہ سیر المتاخرین میں بحیثیت تاریخ نویس فقیر اللہ اور تقی قلی خان کے نام بھی درج ہیں۔

مندرجہ بالا تاریخی کتابوں کے علاوہ دیگر نوع کی کتابوں میں عشقیہ کہانی ''گل بکاولی'' ہے جو عزت اللہ نے ۱۷۷۲ء میں نظمیہ انداز میں لکھی۔۶۱

نواب سراج الدولہ (۱۷۵۶۔۱۷۵۷ء) کو فارسی و اردو سے بڑی دلچسپی تھی۔وہ خود بھی عالم تھا اور اہل علم کی قدر کرتا تھا۔اس نے بھی علم و ادب کی بڑی سرپرستی کی۔اس کے دربار میں نامی گرامی شعراء کو شرف باریابی حاصل تھا۔جن میں شاہ قدرت اللہ قدرت اور فرحت زیادہ مقبول ہوئے۔ یہ شعرائے دہلی و لکھنو، میر،سودا، آبرو، حاتم اور ناجی، وغیرہ کے ہم عصر تھے۔ ۶۲

سید محمد علی بھی اچھے فارسی دانوں میں سے تھے۔جن کی پیدائش دکن میں ہوئی لیکن تعلیم ایران

کے علمائے کبار سے حاصل کی۔ حج اور زیارتوں کے بعد مرشد آباد پہنچے۔لیکن نواب سراج الدولہ نے ان کی قدر نہ کی جبکہ علی وردی خان ان کا بڑا مداح اور معتقد تھا۔مرشد آباد میں انہوں نے درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع کیا۔انہوں نے عربی اور فارسی میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔ملا محسن کاشی کی علم فقہ کی دو کتابوں کی عربی اور فارسی شرح لکھی۔ اور علم نحو میں بھی ایک نامکمل فارسی رسالہ لکھا۔[63]

پلاسی کی لڑائی (۱۷۵۷) کے بعد بنگال مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا اور اقتدار انگیریزوں کے پاس چلا گیا اور دارالخلافہ بھی ۱۷۷۶ء/ ۱۱۸۶ھ میں مرشد آباد سے کلکتہ منتقل ہوگیا۔ان سیاسی تبدیلیوں کے باوجود فارسی کی اہمیت میں کوئی کمی نہ آئی۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام اعلیٰ نے بھی فارسی کی سرپرستی کی۔انہوں نے فارسی اردو اور دیگر مقامی زبانوں کی نایاب کتابوں کا ذخیرہ کیا اور کلکتہ کے علاوہ مرشد آباد، پٹنہ، ڈھاکہ، دہلی، لکھنو اور دوسرے علاقوں میں ان کی تلاش شروع کی۔کمپنی کے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کام میں انہوں نے زر کثیر صرف کیا اور اسی مجموعہ سے فورٹ ولیم کالج (۱۸۵۱) کی لائبریری قائم کی۔[64]

۲۰ فروری ۱۸۲۸ء کو اردو کے مشہور شاعر اسداللہ خان غالب اپنی پینشن کی بازیابی کے لئے کلکتہ پہنچے۔ان دنوں کلکتہ میں فارسی اپنے پورے عروج پر تھی۔مرزا سے اپنے مقدمے کے متعلق تو کچھ نہ ہوسکا، ہاں فارسی شعر گوئی کا جو شوق طبیعت میں راسخ ہوگیا تھا۔اسے پورا کرنے کے مواقع ملتے رہے۔[65]

اس زمانے میں کلکتہ میں کئی انگریز فارسی ادب سے دلچسپی رکھتے تھے اور فارسی بولنے پر قادر تھے۔[66]

سفر کلکتہ سے ایک ادبی نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی سے مرزا کا شغف بڑھ گیا۔سفر کلکتہ سے پہلے انہوں

نے اردو اشعار زیادہ لکھے فارسی اشعار کم، بلکہ قیام کلکتہ کے دوران میں بھی جب انہیں ایک مرتبہ فی البدیہہ شعر کہنے پڑے تو انہوں نے اردو قطعہ ہی پیش کیا۔لیکن مرزا نے کلکتہ میں فارسی کی جو بہار اور قدر ومنزلت دیکھی اس نے ترازو کا پلہ اس زبان کی طرف جھکا دیا۔اور اب انہوں نے اردو شعر بیک قلم ترک کردیے۔[67]

ان دنوں کلکتہ میں فارسی کے مستند اساتذہ میں مولوی عبدالقادر رام پوری، (نواب عمادالملک بلگرامی کے دادا) مولوی کرم حسین بلگرامی سفیر حکومت اودھ اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی موجود تھے۔ان کے علاوہ شاہزادکامران کی طرف سے کفایت خان ایک ایرانی سفیر کلکتہ آیا ہوا تھا۔ان کے علاوہ نواب اکبر علی خان متولی امام باڑہ ہگلی (برادر زادۂ مصنف سیر المتاخرین)[68] اور مولوی سراج الدین احمد جن کا فارسی اخبار ''آئینہ سکندر'' سے کچھ تعلق تھا جیسے فارسی دان لوگ کلکتہ میں موجود تھے۔[69]

کمپنی کے حکام اعلیٰ نے فارسی کی سرپرستانہ امداد کی اور فارسی سیکھنے والوں کو سالانہ مقررہ تنخواہ کے علاوہ سال اول ماہانہ دوسو روپے اور دوسرے سال تین سو روپے کا مخصوص وظیفہ دیا جاتا تھا۔اس سلسلے میں ۶ دسمبر ۱۷۹۰ء سب سکریٹری J.L Chauvet کے زیر صدارت ایک قرارداد پاس ہوئی۔اپریل ۱۷۹۵ء میں سب سکریٹری C. Shakespear نے پھر اس پر نظر ثانی کی۔

۱۷۷۸ء میں Charles Wilkins (۱۸۳۷ء۔ ۱۷۳۹ء) نے فارسی اردو ٹائپ کا ایجاد کیا۔جس کی وجہ سے کتابوں، اخباروں اور رسالوں کی اشاعت میں سہولت ہوئی۔ان میں بیشتر فارسی زبان میں تھیں۔۱۷۷۸ میں ہی اس نے ہوگلی سے ایک فارسی گرامر شائع کرائی۔[70]

اس زمانے کی ادبی تاریخ میں نواب ابراہیم خان کا نام ملتا ہے۔ جو مرتبہ طباطبائی کا سیاسی تاریخ میں ہے۔قریب قریب وہی رتبہ نواب علی ابراہیم خان کا ادبی تاریخ میں ہے۔ وہ عظیم آباد کے قریب شیخ پورہ میں پیدا ہوئے اور مرشد آباد میں نشو نما پائی اور آخری عمر میں مرشد آباد میں ہی خانہ نشین ہو گئے۔ ۱۷۸۱ء میں جب وارن ہسٹنگز کلکتہ سے مغرب کی طرف تسخیر ممالک کے لئے چلا تو راستے میں مرشد آباد سے نواب علی ابراہیم خان کو بصد اعزاز و اکرام اپنے ساتھ لیا۔ لارڈ کارنوالس (۱۷۹۳۔۱۷۸۶ء) کے عہد میں وہ بنارس کے گورنر بھی رہے۔ قیام بنارس کے دوران انہوں نے ادبی اور سیاسی تاریخ نگاری کی طرف توجہ کی۔ ان کی مشہور ترین تصنیف اردو شعراء کا تذکرہ ''گلزار ابراہیم'' ہے۔ جس کا اردو ترجمہ ''گلشن ہند'' ء انجمن ترقی اردو نے شائع کیا۔۔ اس کا زیادہ تر حصہ مرشد آباد میں لکھا گیا۔ مرشد آباد اور عظیم آباد کی ادبی تاریخ جاننے کے لئے اس کی اہمیت بہت یادہ ہے۔ فارسی شعراء کا تذکرہ ''صحف ابراہیم'' ہے انہیں خوبیوں کا مخزن ہے۔ جو اردو تذکرے کا مابہ الامتیاز ہیں لیکن یہ زیور طبع سے محروم ہے۔ ''خلاصۃ االکلام'' مثنوی نگار فارسی شعراء کا تذکرہ ہے۔ اس کے علاوہ کئی تاریخی کتب اور خطوط ان کی یادگار ہیں۔ ۱۸۹۳ء میں بمقام بنارس وفات پائی۔ [۷۱]

قاضی محمد صادق خان اختر فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ والد کا نام قاضی محمد لعل تھا۔ اختر ہگلی (بنگال) کے قاضی زادوں میں سے تھے لیکن بعد میں ہگلی چھوڑ کر لکھنو چلے آئے۔ ۱۸۵۷ء میں انہوں نے لکھنو میں ہی انتقال کیا۔ اختر بڑے جامع کمالات اور نامی شاعروں میں سے تھے۔ فارسی بہت کہتے تھے۔ چنانچہ ان کی فارسی تصنیفات حسب ذیل ہیں:

۱) محامد حیدریہ: غازی الدین حیدر کی تعریف میں۔
۲) گلدستہ محبت جس میں گورنر جنزل لارڈ ہیسٹنگز اور غازی الدین حیدر کی ملاقات کا ذکر ہے۔
۳) صبح صادق (قاضی محمد صادق کی سوانح عمری ہے)
۴) تذکرہ آفتاب عالم تاب۔ جس میں پانچ ہزار فارسی شعراء کا حال اور کلام فراہم کیا تھا۔
۵) دیوان فارسی
۶) بہار بے خزان
۷) بہار اقبال
۸) ہفت اختر [۷۲]

نساخ نے ''تذکرۃ المعاصرین'' میں مندرجہ بالا کتب کے علاوہ ان کی تین اور کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ جو یہ ہیں:۔ (۱) گنج نیرنج (۲) نورالانشاء (۳) نقود الحکم [۷۳]

انیسویں صدی کے ادبی حلقوں میں مرزا جان طپش کو ایک خصوصی مقام حاصل ہے۔ طپش ۱۷۶۴ء/۱۱۸۲ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد طپش نے شاہ عالم ثانی (۱۸۵۶۔۱۷۵۷) کے ولی عہد مرزا جوان بخت جہان دار کے دربار میں ایک فوجی کمان کے افسر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ مغلیہ سلطنت کے زوال پر جہان دار شاہ نے دہلی ترک کیا۔ ۱۸۷۴ء میں طپش بھی جہاندار شاہ کے ہمراہ لکھنؤ آئے اور نواب آصف الدولہ (۱۷۹۷۔۱۷۷۵) کے دربار میں پہنچے۔ یہاں کئی روز قیام کے بعد جہان دار شاہ بنارس روانہ ہوئے تو طپش بھی ان کے ساتھ تھے۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ دن جاری نہ رہ سکا کہ ۱۷۸۶

میں جہاندار کا انتقال ہو گیا اور طپش کا تعلق بھی بنارس سے منقطع ہو گیا۔ وہ تلاش معاش میں بنگال پہنچے اور ڈھاکہ میں نائب ناظم نصرت جنگ (۱۸۲۳-۱۷۹۳ء) کے چھوٹے بھائی نواب شمس الدولہ (۱۸۳۲-۱۸۲۳ء) کے مصاحب خاص مقرر ہوئے۔[۷۴]

ڈھاکہ میں قیام کے دوران طپش نے نواب شمس الدولہ کی فرمائش پر ۱۷۹۳ میں محاورات، روزمرہ اور ضرب الامثال پر مبنی ایک کتاب لکھی اپنے مربی کے خطاب کی مناسبت سے انہوں نے کتاب کا نام "شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان" رکھا۔ اس میں تقریبا ۲۹۰ محاورات ہیں۔ جو اردو زبان میں ہیں۔ لیکن کتاب کا دیباچہ اور محاورات کی توضیح وتشریح فارسی میں ہیں۔[۷۵]

مولوی عبدالرحیم گورکھپوری متخلص بہ تمنا اور معروف بہ دھری، گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد اعلٰی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ۱۸۰۴ء/ ۱۲۱۹ھ میں لکھنو گئے۔ بعد ازاں ۱۸۰۵ء/ ۱۲۲۰ھ میں دہلی اور ۱۸۰۸/ ۱۲۲۳ھ میں کابل اس کے بعد ۱۸۱۰ء/ ۱۲۲۵ھ میں کلکتہ آئے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی اور ٹیپو سلطان کے بیٹوں محمد شکر اللہ، سلطان محمد بشیر الدین اور سلطان محمد جلال الدین کی شعر گوئی میں رہنمائی کرتے تھے اور تصنیف وتالیف کے کام میں مشغول رہتے تھے۔ ان کی فارسی تصنیفات میں:

۱۔ پندنامہ بہرامی
۲۔ تاریخ ہندوستان
۳۔ حکایت ازپ
۴۔ حکایت لقمان حکیم

۵۔ شگرف بیان عبرت توامان
۶۔ فرہنگ دبستان
۷۔ کارنامہ حیدری
۸۔ مشرق الانوار، اور
۹۔ فاتحہ الترجمہ بزبان عربی شامل ہیں۔[۷۶]

رشید النبی وحشت کے والد حبیب النبی کا تخلص رقتؔ تھا۔ جو رامپور سے ہگلی آ کر بس گئے تھے۔ لیکن وحشت کی زندگی کا بیشتر حصہ کلکتے میں گزرا۔ کیونکہ مولوی رقت مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں ملازم تھے۔ مولوی وحشت کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ کیونکہ رقت فارسی کے شاعر تھے۔ لیکن وحشت حافظ اکرام احمد ضیغم کے شاگرد ہوئے۔ عربی وفارسی اور اردو اشعار نہایت خوب اور بغایت مرغوب کہتے تھے۔ عین شباب میں ۱۸۵۷ء/ ۱۲۷۴ھ میں انتقال کیا۔[۷۷]

انیسویں صدی کی قابل ذکر ہستیوں میں شاہ الفت فریاد تھے۔ ۱۸۵۴ء/ ۱۲۱۹ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۸۱/ ۱۲۹۹ھ میں وفات پا گئے۔ ۱۸۳۸/ ۱۲۵۴ھ میں وہ مرشد آباد چلے گئے اور مرشدزادوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ چار سال بعد وہ ناظم مرشد آباد کی طرف سے سفیر ہو کر کلکتے گئے اور ۱۸۷۴/ ۱۲۹۱ھ تک وہیں رہے۔ بتیس سالوں میں وہ سولہ برس تک عہدہ سفارت پر مامور رہے۔ بعد میں استعفی دے دیا۔ لیکن کلکتے میں علمی وادبی زندگی میں ان کا بڑا مقام تھا۔ انہوں نے فارسی زبان میں کئی اخبارات مثلا آئینہ گیتی نما نکالا۔ اکابر کلکتہ نے ان کا بڑا ادب وعزت کرتے تھے۔ خان بہادر عبداللطیف بانی محمڈن لٹریری ایسوسی ایشن،

عبیداللہ سہروردی اور مولانا عبدالروٗف وحید آپ کے شاگرد تھے۔[۷۸]

آپ کی تصنیفات میں شامل ہیں:

۱۔ مثنوی دبستان اخلاق

۲۔مثنوی روضہ معنی

۳۔ مثنوی گنجینہ عشق

۴۔مثنوی طلسم الفت

۵۔ مثنوی درددل

۶۔مثنوی طلسم جہاں

۷۔ دیوان فارسی

۸۔ دیوان اردو۔ان میں دبستان اخلاق ۱۸۷۶ء/ ۱۲۹۳ھ میں محمدی پریس کلکتہ سے چھپی۔[۷۹]

عبدالغفور متخلص بہ شہباز ساکن کلکتہ بنگال کے ان چند اہل علم وفضل نفوس میں سے تھے جن کی قابلیت اور خدمات کا اعتراف زمانے کی بے قدری کے باوجود ان کی زندگی ہی میں کیا جا چکا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کلکتہ کے مشہور اخبار ؔ دارالسلطنت ؔ اور ؔ اردو گائیڈؔ میں مستقل طور پر ان کے علمی، ادبی مذہبی و دیگر موضوعات پر معرکتہ آرا مضامیں شائع ہوا کرتے تھے۔ ان کی نظمیں بھی کلکتہ اور ڈھاکہ کے مختلف جرائد کے علاوہ ہند و پاک کے دیگر رسائل و اخبارات میں آیا کرتی تھیں۔ ایسے اخباروں میں 'اودھ پنچ' لکھنؤ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔[۸۰]

شہباز نثر بھی لکھتے تھے۔شعر بھی کہتے تھے۔ان کا کلام متعدد اصناف سخن مثلاً نظم، غزل، مسدس، مخمس، قطعات، رباعی وغیرہ پر حاوی ہے۔[۸۱]

مثنوی تابستان، سیرت خسروی، مثنوی پنجۂ خورشید، مثنوی چہار عشق اور رباعیات شہباز ان کی تالیفات میں شامل ہیں۔[۸۲]

عبدالروٗف وحید باشندہ کلکتہ بیشتر فارسی کہتے تھے۔آپ کی ولادت ۱۰ فروری ۱۸۲۸ء میں کلکتہ کے ایک رئیس خاندان میں ہوئی۔انہوں نے مدرسہ میں تمام علوم کی تکمیل کی اور زبان فارسی میں بڑا رتبہ حاصل کیا۔آپ کا کلام 'دیوان وحید' نام سے چھپ چکا ہے۔تحصیل علوم سے فارغ ہو کر انیسویں صدی کے نصف میں سب سے پہلے کلکتہ کے اخبار 'سلطان الاخبار' کے ایڈیٹر ہوئے اور ایک اخبار فارسی میں بنام 'دور بین' شائع کیا۔کلکتہ کے اکثر علمی اداروں سے آپ کا تعلق تھا۔۱۸۵۵ میں سرکاری مترجم مقرر ہوئے۔۱۸۶۰ میں آپ کو مدرسہ عالیہ کا فارسی مدرس مقرر کیا گیا۔دوسال تک اس عہدے پر رہے اور مدرسہ میں فارسی کا نیا ذوق پیدا کر دیا۔آب کی قابلیت اتنی مشہور ہوئی کہ ۱۸۶۲ میں مترجم کونسل قانون سازی گورنر جنرل کا عہدہ عطا کیا گیا۔[۸۳] ان کی تصنیفات میں حسب ذیل کتابیں شامل ہیں۔

۱۔تحریرات وحیدی

۲۔تاریخ بنگالہ

۳۔تاریخ کلکتہ

۴۔ صرف وحیدی

۵۔ نحو وحیدی

۶۔ شاخ مرجان

۷۔ تحفۃ الحاج

۸۔ تاج سخن

۹۔ دیوان وحید

۱۰۔ رباعیات وحیدی

۱۱۔ منشآت وحیدی

۱۲۔ جواہرالصنائع

۱۳۔ سخن موزون شامل ہیں۔[۸۴]

فارسی زبان کی خدمات انجام دینے والوں میں نواب سید امیر علی کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ خان بہادر نواب امیر علی ۱۸۱۰ ء میں پٹنہ کے نزدیک بار نامی ایک علاقے میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق عربی، فارسی اور اردو زبان میں کامل دستگاہ حاصل کی۔ حصول تعلیم کے بعد اعلی ملازمتوں کے سلسلہ میں انہوں نے زندگی کا بیشتر حصہ کلکتہ میں بسر کیا۔ اس کے ساتھ فارسی زبان کی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ تاریخ نویسی ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ اس سلسلہ میں ان کی تصنیفات 'امیر نامہ'، 'وزیر نامہ' اور 'بیرنگ نامہ' ہیں۔[۸۵]

انیسویں صدی میں کلکتہ میں ذوالفقار علی مستؔ بھی کافی نامور شاعر تھے۔ انہوں نے ایک تذکرہ بنام 'ریاض الوفاق' ترتیب دیا جس میں ان شعراء و ادباء کا ذکر ہے جو کلکتہ کے گرد و اطراف سے اس علاقے میں تلاش معاش کے لئے آئے تھے۔ جن میں نجم الدین احمد

خان ثاقب، شیخ دلاور علی دل، عابد علی عابد، سراج الدین علی خان اور عبدالہادی مضطر قابل ذکر ہیں۔[۸۶]

برطانوی ہند میں مرزا خلیل اللہ ایران کے سفیر کی حیثیت سے کلکتہ آئے اور انہوں نے اپنی شاعرانہ اور عالمانہ قابلیت کے بل پر اس علاقے کے مسلمانوں میں شعری و علمی ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔[۸۷]

ملک الشعراء میر قمرالدین تخلص منتؔ جن کا اصل وطن مشہد (ایران) تھا کلکتہ میں سکونت اختیار کر لی جہاں ۱۷۹۳ء/ ۱۲۰۸ھ میں وفات پائی۔ ان کے اشعار کی تعداد تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہوگی۔[۸۸]

اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں نے بھی فارسی ادب میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ مہاراجا شتاب رائے، عظیم آباد کے نائب صوبہ دار اور مرشدآباد کے نائب دیوان تھے۔ ان کے دربار سے اشرف علی خان فغاںؔ وابستہ تھے۔ شتاب رائے نے ۱۷۷۵ء میں وفات پائی۔ ان کے بیٹے مہاراجا کلیان رائے عاشقؔ بھی صاحب دیوان شاعر تھے۔ میر جعفر (۱۸۵۷۔۶۰) کے زمانے میں مہاراجا رام نرائن موزوںؔ عظیم آباد میں ناظم تھے۔ وہ فارسی میں حزین کے شاگرد تھے اور اردو میں بھی صاف خوشگوار شعر کہتے تھے۔[۸۹]

بردوان کے مہاراجا مہتاب چاند نے منشی محمد خادم کو فارسی میں مشورہ سخن لینے کے لئے اپنا اتالیق مقرر کیا۔ خادم کا دیوان بنام دیوان خادم انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں چھپا تھا۔[۹۰]

گریش چندر سین (۱۸۳۴۔۱۹۱۰) نے فریدالدین عطار کی 'تذکرۃ الاولیاء' کو فارسی سے بنگلہ میں ترجمہ کیا۔ اس علاوہ انہوں نے فریدالدین عطار کی 'منطق الطیر' اور 'مثنوی مولانا

روم' سے اخلاقی کہانیوں کو بنگلہ میں ترجمہ کیا۔ پھر 'دیوان حافظ'، 'گلستان سعدی'، 'بوستان سعدی'، 'مکتوبات مخدوم شریف الدین منیر'، 'کمیائے سعادت'، 'گلشن اسرار' منتخب حصوں کا بنگلہ ترجمہ کیا۔انہوں نے قرآن شریف کا بھی بنگلہ میں ترجمہ کیا۔[91]

سویتند رناتھ (Satanda Nath) (۱۹۲۲۔۱۸۸۲) نے بہت سے نامور فارسی شعراء کا کلام بنگلہ میں ترجمہ کیا۔اور اپنے کلام میں بہت سے فارسی وعربی الفاظ کا استعمال کیا۔[92]

پنڈت کرشن چندر مجموعہ دار (۱۹۰۵۔۱۸۳۷ء) نے شیخ سعدی (۱۲۹۲۔۱۱۸۴ء) اور حافظ شیرازی (۱۳۸۹۔۱۳۲۰ء) کی بہت سی غزلوں کو بنگلہ میں ترجمہ کیا۔ یہ شعری ترجمہ عوام میں خوب مقبول ہوا۔[93]

رابندرناتھ ٹھاکر (۱۹۴۱۔۱۸۶۱) کے والد دیبندرناتھ ٹھاکر (۱۹۰۵۔۱۸۱۹ء) کو 'دیوان حافظ' از بر یاد تھا۔اس لئے انہیں 'حافظِ حافظ' پکارا جاتا تھا۔[94]

ہندوؤں کے مذہبی رہنما راجہ رام موہن (۱۸۳۳۔۱۷۷۲ ء) نے فارسی زبان میں توحید کے موضوع پر ایک دلچسپ کتاب 'تحفۃ الموحدین' ۱۸۰۴ میں لکھی۔اس میں مختلف مذاہب کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔کتاب کا مقدمہ عربی زبان میں ہے۔[95]

کلکتہ اور مرشد آباد کی طرح بنگال کے مشرقی علاقوں جسے اب بنگلہ دیش پکارا جاتا ہے،ان سب علاقوں میں بھی فارسی کا اچھا چرچا تھا۔ڈھاکہ میں فارسی کی ترویج واشاعت میں خواجہ خاندان نے نمایاں کردار ادا کیا۔اس خاندان میں خواجہ حیدر جان شائق۔خواجہ احسن اللہ

کوکب، خواجہ عبد الرحیم صاحبؔ صبا، خواجہ عبدالغفار اختر، نواب احسن اللہ شاہین، خواجہ محمد افضل، افضل نے فارسی شعروادب کی خدمات انجام دیں۔

ان کے علاوہ ڈھاکہ میں قابل ذکر نواب نصرت جنگ (۱۸۲۳۔۱۷۹۶ء) ہیں جنہوں نے تاریخ 'نصرت جنگی' لکھی جسے 'تاریخ جہانگیرنگر' بھی کہتے ہیں اس میں مغل بادشاہ اکبر (۱۶۰۵۔۱۵۵۶ع) سے لیکر نواب حشمت جنگ (۱۷۸۶۔۱۷۸۵ء) تک ڈھاکہ میں نوابی دور کی تاریخ ہے۔کتاب کے اصل نسخے میں سید الغنی عرف حمید میر نے بھی کچھ اضافہ کیا جس میں نواب نصرت جنگ کی زندگی اور ڈھاکہ کے آخری نواب غازی الدین حیدر کے حالات شامل ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۰۸ میں ہری ناتھ دے کے مقدمے کے ساتھ کلکتہ ایشیاٹک سوسائٹی سے چھپی۔

ڈھاکہ کے جو اہل قلم دنیائے ادب میں ایک خاص شہرت کے مالک ہیں ان میں آقا احمد علی اصفہانی ہیں۔۱۸۳۹/۱۲۰۰ ھ میں ڈھاکہ میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم کی حصول کے بعد ۱۸۶۲ میں کلکتہ چلے گئے۔اور یہاں ایک مدرسہ بنام 'مدرسہ احمدیہ' قائم کیا۔جس کے وہ آخر تک صدر رہے۔ ساتھ ہی وہ (۱۸۶۴ء) مدرسہ عالیہ کلکتہ کے فارسی معلم بھی تھے۔ اسی زمانے میں مرزا غالب سے ان کا قلمی معرکہ ہوا، مرزا غالب نے فارسی کی مشہور لغت 'برہان قاطع' پر بہت سے اعتراضات کئے تھے۔جو ایک رسالہ کی شکل میں 'قاطع برہان' کے نام سے شائع ہوئے۔مولوی احمد علی نے مرزا غالب کے اعتراضات کا جواب موید برہان:: میں دیا۔جس کا سن طباعت ۱۸۶۵ء ہے۔مولوی احمد علی کے اعتراضات ایسے تھے کہ غالب کو مجبورا جواب دینا پڑا اورانہوں نے ایک رسالہ 'تیغ تیز' کے نام سے اس کے

جواب میں شائع کیا اور اکتیس اشعار کا ایک قطعہ بھی آغا احمد علی کے نام لکھ بھیجا، جس میں ان کی کتاب پر بڑے پراثر انداز میں نکتہ چینی کی ہے۔ ۹۶

۱۸۶۸ء میں آقا محمد علی اصفہانی نے 'تیغ تیز' کا جواب 'تیغ تیز تر' سے دیا۔ اس سلسلے کی تمام کتابیں محققین کے لئے بے حد مفید ہیں۔ مرزا غالب اپنی جگہ ہیں؛ لیکن اس معرکہ سے آقا احمد علی اصفہانی کی علمیت، استعداد اور زبان دانی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ۹۷

ان کتابوں کے علاوہ آقا احمد علی نے فارسی مصادر اور ان کے مشتقات کے بارے میں ''اشتقاق'' و ''مختصر الاشتقاق'' فارسی رباعی کی تاریخ کے بیان میں ''ترانہ'' فارسی مثنوی کی تاریخ کے ذکر میں ''ہفت آسمان'' لکھا۔ جسکا ایک ہی باب ''آسمان اول'' نام سے ایشیاٹیک سوسائٹی سے چھپا۔

آقا احمد نے ''سکندر نامہ نظامی''، ''اقبال نامہ جہانگیری''، 'مآثر عالم گیری'، 'منتخب التواریخ بدآیونی' اور 'اکبر نامہ' کی تصحیح کی اور ایشیاٹیک سوسائٹی، کلکتہ سے دوبارہ انہیں شائع کرایا۔

نواب سید محمود آزاد نامور فارسی داں تھے۔ اپنی فارسی دانی کا اعتراف خود یوں کرتے ہیں:

آزاد نظم ریختہ کچھ میرا فن نہیں   واقف ہیں فارسی کے مرے شعر تر سے آپ ۹۸

حکیم حبیب الرحمٰن ان کے بارے میں " ثلاثہ غسالہ " میں فرماتے ہیں:۔

"" سخن ور یگانہ و فخر زمانہ فارسی پر اہل زبان رشک کرتے۔
اردو بہت کم کہتے تھے مگر جب کہتے تو مومن زندہ ہو جاتے۔ ۹۹

رحمان علی طیش کہتے ہیں آپ کے اشعار گھربار، متانت، وفصاحت و بلاغت سے مملو ہیں... آپ کے فارسی قصائد سمجھنے کے لئے معمولی استعداد کافی نہیں آپ کا دیوان ۱۲۲ صفحات پر مشتمل ہے جس میں ایک سے ۱۳ صفحات تک کے علاوہ باقی سب کلام فارسی میں ہے۔ ۱۰۰

مولوی عبدالکریم فارسی میں اچھا دخل رکھتے تھے۔ چونکہ اسلامی ذہنیت کے مالک تھے اس لئے ان کی شاعری میں بھی مذہبی مسائل اور اخلاقی درس ملتے ہیں۔ ان کی فارسی تصانیف میں " فواد الکلم" ''تنویر القلوب'' اور ''رموز الاخلاق'' شامل ہیں۔ اور غیر مطبوعہ میں 'دیوان خاکی'، 'فوائد خاکیہ' اور 'مصباح الجنان' شامل ہیں۔

مولانا عبید اللہ عبیدی کا شمار بھی ڈھاکہ کے فارسی گویاں میں ہوتا ہے۔ ۱۸۳۴ میں مدنی پور میں ان کی پیدائش ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کی حصول کے بعد عالیہ مدرسہ کلکتہ چلے آئے جہاں ۱۸۵۷ میں اپنی تعلیم تکمیل کی۔ عملی زندگی میں قدم رکھا اور کلکتہ میں ۱۸۶۲ سے لے کر ۱۸۶۵ تک میر منشی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس دوران کلکتہ سے شائع ہونے والے مشہور فارسی اخبار 'دوربین' کے مدیر اور بعد ازاں 'اردو گائڈ' کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۸۹۴ میں ڈھاکہ چلے آئے اور ڈھاکہ محسنیہ مدرسہ کے اول سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ اور گیارہ برس تک اپنے فرائض بخوبی انجام دیتے رہے۔

ان کی فارسی تصانیف میں ان کا فارسی دیوان ''دیوان عبیدی'' فارسی گرامر کے اصول و قوانین پر ''دستور پارسی آموز'' فارسی قصیدہ پر ''قصیدہ در تہنیت ملکہ معظّمہ''، فارسی آموزی کے لئے ''دستور الہجی'' و ''گلشن دانش'' راجا رام موہن رائے کی فارسی کتاب ''تحفۃ الموحدین'' کا انگریزی ترجمہ سید کرامت علی ہگلی کی فارسی کتاب 'مآخذ العلوم' کا انگیرزی ترجمہ اور غیر

مطبوعہ خودنوشت سوانح حیات بنام 'داستان عبرت بار' شامل ہیں۔

ان کے علاوہ ڈھاکہ میں حافظ اکرام احمد ضیغم، واحد علی مخمور، مسیح الدین شورش، مرزا شیرازی مخمور، سید محمد باقر طباطبائی، العجائب پریس کلکتہ سے شائع ہوئی۔ حمید اللہ کی دیگر فارسی کتابوں میں 'گلزار شہادت' اور تصدق حسین، شمس الدین محمد شمس، شاہ سید برہان الدین قادری، وارث علی ضیا، عدالت خان، محمد اشرف خان اشرف، اسد الزمان خان گوہر اور کاظم الدین صدیقی نے بھی ڈھاکہ میں فارسی شعر و ادب میں حصہ لیا۔

انیسویں صدی کے بنگلہ دیش میں چٹاگانگ میں بھی فارسی کا اچھا خاصا چرچا رہا ہے۔ ان میں خان بہادر حمید اللہ حمید کا نام سرفہرست ہے۔ ان کی مشہور کتاب 'احادیث الخوانین' ہے۔ یہ کتاب ۱۸۷۱ میں مظہر 'راہ نجات' شامل ہیں۔

ان کے علاوہ عبد العلی دری، وجہ اللہ سامی، عبد الحکیم، ابو الحکم، محمد اسماعیل عنبر اور مفتی فیض اللہ کے نام بھی پیش پیش ہیں۔

انیسویں صدی کے بنگلہ دیش میں فرید پور کے ضلع میں بھی فارسی زبان کا رواج تھا۔ فرید پور کا قاضی خاندان اس میں پیش پیش تھا۔ اس خاندان نے اپنی ادبی و سماجی کاناموں کی بدولت اس وقت برصغیر میں خوب نام پیدا کیا۔ ان میں قابل ذکر نواب عبد اللطیف (۱۸۹۳۔۱۸۲۸) ہیں۔ جہاں انہوں نے مذہبی اور سماجی اصلاح میں حصہ لیا وہاں اردو فارسی اور عربی زبانوں کی ترقی کے بہت خواہاں رہے ہیں۔

لیکن ادبی حلقوں میں نام پیدا کرنے والوں میں عبد الغفور نساخ ہیں۔ جن کی تصنیفات کی سولہ ہے جن ''قند فارسی'' شعرا فارسی تذکرہ ہے۔ ''مظہر معما'' پندرہ صفحوں کا ایک رسالہ ہے۔ جس میں کچھ ادبی معمے مع حل کے فارسی میں دیئے گئے ہیں۔ ''تذکرۃ المعاصرین''

فارسی گو شعراء کا تذکرہ ہے جو ''ع'' کی ردیف تک پہنچنے پایا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

نساخ کے والد قاضی فقیر محمد کی مشہور فارسی تصنیف ''جامع التواریخ'' کے علاوہ ''خلاصۃ النجوم'' ہے۔ نساخ اور عبد اللطیف کے علاوہ فقیر محمد کے دوسرے دو بیٹے مولوی عبد الحمید (وفات ۱۸۶۹) اور عبد الباری صیدؔ (وفات ۱۸۵۹) نساخ کے پھوپی زاد بھائی حفیظ الدین احمد شہید (وفات ۱۸۳۸) اور نساخ کے بیٹے ابو القاسم محمد اظہر الحق شمسؔ (وفات ۱۹۰۵) بھی فارسی اور اردو کے شاعر تھے۔

سلہٹ میں فارسی کی نشر و اشاعت میں وہاں آباد مجموعہ دار خاندان کا کردار نمایاں ہے۔ اس خاندان کے افراد کی زبان اردو و فارسی تھی اس خاندان کے ایک فرد بنام سرور خان، حسین شاہ شرقی (۱۵۰۰۔۱۴۵۷) کے زمانے میں جونپور رہتے تھے۔ جونپور میں اس وقت عوام کی زبان اردو اور سرکاری زبان فارسی تھی۔ بعد ازاں سرور خان کی فارسی دانی کی بدولت اس خاندان میں بہت سے اردو و فارسی جاننے والے پیدا ہوئے۔ جن میں حاجی الہ بخش مجموعہ دار، سعید بخت مجموعہ دار، حمید بخت مجموعہ دار اور اشرف علی مستؔ مجموعہ دار شامل ہیں۔ اس خاندان کے علاوہ سلہٹ میں عبد اللہ آشفتہؔ، عبد المنعم ذوقیؔ، محمد خلیل اللہ خلیلؔ، عبد القادر عبد الکریمؔ، تفضّل علی فضلیؔ، اسمعیل عالمؔ اور ابو نصر وحیدؔ وغیرہ نے بھی فارسی زبان و ادب کی خدمات انجام دیں۔

ان کے علاوہ بنگلہ دیش کے دوسرے علاقوں جیسے نواکھالی، کمیلا، میمن سنکھ، باریسال، پبنہ اور جسور جیسے علاقوں میں بھی فارسی کا چرچا پایا جاتا تھا۔

فارسی علم ادب کے فروغ کا ایک ذریعہ فارسی اخبار بھی تھے۔

انیسویں صدی سے پہلے پریس اور چھاپہ خانے ایجاد ہوئے تو برصغیرہ میں فارسی اخبار نکلنے

لگےاور جو بہت مقبول ہوئے کیونکہ عوام فارسی زبان ہی اچھا سمجھتی تھی۔لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کی پالیسی یہ تھی کہ فارسی کوختم کردیا جائے۔

غالباً اس لئے کہ یہ زبان گزشتہ حکمران طبقے کی زبان تھی۔ کمپنی کی خواہش تھی کہ اردو کو رواج دیا جائے یہی وجہ ہے کہ جب ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ءکو اخبار''جام جہاں نما'' کو اردو میں کیا گیا۔تو چند ہی پرچوں کے بعد محسوس ہوا کہ لوگ فارسی کے ساتھ زیادہ مانوس ہیں۔ جون ۱۸۲۲ء کے اواخر تک ''جام جہاں نما'' کی زبان فارسی ہو چکی تھی۔ ۱۵ اپریل ۱۸۲۲ء کو راجہ رام موہن رائے نے ایک اور فارسی اخبار ''مراۃ الاخبار'' کا اجرا کیا۔انہی دنوں کلکتہ سے منی رام ٹھاکر نے فارسی زبان میں تیسرہفت روزہ ''شمس الاخبار '' کے نام سے جاری کیا۔۱۸۳۱ میں''آئینۂ سکندر'' جاری ہوا جس کے مدیر مولوی سراج الدین احمد لکھنوی، مرزا غالب کے پرانے دوست تھے۔ ۲ آگست ۱۸۳۵ میں رجب علی حسینی نے ''سلطان الاخبار'' نکالا۔یکم جنوری ۱۸۴۱ میں کلکتہ سے''مہر منیر'' نکلا اس کے مالک و مدیر محمد علی تھے۔ ۱۸۵۴ میں کلکتہ سے''گلشن نوبہار'' جاری ہوا۔اس کے بعد مدیر کا نام عبدالقادر تھا۔[۱۰۱]

تیرہویں صدی سے لے کر اٹھارہویں صدی تک برصغیر میں فارسی کا پورا عروج تھا۔لیکن اٹھارہویں صدی کا خاتمہ ہوتے ہوتے تاریخ سے ایک کروٹ بدلی اور زندگی نئے حدود کی طرف بڑھنے لگی۔مغل سلطنت کی کمزوری کے باعث اس کے کھنڈر پر نئی طاقتیں نئے راج محل کھڑے کر رہی تھیں۔اس دور کے اندر ایک بدیسی طاقت بیوپار کی راہ سے دیس پر چھائی ہوئی تھی۔[۱۰۲]

انگیزی قوم جو سات سمندر پار سے آئی تھی اور جس کا تسلط اسی وقت ہندوستان پر اس طرح

بڑھتا چلا جاتا تھا جیسے ساون بہادوں کی گھٹا آسمان پر چھا جاتی ہے۔اس نے اردو کی دستگیری کی اور وہ اس لئے ہندوستان سے واقف ہوئے اور یہاں کی مہذب سوسائٹی میں ملنے جلنے کے لئے اس کا جاننا ضروری تھا۔دوسرے یہ زبان ریاست کی گود میں پلی تھی جہاں جہاں اس وقت مغلیہ حکومت کے آثار تھے۔اسی کا دور دورہ تھا۔علاوہ اس کے ہندوستان کی جدید زبانوں میں اردو سب سے زیادہ ہونہار نظر آئی۔اس لئے انہوں نے اس کی سرپرستی کی۔ سب سے بڑا احسان ڈاکٹر جان گلکرسٹ کا ہے جس نے انیسویں صدی کے شروع میں بمقام فورٹ ولیم کلکتہ اس کا ایک محکمہ قائم کیا۔جس کا ابتدائی اور اصل مقصد یہ تھا کہ جو انگریز یہاں ملازمت اختیار کرتے ہیں۔ان کی تعلیم کے لئے اردو کی مناسبت اور مفید کتابیں تالیف کرائی جائیں اور غالباً اسی شخص کا احسان ہے کہ بجائے فارسی کے اردو زبان دفتر کی زبان قرار پائی۔یہ عجب واقعہ ہے اور یاد رکھنے کی بات ہے کہ فارسی جو مسلمان فاتحوں کی چھیتی زبان تھی ایک ہندو راجہ ٹوڈرمل کی کوشش سے دفاتر میں داخل ہوئی اور دوسرے دور میں اردو نے ایک انگریز کی وساطت سے سرکار کا دربار میں رسائی پائی۔[۱۰۳]

اس وقت تک انگریز زیادہ تر فارسی پڑھتے تھے کیونکہ مسلمانوں کی بنگال فتح کے بعد سے وہی سرکاری زبان تھی۔لیکن حکومت انگریز نے ایکٹ نمبر ۲۹ مجطیہ ۱۸۳۷ءکو ایک قانون جاری کیا جس کی رو سے فارسی کو ہمیشہ کے لئے دیوانی اور فوجداری عدالتوں سے خارج کر دیا گیا۔ اور اس کی جگہ علاقائی زبان کو دے دی گئی وہ فرمان حسب ذیل تھا:۔

Act No. XXiX of 1837.

passed by the Hon' be the president of the Council of India in Council on the 20th November, 1937.

I.It is hereby enacted, that from the first day of December 1837, it shall be lawful for the Governor. General of India in Council, by an ordheer in Council, to dispense, either generally, or within such a local limits as may to him seem meet, with any provision of regulation of the Bengal Code which enjoins the use of the Persian Language in any Judicial proceeding, or in many proceeding relating to the revenue and to presubscribe the language and character to the used in such proceedings.

II. And it is hereby enacted, that from the said day it will be lawful for the said Governor General for India in council, by an order in council, to delegate all of any of the powers given to him by this act, to any subordinate Authority, under such restriction as may to the said Governor-General of India in Council seem meet. 104

اس قانون کے نافذ ہونے سے پہلے گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنک (۱۸۳۵ع۔۱۸۲۸) کی تعلیمی کونسل نے فارسی کی دل شکنی اور انگیزی تعلیم کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے مندرجہ ذیل فیصلے جاری کیئے:۔

(۱) گورنر جنرل ان کونسل کا خیال ہے کہ برٹس گورمنٹ کا سب سے اہم مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ مقامی لوگوں میں مغربی ادب سائنس کو ترقی دے اس لئے اس پوری رقم کو جو تعلیم کے لئے مخصوص ہے انگریزی تعلیم ہی پر خرچ کرنا افضل ہے۔

۲) گورنر جنرل ان کونسل کو معلوم ہوا ہے کہ کمپنی نے مشرقی علوم کی کتابیں کے چھاپنے پر بھاری رقم خرچ کی ہے تنبیہ کی جاتی ہے کہ آئیندہ کوئی رقم اس کام پر خرچ نہ کی جائے۔

۳) کمپنی کو مزید ہدایت کی جاتی ہے کہ اس قانون نافذ کرنے کی وجہ سے جو بچت ہوگی وہ سب کی سب مغربی علوم اور مغربی ادب و فلسفہ کی تعلیم پر جو انگریزی زبان کے ذریعہ ہوگی خرچ کی جائے گی۔ اور کمپنی سے گزارش ہے کہ ان تمام امور پر عمل کرنے کی ایک اسکیم بہت جلد گورنمنٹ میں پیش کرے۔ ۱۰۵

اس فیصلے نے ہندوؤں کے اس طبقے میں خوشی کی لہر دوڑادی جو انگریزی کے لئے کوشاں تھے۔ لیکن مسلمانوں میں عموما اس حکم سے بے چینی اور برہمی پیدا ہوئی۔ اور بڑا پرزور احتجاج پیدا کیا گیا۔

جب گورنر نے اس کا فیصلہ کر دیا کہ تمام وضائف بند کر دیئے جائیں اور تمام فنڈ کو انگریزی تعلیم کے لئے مخصوص کر دیا جائے تو مسلمانان کلکتہ نے ایک عرضی پیش کی جس پر آٹھ ہزار مسلمانوں کے دستخط تھے اور ان دستخط کرنے والوں میں شہر کے ہر طبقہ کے لوگوں کے علاوہ علماء اور اکثر معززین شہر بھی شریک تھے ان کا پہلا اعتراض تو اس اصول پر تھا کہ تمام سرکاری تعلیمی فنڈ صرف ایک زبان کے سیکھنے پر خرچ کیا جارہا ہے دوسرا سوال یہ تھا کہ اس تعلیم کے نفاذ سے بظاہر اس کے سوا اور کوئی مقصود نہیں معلوم ہتا کہ لوگوں کو عیسائیت کی ترغیب دی جائے گی۔ غرض وہ انگریزی کے ساتھ خصوصی برتاؤ کو مذہب عیسائیت کی تبلیغ کا ایک ذریعہ سمجھنے لگے۔ ۱۰۶

لیکن مسلمانوں کی مخالفت، ان کا احتجاج اور احتجاجی قرار دادوں کے باوجود حکومت نے ۱۸۳۷ء میں فارسی کو ہمیشہ کے لئے دیوانی اور فوجداری عدالتوں سے خارج کر دیا۔ چنانچہ ۱۸۳۹ء ایک عرضی مشرقی بنگال سے احتجاج کے طور پر بھیجی گئی جس پر ڈھاکہ کے چار سو اکاسی تعلیم یافتہ لوگوں کے دستخط تھے اور تعجب ہے کہ ان دستخط کرنے والوں میں ایک سو

ننانوے ہندو تھے یہ عرضی اس وقت کے جج مسٹر جے۔ ایف۔ کوک نے حکومت بنگال کے سکریٹری کو بھیج دی اور پھر یہ بتایا گیا کہ فارسی کی بجائے اگر علاقائی زبان کچہریوں میں رائج کی گئی تو کیا کیا دقتیں پیش آئیں گی۔ اور کیسے کیسے مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مگر اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ البتہ لارڈ بینٹنک کے اعلان کے خلاف مسلمانوں کے احتجاج سے اتنا فائدہ ہوا کہ اس کے قائم مقام گورنر نے ۲۴ نومبر ۱۸۳۹ء میں اس اعلان میں کچھ ترمیم کر دی کہ قدیمی درسگاہوں میں مشرقی علوم کی پوری حوصلہ افزائی کی جائے گی اور نہ تو وہاں کے پروفیسر الگ کئے جائیں گے اور نہ درسگاہوں کے طلبہ کا وظیفہ بند کیا جائے گا۔

اس طرح مندرجہ بالا قوانین کے پاس ہونے کے بعد فارسی آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں سے محو ہوتی گئی۔ فارسی کو لوگ بھولتے چلے گئے اور علاقائی زبانوں کو پنپنے اور فروغ پانے کا موقع مل گیا اب یہ حال ہے کہ اکا دکا کے علاوہ کوئی بھی فارسی دان نہیں۔

حوالہ جات

1. Narendra Nath Law. Promotion of Learning during Muhammadan Rule (London: Longmans, Green and Co, 1916) P. 110

۲۔ انعام الحق، مسلم بنگالی ادب (کراچی، ادارۂ مطبوعات پاکستان ۱۹۵۷) ص۔۵۶

۵۔ حسین برنی، سید تمہید مثنوی قرآن السعدین از خسرو (علیگڑھ مطبع انسٹی ٹیوٹ (۱۹۱۸ء) ص۔۴۔۵

۶۔ عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی مترجم محمود احمد فاروقی، منتخب التواریخ (لاہور شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۶۲ء) ص ۷۷

۷۔ انصار ابوالفیض سحر (مرتبین) خسرو شناسی (دہلی نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، ۱۹۷۵ء) ص ۱۶

۸۔ عبدالکریم، بنگلا راجتیہاش سلطانی عمل (ڈھاکہ، بنگلہ اکیڈمی ۱۹۷۷ء) ۵۱۸

9. Abdul Karim, Social History of the Muslims in Bengal. (Chittagong: Baitush Sharaf, Islamic Research Institute, 1985) Pp . 100-102

۱۰۔ حکیم حبیب الرحمٰن۔ آسودگان ڈھاکہ (ڈھاکہ امدادیہ لائبریری ۱۹۶۰ء) ص۔۲

۱۱۔ اکرام احمد شیخ، آب کوثر (لاہور فیروز سنز لمیٹڈ ۱۹۶۶ء) ص۔ ۳۱۰

۱۲۔ ظہور الدین احمد، پاکستان میں فارسی ادب (لاہور ، یونیورسٹی بک ایجنسی ۱۹۶۴ء) ص۔ ۶۱۹

۱۳۔ آب کوثر، ص ۳۱۶

۱۴۔ پاکستان میں فارسی ادب، ص۔۶۲۰

۱۵۔ کلیم شہسرامی داکٹر، بنگال کی ایک قدیم فارسی فرہنگ، شرفنامہ۔ دانش (اسلام آباد

تابستان ۱۳۲۷ء) ص۔۲۱۲۔۲۱۳

16- Muhammad Ishaq, Dr. Indian's Contribution to the study of Hadith Literature. (The University of Dhaka, 1976) Pp. 115-116.

17- Momtazur Rahman Tarafder, Hussain Shahi Bengal-(Dacca: Asiatic Society, 1965) Pp. 264-265

18- Ibid. P. 266

۱۹۔ مسلم بنگالی ادب۔ص ۱۵۲

20-Abdur Raim, Social and Cultural History of Bengal. (Karachi: Pakistan Publishing House, 1967) P. 220

۲۱۔ بنگلا راتیہاش، سلطانی عمل، ص، ۵۲۲

۲۲۔ظہور الدین احمد، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند (چوتھی جلد) پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۱، ص ۳۶۲

۲۳۔ ایضاً، ص ۳۶۵

24- Borah, M.I. Dr. (tr) Baharistan-i Ghayabi. (Assam: Department of Historical and Antiquarian studies,1938) P. 686

۲۵۔ظہور الدین احمد، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند (چوتھی جلد) ص۔۷۰

۲۶۔ ایضاً۔ ص ۸۵

۲۷۔ ایضاً۔ ۹۶

۲۸۔ایضاً۔۲۰۶

۲۹۔ایضاً۔۲۰۸

۳۰۔ایضاً۔۲۵۳

۳۱۔ایضاً۔۵۴۵

32. Social and Cultural History of Bengal. P. 282

33. Taifoor Muhammad, Syed. Glimpses of old Dacca (Dacca Eskaton Garden, 1952) P. 53

34. Social and Cultural History of Bengal. P. 283

35. Cultural Heritage. P. 114

36. Jadu Nath Sarkar History of Bengal. Vol. ii (Dhaka University, 1976) P. 335

۳۷۔علی حسن خان سید ۷ صبح گلشن (بھوپال ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء) ص۔۲۲۲

38. Story C.A. Persian Literature (London luzac and Company. 1939) P. 582

39. Abeda Hafiz Dr. Tarikh-I Shah Shujaee (Unpublished Ph.D. Thesis, Dhaka University , 1968) P. 1

۴۰۔صدیق حسن نواب، شمع انجمن (بھوپال، مطبع شاہ جہاں ۱۸۷۵ء) ص ۳۲

۴۱۔ مسلم بنگالی ادب۔ص ۲۰۷

۴۲۔ حمید اللہ خان، احادیث الخوانین (کلکتہ، مظہر العجائب پریس ۱۸۷۱ء) ص۔ ۵۵

۴۳۔صبح گلشن، ص ۲۲۲

۴۴۔ غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین کراچی، نفیس اردو اکادیمی) ص۔۲۷۰

45. Cultural Heritage, P. 115

46. Social and Cultural History of Bengal.

۴۷۔ غلام حسین طباطبائی،، ص ۲۸۳

۴۸۔ شمع انجمن، ص۔۳۸۔۳۹

49. Glimpses of Old Dacca, P. 185

۵۰۔ شمع انجمن، ص ۴۴۵

51. Cultural Heritage, P. 115

51- Jadu Nath Sarkar, Bengal's Nawabs (Cacutta: Asiatic 52. Society, 1952) P.

۵۳۔ سیارالمتاخرین (جلددوم)ص۱۸۱

۵۴۔ ایضاً ص۱۷۸

۵۵۔ ایضاً۔ص ۱۸۴

۵۶۔ یوسف علی خان کی تاریخ بنگالہ مہابت جنگی کی ۔ ایڈیٹ اور انگیریزی ترجمہ عبد السبحان، ڈاکٹر (کلکتہ ایشیاٹیک سوسائٹی۱۹۸۲) نے کیا

۵۷۔ یونس احمر (مقدمہ) زوال سلطنت مغلیہ۔ص۔۴

۵۸۔ صفدر حیات صفدر، وفات عالم گیر سے وفات ظفر تک (لاہور، نیو بک پبلیس، اردو بازار ۱۹۶۰ء)ص۔۲۲

۵۹۔ سیرالمتاخرین (جلددوم)ص ۱۱

۶۰۔ ایضاً، ص۔ ۶۹

61- Hussain, S. Syed. (ed), A Descriptive Cagalogue of Bengali Manuscripts. P. 84

۶۲۔ وفاراشدی، بنگال میں اردو (مکتبہ اشاعت اردو۔حیدرآباد (سندھ) ۱۹۵۵ء ص۳

۶۳۔ اکرام محمد سید، رورکوثر (لاہور فیروز سنز لمیٹڈ ۱۹۶۷ء) ص۔۶۲۶

64- Imamuddin, S.M. (ed) Tarikh-i Banglah(Dacca: The Asiatic Society of Bangladesh, 1979) Introduction, P. VIII

۶۵۔ اکرام محمد سید، حیات غالب (لاہور، فیروز سنز، سن اشاعت درج نہیں) ص۔۸۰

۶۶۔ایضاً، ص۔ ۹۰

۶۷۔ ایضاً، ص۔۹۶

۶۸۔ ایضاً، ص۔ ۸۲

۶۹۔ ایضاً، ص۸۴

70- Tarikh-i- Banglah. P. VIII

۷۱۔ رودکوثر۔ ص ۔۶۳۰

۷۲۔ تاریخ ادب اردو،ص ۲۶۴

۷۳۔ تذکرۃ المعاصرین (غیر مطبوعہ) ص۔۵

۷۴۔ ام سلمی، 'مرزا جان طپش کی ادبی و سیاسی سرگرمیاں'، ماہ ماہ نو، لاہور، مئی ۱۹۸۸۔ ص۔۲۴

۷۵۔ ایضاً ص ۲۵

۷۶۔ام سلمیٰ، 'آثار و افکار مولوی عبدالرحیم گورکھپوری'، دانش تابستان، اسلام آباد، ۱۳۶۸، ص۔۱۴۵۔۱۴۸

۷۷۔عبدالغفور نساخ، سخن شعراء، ص ۵۴۳

۷۸۔ رودکوثر ص ۶۳۱

۷۹۔ ایضاً

۸۰۔ بنگال میں اردو،ص ۵۹

۸۱۔ ایضاً،ص۶۱

۸۲۔ سخن شعراء ص۔۵۴۸

۸۳۔ عبدالستار، تاریخ مدرسہ عالیہ حصہ دوم (ڈھاکہ، مدرسہ عالیہ، ۱۹۵۹) ص ۱۹۸

۸۴۔ مولوی عبدالرؤف وحید، مقدمہ دیوان وحید (کلکتہ، نیم تلا گھاٹ، ۱۸۹۱) ص ۱۴

85. Persian Literature, P. 648

86. Abdus Sobhan, Dr. Calcutta's Contribution to Persian Studies, P. 50

87. Ibid. P. 50

۸۸۔ سخن شعراء، ص۔۴۵۷

۸۹۔ رود کوثر، ص۔۶۳۱

90. Cultural Heritage, P. 116

۹۱۔ بنگلہ بشوکوش جلد نمبر ۲ (ڈھاکہ، نوروز کتابستان ۱۹۵۹) ص۔۳۳۳

92. Cultural Heritage, P. 116

۹۳۔ بنگلہ بشوکوش، ص۔۱۵۹

94. Cultural Heritage, P. 116

۹۵۔ ایضاً، ص۔۱۱۶

۹۶۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ، بنگال میں اردو (لکھنؤ، نصرت پبلشرز، ۱۹۷۶ء) ص۔۶۶

۹۷۔ اقبال عظیم، مشرقی بنگال میں اردو (ڈھاکہ، مشرق کواپریٹو پبلکیشنز) ص۴۳

۹۸۔ مشرقی بنگال میں اردو، ص۴۷

۹۹۔ حکیم حبیب الرحمٰن، ثلاثہ غسالہ (غیر مطبوعہ) ص، ۵۵

۱۰۰۔ رحمٰن علی طیش، تواریخ ڈھاکہ (آرہ، سٹار آف انڈیا پریس، ۱۹۱۰) ص۳۲۶

۱۰۱۔ عبدالسلام خورشید ڈاکٹر، صحافت پاکستان و ہند میں (لاہور، مجلس ترقی اردو، ۱۹۶۳) ص۔۳۸

۱۰۲۔ احتشام حسین، سید، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ (نئی دہلی، ترقی اردو ۱۹۸۳) ص۱۳۸

۱۰۳۔ مولوی عبدالحق، مقدمہ گلشن ہند (لاہور۔ دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۵۶) ص۔۴

104- Government of Bengal,Report of the Madrasah Education Commitee (Alipore: Bengal Government Press, 1941) P. 149

۱۰۵۔ تاریخ مدرسۃ عالیہ، ص۱۰۲

۱۰۶۔ ایضاً۔ ص۔ ۱۰۳

باب سوم

بنگال میں اردو ادب کی تاریخ

برصغیر جنوبی ایشیا کی زبانوں میں اردو وہ واحد زبان ہے جس کا پھیلاؤ تقریباً پورے برصغیر میں ہے۔اگرچہ برعظیم پاک وہند کے ہر خطے میں قدیم الایام سے ایک مخصوص زبان مروج رہی ہے مثلاً پنجاب میں پنجابی، بنگال میں بنگلہ، سندھ میں سندھی وغیرہ لیکن ان زبانوں کا دائرہ عمل اپنے جغرافیائی حدود سے آگے کبھی نہیں بڑھا۔اس کے برعکس اردو ایک فاتح عالم کی طرح پورے ملک پر چھا گئی۔ نہ صرف اس قدر کہ اندرون ملک میں کشمیر سے لنکا تک اور پشاور سے سلہٹ تک اس کا ڈنکا بجنے لگا بلکہ دنیا کے دوسرے مما لک میں بھی بولی اور سمجھی جانے لگی۔۱

اس زبان کی مقبولیت کی بین دلیل یہ ہے کہ اس خطہ ارض کے کئی علاقے ایسے ہیں کہ جن کا یہ ادعا ہے کہ اردو کا آغاز وہاں ہوا۔لیکن تحقیق وتدقیق کے باوجود آج تک یہ قطعی فیصلہ نہ ہوسکا کہ یہ فخر کلی طور پر کس علاقے کو حاصل ہے اس کے باوجود یہ بات بغیر کسی تردید کے کہی جا سکتی ہے کہ یہ زبان صدیوں سے برصغیر کے عوام کے اظہار خیال کا ذریعہ رہی ہے۔ چنانچہ جب فارسی سرکاری اور دفتری زبان تھی اس وقت بھی عام بول چال کی زبان اردو ہی تھی اور برصغیر کے تمام حصوں میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اٹھارہویں صدی کے آخر ربع میں جن جان گل کرسٹ نے سورت سے مشرقی ہند تک سفر کیا تو اس کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ:

’’جس گاؤں اور جس شہر میں میرا گزر ہوا وہاں اس زبان کی مقبولیت کی جسے میں سیکھ رہا تھا مجھے ان گنت شہادتیں ملیں جنہوں نے مجوزہ کتاب کی تکمیل کے شوق کو تیز تر کر دیا۔‘‘۲

اردو کی مقبولیت اور اس کے پھیلاؤ کا ذکر کرتے ہوئے ناطق لکھنوی کہتے ہیں:

’’اردو کو ایک سرچشمہ تصور فرمائیے جو شمالی ہند کے پہاڑوں سے جاری ہوا۔دہلی میں آ کر دریا بنا،اس دریا سے بیسیوں شاخیں نکلیں ایک بنگال کو گئی،ایک بہار کو،ایک اودھ کو اور ایک گجرات کو، یہاں یہ شاخ تمام دکن میں پھیل کر ایک سمندر بن گئی۔اودھ میں جو شاخ پہنچی اس کے پانی تمام ہندوستان خصوصاً آگرہ اور دہلی کے ادیبوں اور شاعروں نے جمع ہو کر لکھنو میں صاف کیا اور صاف کر کے تمام ملک میں نہریں دوڑائیں۔‘‘۳

مندرجہ بالا بیان کی روشنی سے صاف پتہ چلتا ہے کہ بنگال بھی اردو کی آماجگاہ رہا ہے۔ آٹھویں صدی ہجری میں بہار میں شرف الدین یحیٰ منیری کا اردو کلام ملتا ہے۔ بنگال کا سلطان حسین شاہ جو بڑا علم دوست، سرپرست اور قدرداں زبان وادب تھا۔اس کے زمانے میں اردو اور بنگلہ دووں ادب نے بہت فروغ پایا۔حسین شاہ کے زمانے میں قلنس جو اس کا درباری شاعر تھا ایک باکمال صاحب علم وفضل شخص تھا۔حسین شاہ کی مدح کہتا ہے۔

شاہ حسین آہے بڑا راجہ　　چزسنگھاسن ان کو چھاجا

بہاء الدین باجن (متوفی ۹۱۲ھ) اس کا ہم عمر شاعر تھا۔

باجن جو کسی عیب ڈھانکے　　اس سے ارجن تھر تھر کانپے

اس قسم کی اردو دسویں صدی ہجری کے مثلاً شیخ عبدالقادر گنگوہی اور بہاء الدین برماوی کے کلام میں بھی عام ہے۔ شیخ جیون، محبوب عالم اور مولانا عبدی گیارہویں صدی کے مشہور شعراء گذرے ہیں۔

بنگال میں شیخ نور الحق پنڈوی (متوفی ۸۱۳ھ) کے اردو جملے اور اقوال برابر ملتے ہیں۔ حضرت مخدوم اشرف جہانگیر کی اردو سے بنگال، بہار اور اودھ کو شرف حاصل ہوا اور شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری بنگال میں بھی رہے۔[۴]

اس دور کے بنگالی ادب میں بھی ایسے الفاظ ملتے ہیں جس میں عربی، فارسی اور ہندی کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اس کی مثال مسلمانوں کے ابتدائی دور کی ایک کتاب ''شینہ پران'' کے ایک عنوان ''نرنجن رشمہ'' میں موجود ہے جس میں شاعر نے حسب ذیل الفاظ استعمال کئے ہیں۔

کالوٹوپی، کمان، خدا، نام، اوتار، ازار، آدمنا (آدم)، محمد، پیغمبر، نمازی، قاضی، شیخ، مولانا، حیابی بی، بی بی نو، ایک من، پکڑو وغیرہ۔[۵]

بنگال میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سے اس ڈھانچے کے نمونے مقامی بولیوں میں بھی ملتے ہیں۔ جس میں عربی، فارسی اور ہندی الفاظ کی آمیزش سے ایک نئی زبان کا کنیڈا تیار ہو رہا تھا۔ لیکن قدیم اردو کے واضح نمونے یعنی کوئی ادب پارے نہیں ملتے اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ بنگال میں مختلف قبائل آتے رہے۔ بغاوتیں ہوتی رہیں اور امن وسکون کا دور کمتر ہوتا رہا۔ پھر جو صوبے دار نیا آتا تھا وہ اپنے ساتھ نئے عملے بھی لاتا تھا اور اس طرح نئے خون کی آمد سے اردو کی ترقی کی وہ رفتار جو شروع میں عمل آئی تھی کچھ رک سی گئی۔ شمالی ہندوستان میں بھی اردو

کی ترقی دھیمی ہی رہی اور اس کا اثر بنگال پر پڑا۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ بنگال میں ریختہ تیار ہی نہیں ہوا یا تیار ہونے لگا تو پھر ایک دم سے خلا پیدا ہو گیا۔ ریختہ برصغیر ہند و پاکستان کے ہر صوبے میں تیار ہو رہا تھا کہیں پہلے اور کہیں بعد میں۔:٦

اس خیال کو ڈاکٹر اختر اورنیوی نے یوں ادا کیا ہے:

> ابتدائی اردو یا اردوئے قدیم کا تصور میرے ذہن میں یوں ہے کہ کم وبیش ملک کے ہر خطے میں وہاں کی مقامی بھاشا کے ساتھ عربی و فارسی الفاظ ملتے رہے اور اس آمیزش سے ریختہ کی ابتدائی نمائش پیدا ہوئیں۔ دور آمیزش بھی ایک وسیع دور تھا''۔

اس کے بعد دور ترکیب شروع ہوا یعنی ریختائیں اب آمیزہ نہیں، مرکب تھیں۔ اس عہد میں بھاشاؤں اور عربی و فارسی کے امتزاج میں اب گول مرچ نمک کے میل کی صورت نہیں تھی بلکہ شیر وشکر کے بالکل گھل مل جانے کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

ملکی اور غیر ملکی ازدواج کی کامیاب منزل طے کر کے ایک خاندان کے اراکین بن گئے تھے۔ اور اب ایک متحدہ کنبہ کی تخلیق ہونے لگی تھی۔ صورت حال یہ تھی کہ سندھی، ملتانی، پنجابی، ہندوتانی (کھڑی بولی) برج راجستھانی، گجراتی، مراٹھی، ہریانی، اودھی، بھوجپوری مگھی، میتھلی بنگالی ریختائیں وجود میں آچکی تھیں...... سندھ، پنجاب، اور گجرات میں ریختہ کا سیال مرکب پہلے تیار ہونا شروع ہو گیا۔ ادھر بہار اور بنگال میں کچھ عرصہ کے بعد...... ہاں مختلف وجہوں سے بعض علاقوں میں یہ عمل امتزاج ادھورا رہ گیا۔ اور بعض میں ریختہ کی حالت تو پیدا ہو گئی مگر معیاری اردو کا رواج دیر میں ہوا۔ یا خال خال ہوا۔

چنانچہ بنگال میں بھی اردو کا ابتدائی ڈھانچہ تیار ہو رہا تھا مگر وہاں کے سیاسی حالات، امن و امان کی ابتر حالت پٹھانوں اور مغلوں کی جھڑپوں اور لڑائیوں نے اردو کی رفتار میں قدر سے رکاوٹ پیدا کر دی۔ [۷]

بنگال میں مقامی لوگ کب سے اردو میں شعر و شاعری کرنے لگے اس پر تحقیق کے لئے بنگلہ زبان کے پوتھی ادب کا مطالعہ کرنا نہایت ضروری ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بنگلہ زبان کے پوتھی ادب کا مطالعہ بنگال میں اردو شاعری کے ابتدائی نقوش اور دور اول کے متعلق صحیح واقفیت حاصل کرنے کے لئے بے حد ضروری ہے۔ اگر تحقیق وتلاش کے بعد بنگلہ خط میں محفوظ اردو شاعری کو موجودہ اردو رسم خط میں منتقل کیا جائے تو کئی قدیم شعرائے اردو کا کلام سامنے آئے گا۔ اور بنگال میں اردو اور بنگال کی قدیم سماجی اور سیاسی حالات وغیرہ پر کئی اہم باتیں سامنے آئیں گی۔ [۸]

پھر حال اردو بنگال کے عوام کی مقبول زبان تھی۔ جنوری ۱۸۳۵ء میں ولیم بینٹنک نے مسٹر ایڈم سمتھ کو صوبہ بنگال کے لئے ایک تعلیمی رپورٹ پیش کرنے کے لئے حکم دیا تھا۔ مسٹر ایڈم نے بنگلہ کے مختلف اضلاع کا دورہ کرنے کے بعد یہاں کے تعلیمی حالات کے سلسلے میں جو رپورٹ دی تھی اسے ''ایڈم رپورٹ'' کہا جاتا ہے۔ وہ بنگال میں اردو کی حالات پر ایک قیمتی دستاویز ہے۔ اس رپورٹ میں دیگر باتوں کے علاوہ مسٹر ایڈم نے لکھا:۔

> بنگالہ کے اضلاع میں زیادہ تر بنگلہ زبان رائج ہے۔ لیکن مجھے خاص مرشد آباد میں اردو استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئی اردو بنگال اور بہار کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی زبان ہے ساتھ ہی یہ بازاری

> زبان بھی ہے لیکن اردو کا استعمال کسی بھی تعلیم گاہ میں نہیں کیا جاتا۔ بنگال کے ہندو بنگالی کتاب پڑھتے ہیں اور بہار کے ہندوؤں کے اسکولوں میں ہندی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ حالانکہ اردو عام فہم زبان ہے اور مندرجہ بالا دونوں زبانوں سے ترقی یافتہ ہے اس زبان میں خیالات کی ترجمانی بہتر طور پر کی جا سکتی ہے اور اس کا ادب نسبتاً ترقی یافتہ ہے لیکن تعجب ہے کسی اسکول میں اردو کی کوئی کتاب ہی نہیں۔ یہ زبان محض روزانہ استعمال کی بازاری زبان ہے اور کاروباری لوگ اسے بولتے ہیں۔ مدرسوں میں فارسی اور عربی کے سبق اسی زبان کی مدد سے اساتذہ طلباء کو سمجھاتے ہیں لیکن اردو کے لئے صرف اردو کی خاطر کوئی اردو نہیں پڑھتا نہ اردو زبان مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے یہ زبان فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور جو لوگ فارسی جانتے ہیں ضرورت کے تحت اس زبان کو فارسی رسم الخط میں لکھ لیتے ہیں اسی لئے فارسی رسم الخط ہی کو اردو نے اپنا لیا ہے لوگ گیت اور کہانیاں اس زبان میں لکھی جاتی ہیں اور اس کا استعمال عورتوں کو خط لکھتے وقت بھی کیا جاتا ہے۔ [۹]

اس'' ایڈم رپورٹ'' سے واضح ہوتا ہے کہ اردو زبان اس وقت عوام میں کافی مقبول تھی اگر چہ تعلیم یافتہ فارسی زبان کو ہی قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اور چونکہ اردو کو اونچے طبقے کی پشت پناہی حاصل نہ تھی لہذا اس کی حفاظت کون کرتا؟ زمانے کے ہاتھوں بہت سی تخلیقات مٹ گئی ہیں۔ بنگال میں اردو کی اصل ترقی فورٹ ولیم کالج سے ہوئی جس کی بنیاد ۱۸۰۰ء میں

کلکتہ میں ڈالی گئی۔اس طرح بنگال میں اردو ادب کی ترقی میں کلکتہ نے نمایاں کردار ادا کیا۔ ذیل میں کلکتہ شہر کے اس کردار کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے جو اس نے اردو کی نشو نما کے سلسلے میں ادا کیا۔

کلکتہ میں اردو ادب: انیسوی صدی تک

ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک فرد ''جب چارنک'' (Job Charnock) نے غالباً ۲۴ اپریل ۱۹۹۰ء میں کلکتہ میں قدم رکھا اور شہنشاہ عالم گیر کے پوتے عثمان سے ۱۶۹۸ میں کلکتہ کی زمین داری خریدی۔ 10 ۱۷۱۷ء میں انگریزوں نے شہنشاہ فرخ سیر کی اجازت سے کلکتہ کے گرد و نواح میں مزید اٹھتیس گاون خرید لئے اور رفتہ رفتہ وسیع تر ہوتا گیا۔اور اس کی آبادی بھی بڑھتی گئی۔ 11

بعد ازاں انگریزوں میں یہاں ایک تجارتی کوٹھی قائم کی تھی۔اس دن سے کلکتہ عالم وجود میں آیا اور آباد ہوتا گیا۔انگریز جو تاجر بن کر ہندوستان کی سرزمیں آئے تھے سیاست وقت میں حصہ لینے لگے اور اپنی حکمت عملی سے اور یہاں کے حکمرانوں میں آپسی پھوٹ، دشمنی، عداوت، اختلافات و آپسی جنگ سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے رفتہ رفتہ اپنی طاقت کو بڑھاتے گئے۔اٹھارہوں صدی کے ختم ہوتے ہوتے یہ ہندوستان کا جدید ترین شہر اور عظیم تجارتی مرکز بن گیا۔دہلی کی مرکزیت ختم ہونے کے بعد ۱۹۱۲ء تک شہر کلکتہ، ہندوستان کا پایہ تخت رہا۔پھر ایک بار دہلی کو یہ شرف حاصل ہوا لیکن اس سے کلکتے کی ترقی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔کیونکہ یہ شمالی ہند کی سب سے اہم تجارتی منڈی بن چکا تھا۔۱۲

اٹھارہویں صدی سے کلکتے کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہندوستان اور ساتھ ہی دنیا کے کونے کونے سے لوگ اس ابھرتے ہوئے شہر میں اپنی قسمت آزمانے اور روزی روزگار کے لئے آنے لگے۔ مدرسہ عالیہ (۱۷۸۱-۱۷۸۰ء) اور ایشیاٹک سوسائٹی (۱۷۸۳ء) قائم ہوئے۔کلکتہ یونیورسٹی قائم ہوئی۔سب سے اہم ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کا قیام تھا۔ ۴ مئی ۱۸۰۰ ای ء (۷ ذی الحجہ ۱۲۱۴ھ) کو لارڈ ویلزلی (۱۸۲۵-۱۷۹۸ء) گورنر جنرل ایسٹ انڈیا کمپنی نے کلکتہ میں فوتٹ ولیم کالج کا افتتاح کیا۔اس سے پہلے کمپنی کے انگریز ملازموں کے لئے اردو تعلیم کا کوئی باقاعدہ بندوبست نہ تھا۔وارن ہیسٹنگز (۱۷۷۲-۱۷۷۴) گورنر جنرل نے دیسی کالج کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔جس میں انگریز ملازم اور ہندوستانی طلباء فارسی پڑھتے تھے۔لیکن یہاں اردو اور دیگر کوئی ملکی زبان نہ پڑھائی جاتی تھی۔لیکن مغلیہ سلطنت اور فارسی زبان کا تنزل اور اردو زبان کی ترقی اس سرعت کے ساتھ جاری تھی کہ لارڈ ویلزلی نے انگریزوں کے لئے اردو کی ضرورت کو محسوس کر لیا اور اس کی باضابطہ تعلیم کا انتظام کر دیا اس ضروت کے ساتھ گورنر جنرل کو اس بات کا بھی احساس تھا جو انگریز کمپنی میں ملازم ہو کر آتے ہیں وہ ولایت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے نہیں آتے اور کارروائی کے لئے علوم و فنون کی مہارت ضرورت ہے۔اسلئے اس نے یہ چاہا کہ فورٹ ولیم کالج علوم و فنون کی اول درسگاہ ہو۔۱۳

اس وقت ملک میں اردو کی ایک کتاب بھی نثر میں ایسی نہ تھی جس کو فورٹ ولیم کالج کے نصاب میں شامل کیا جاتا۔فضلی کی ''دہ مجلس'' میر محمد عطا حسین خان تحسین کی ''نوطرز مرصع'' کتابیں ایسی نہیں تھیں جن کو اردو نثر کا نمونہ کہا جا سکے یا ان کے مئولفوں کو موجد زبان اردو قرار

دیا جاسکے۔ کیونکہ وہ سب کتابیں زیادہ تر فارسی سے ترجمہ کی گئی تھیں اور مذہبی رنگ اور قصے کہانیوں کے طرز پر لکھی گئی تھیں نہ ان کی عبارت درست اور عام فہم ہوتی تھی نہ صرف ونحو کا خیال رکھا جاتا تھا۔فورٹ ولیم کالج کا کمال یہ ہے کہ اس کے مصنفوں اور ادیبوں نے پرانی روش سے ہٹ کرنئی روش اختیار کی ادب اردو میں ایک نیا راستہ نکالا۔عربی، فارسی، سنسکرت کے غیر مانوس، ثقیل اور بے ترتیب الفاظ کی بجائے آسان، سلیس، سادہ، بے تکلف اور بامحاورہ الفاظ استعمال کئے۔جدید نثر نگاری کی ابتدا فورٹ ولیم کالج سے ہوئی ہے اور یہاں کی مطبوعات نثر اردو کا بہترین نمونہ تسلیم کی جاتی ہیں۔[14]

ڈاکٹر جان گل کرائسٹ (۱۸۴۷-۱۷۵۹ء) فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے پہلے پرنسپل اور منتظم تھے۔ان ہی کی ان تھک کوششوں سے ملک کی دیسی زبان یعنی اردو مکمل ہو کر سرکاری زبان بننے کے لائق ہوئی۔اوراس میں اتنی صلاحیت پیدا ہوگئی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں فارسی کی جگہ وہ سرکاری زبان قرار پائی۔ یہ کہنا بے جا نہیں کہ نظم اردو پر جو احسان ولی نے کیا، وہی اردو نثر پر جان گل کرائسٹ نے کیا ہے۔کیونکہ انہوں نے نہ صرف زبان اردو کی قواعد اور لغت کی تحریر کی بلکہ اورلوگوں سے مختلف کتابیں لکھوائیں۔ اس محسن اردو کو مصنفین اردو میں شمار کیا جاتا ہے۔[15] گل کرائسٹ کی بعض مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

۱) انگیری ہندوستانی ڈکشنری (۲حصوں میں) مطبوعہ ۱۷۹۳ء

۲) اورینٹل لنگوسٹ (مشرقی زبان دان) مطبوعہ ۱۷۹۸ء

۳) ہندوستانی گرامر مطبوعہ ۱۷۹۶ء

۴) ہندوستانی فلالوجی۔[16]

سلطنت مغلیہ کی تباہی کے بعد بعض مشہور اہل زبان واہل قلم اپنا وطن چھوڑ کر ڈاکٹر گلکرائسٹ کی شہرت اور فیاضی کا شہرہ سن کر کلکتہ پہنچے۔انہوں نے ان سب کو نیز اکثر کلکتہ کے لوگوں کو اپنے کالج میں خوشی سے جگہ دی۔ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کے ساتھ بعض اور مشہور افسروں مثلاً کپتان رویک۔ کپتان ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر وغیرہ کی خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔[17] ڈاکٹر گلکرائسٹ کے زمانے میں جو مشہور ہندوستانی اہل قلم کالج میں جمع ہو گئے وہ اور ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

فورٹ ولیم کالج میں سب سے پہلے قابل ذکر شخص میر امن دہلوی ہیں۔جن کی شہرہ آفاق کتاب ''باغ وبہار'' ہے۔''گنج خوبی''ان کی دیگر ایک کتاب کا نام ہے۔

سید حیدر بخش حیدری نے ''طوطا کہانی''۔ ''آرائش محفل''، ''ہفت پیکر''، ''گل مغفرت''، ''تاریخ نادری''، ''گلزار دانش''، ''گلدستہ حیدری'' اور ''گلشن ہند'' لکھیں میر شیر علی افسوس نے ''باغ اردو'' اور ''آرائش محفل'' لکھیں۔

میر بہادر علی حسینی کی تصنیفات میں'' نثر بےنظیر''، ''اخلاق ہندی''، ''تاریخ آسام'' اور ''رسالہ گل کرائسٹ'' داخل ہیں

مرزا علی لطف نے ''تذکرہ گلشن ہند'' لکھی۔اس کے علاوہ شاعری میں مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی۔

مولوی امانت کی تحریرات میں ہدایت الاسلام، ترجمہ قرآن شریف اور جامع الخلاق شامل ہیں۔

مظہر علی خان ولائے مادھونل وکام کندلا، ترجمہ کریما، ہفت گلشن، اتالیق ہندی، بیتال پچیسی،

عباس خان کی فارسی تاریخ شیر شاہی کا اردو ترجمہ بنام تاریخ شیر شاہی اور توزک جہانگیری کے ایک حصے کا ترجمہ بنگام جہانگیر نامہ کیا۔

مرزا جان طپش کی تالیفات میں مثنوی ''بہار دانش''، ''کلیات طپش'' اور شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان شامل ہیں۔

نہال چند لاہوری نے مثنوی گل بکاولی کو اردو نثر میں لکھا اور اس کا نام مذہب عشق رکھا۔

میر کاظم علی جوان نے شکنتلا ناٹک، بارہ ماسہ، تاریخ فرشتہ کے ایک حصہ کا ترجمہ کیا اور اس کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کی بہت سی کتابوں کی ترتیب واشاعت میں حصہ لیا۔

شیخ حفیظ الدین نے علامہ ابوالفضل کی '' عیار دانش'' کا اردو ترجمہ کیا اور اس کا نام ''خرد افروز'' رکھا۔

منشی بنی نارائن جہاں نے ''چار گلشن''، ''تذکرہ جہاں'' اور شاہ رفیع الدین کی فارسی کتاب ''تنبیہ الغافلین'' کا اردو ترجمہ کیا۔

مندرجہ بالا اصحاب کے علاوہ خلیل علی خان اشک، مولوی اکرام علی، للو لال کوی، مرزا محمد فطرت، محی الدین فیض، اور سید حمید الدین بہاوی، نارینی چرن مترا، میر معین الدین فیض، باسط خان ارمرزا مغل نشان، کے نام بھی فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کی تحریکوں سے ایک انقلاب عظیم رونما ہو گیا ایک طرف ہندوستان کے پڑھے لکھے لوگوں میں ذوق شعر وادب نشونما پانے لگا تو دوسری طرف اخبارات ورسائل و جرائد منظر عام پر آنے لگے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس زمانہ میں اردو کی ہردلعزیزی اتنی بڑھ گئی کہ علماء کو اس زبان میں تصنیف وتالیف کا خیال پیدا ہوا۔ [18]

فورٹ ولیم کالج کی خدمات کی بدولت اردو نہ صرف ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی بلکہ دہلی اور لکھنو کے در و دیوار سے گزر کر بہار و بنگال کی سرسبز و شاداب وادیوں تک پہنچ گئی اور انیسویں صدی میں کلکتہ اردو شعر وادب کا مرکز بن گیا۔ اس سرزمیں میں اتنے شاعر وادیب پیدا ہوئے کہ جن کے نام گنوانا بھی دشوار ہے۔ [19]

انیسویں صدی میں پہلے قابل ذکر شاعر حافظ اکرام احمد ضیغم ہیں وہ شاہ رؤف احمد رافت سر ہندی کے شاگرد اور داماد تھے۔ رافت سرہندی کو جرأت سے شرف تلمذ حاصل تھا اس لئے اس سلسلے سے ضیغم، جرأت کے خانوادہ شاعری کے ایک فرد ٹھہرتے ہیں۔ اکرام احمد پہلے حشمت تخلص کرتے تھے اور بعد میں ضیغم کہلائے۔ [20]

حافظ اکرام کو جمیع اصناف سخن پر قدرت حاصل تھی۔ غزل کے علاوہ ہزل، ریختی اور مرثیہ بھی کہتے تھے۔ اور تینوں اصناف میں مہمان تخلص کرتے تھے۔ علم عروض کے ماہر بلکہ مجتہد تھے۔ مختلف صنعتوں میں شعر کہتے تھے مشکل زمینوں کا انتخاب کر کے ان میں غزل کہتے تھے۔ دقیق قوافی اور ردیفوں میں شعر کہنا، مشکل زمینوں کو پانی کرنا، معنویت اور فن عروض کے لحاظ سے نئے نئے شگوفے کھلانا گویا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ چودہ پندرہ برس تک کلکتہ میں تھے۔ [21]

مولوی رشید النبی وحشت بھی کلکتہ کے اونچے درجے کے شاعر تھے۔ ان کے والد مولوی حبیب النبی رقت رام پور کے باشندے تھے لیکن رقت بعد میں بطور معاون مدرسہ عالیہ کلکتہ میں کام کرتے تھے۔ اس لئے رشید النبی وحشت بھی کلکتہ ہی کے ہو کر رہ گئے۔ وحشت کو شاعری ورثے میں ملی تھی کیونکہ رقت عربی وفارسی کے شاعر تھے۔ شاعری میں وحشت، حافظ

اکرام احمد ضیغم کے شاگرد تھے۔ عربی و فارسی اور اردو اشعار نہایت خوب اور بغایت مرغوب کہتے تھے۔ عین شباب ۱۲۷۴ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ عبدالغفور نساخ شاعری میں ان سے اصلاح لیا کرتے تھے۔[22]

عبدالغفور نساخ کا آبائی وطن فرید پور (بنگلہ دیش) تھا۔ لیکن ان کی پیدائش کلکتہ میں ہوئی۔ نساخ کے والد قاضی فقیر محمد کلکتہ ہائی کورٹ کے سربرآوردہ وکیل تھے۔ نساخ کی زندگی کا بیشتر حصہ کلکتہ میں گزرا۔ تصانیف نساخ کی تعداد خاصی بڑی ہے جن میں تذکرہ سخن شعراء، تذکرہ معاصرین، دفتر بے مثال، ارمغانی، زبان ریختہ، قطعہ منتخب، چشمۂ فیض، شاہد عشرت، مرغوب دل، اشعار نساخ، مظہر معما، چشمۂ فیض، شاہد عشرت، مرغوب دل، اشعار نساخ، مظہر معما، ترانہ خامہ، باگ فرک، گنج تواریخ، قند پارسی شامل ہیں۔
قاضی عبدالحمید حمیدؔ کلکتہ کے نہایت قابل قدر شاعر، مجموعہ کمالات، مجمع الصفات بزرگ اور بنگالی دلدادگان سخن کے لئے ایک عزیز القدر نعمت تھے۔ ۴ اپریل ۱۸۹۵ء کو انہیں حکومت برطانیہ کی جانب سے قاضی کا عہدہ ملا تھا۔[23]

حمیدؔ، نساخؔ کے تلامذہ ارشد میں سے تھے۔ کچھ دنوں آتشؔ کو بھی بغرض اصلاح اپنی غزلیں دکھائیں۔ طبیعت میں بلا کی روانی اور موزونیت پائی تھی سخن پر قادر تھے زبان پر اچھی نظر اور فن عروض پر اچھی مہارت تھی ان کی بدیہہ گوئی کا یہ عالم تھا کہ راستہ چلتے چلتے بات بات پر حسب حال و موقع اشعار کہا کرتے تھے۔ بطور نمونہ ان یہ شعر:۔

ہو گیا عشق دل کو اس بت طناز کا
یاالٰہی ہو بخیر انجام اس آغاز کا۔[24]

"مولانا وحشت فرماتے ہیں کہ انہیں آزاد جہانگیری سے بھی تلمذ حاصل تھا۔ کہتے ہیں"
"مرحوم حضرت آزاد جہانگیرنگری کے ارشد تلامذہ میں داخل تھے اور بڑے زود گو اور کہنہ مشق شاعر تھے۔"[25]

انشائے داغ میں داغؔ دہلوی کا ایک خط قاضی عبدالحمید کے نام موجود ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قاضی صاحب کے تعلقات داغؔ دہلوی سے گہرا پائدار اور مخلصانہ تھے۔ قاضی صاحب نے داغؔ کی کلکتہ تشریف آوری پر بھی ایک قطعہ لکھے تھے۔ نیز ان کے کلام کے شائع ہونے کے موقع پر بھی دو قطعے لکھے تھے۔ مرزا داغ کی وساطت سے قاضی صاحب حیدر آباد بھی گئے تھے۔[26]

زبان و بیان کی خوبی قاضی صاحب کی غزلوں اور نظموں کا طرۂ امتیاز ہے ان کے کلام کا بیشتر حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ غزلوں میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ قاضی صاحب کے متصوفانہ اشعار روکھے پھیکے نہیں بلکہ اپنے اندر تغزل کی چاشنی رکھتے ہیں۔ فکر و نظر، تخیل، جذبات، زبان و انداز بیان کی حلاوت گویا وہ تمام محاسن جو شعر گو پختہ، پائدار اور موثر بناتے ہیں قاضی صاحب کے کلام میں موجود ہیں۔ کلام میں قدرت مضامین کی کچھ کمی سی محسوس ہوتی ہے۔[27] ان کے ہاں عاشقانہ اشعار کی بھی کمی نہیں۔ ان کے عاشقانہ اشعار میں دلسوزی نہیں۔ بلکہ شوخی و شگفتگی نظر آتی ہے۔ غزلوں کے علاوہ قاضی صاحب نے رباعیاں، مخمس، مسدس اور مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ انہیں اصناف پر مشتمل ان کا کچھ کلام فارسی میں بھی موجود ہے۔ قاضی صاحب کے قطعات ملک کی اور خصوصاً مسلمانان کلکتہ کی تمدنی اور علمی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔[28] مندرجہ ذیل کتابیں عبدالحمید خان کی ہیں۔

ا۔ خمخانۂ جاوید ۲۔ خزینۂ رحمت ۳۔نہرالبلاغ ۴۔ خازن ترانہ ۵۔ مہر انتخاب ۶۔ نجم بختیار ۷۔مناجات الاخبار ۸۔قصائد منتخبہ ۔[۲۹]

مولوی ابوسعید اوحد خان بہادر عبدالرؤف وحید کے بیٹے تھے۔ بہت ذہین اور ذکی تھے۔ اوحدؔ نے نوجوانی میں انتقال کیا۔ ان کا کلام اکثر ضائع ہو چکا ہے مگر جو کچھ مل سکا، باپ نے اپنے دیوان کے ساتھ شائع کرا دیا ہے۔[۳۰]

مرزا احمد بیگ طپاں رئیس کلکتہ عدالت دیوانی کلکتہ میں وکالت کرتے تھے بڑے عالی خاندان تھے اور بڑی شان سے زندگی بسر کی۔ مرزا جان طپش کے شاگرد تھے۔ طپاں مرزا غالب کے رشتہ دار بھی تھے۔ غالب مرحوم کے بہت سے خط ''پنج آہنگ'' میں طپاںؔ کے نام ہیں۔ صرف اردو ہی لکھتے تھے۔ ۱۸۳۴ء میں انتقال کیا۔[۳۱]

مرزا محبوب علی تخلص قوسؔ ولد مرزا ہمایوں بخت، کانپور میں پیدا ہوئے۔ لیکن ساری زندگی کلکتے میں بسر کی۔ نساخؔ کے شاگرد تھے۔ پہلے شمسؔ تخلص کرتے تھے۔ صاحب دیوان تھے۔ دیوان شاید چھپا نہیں۔ حکیم حبیب الرحمٰن نے ''سخن شعرا'' سے چند اشعار نقل کئے ہیں۔[۳۲]

سید صادق حسین، تخلص نہال، سید نصیر حسین خیال کے برادر اکبر تھے عظیم آباد پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ مگر کلکتہ ہی میں رہتے تھے۔ انہوں نے ایک اردو مسدس ''کوئل'' لکھی یہ مسدس ستارہ ہند کلکتہ سے چھپی۔[۳۳]

مولوی حکیم تفضّل حسین بڑے عالم اور فاضل طبیب تھے۔ فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ طب سے تعلق رکھتے تھے اس شعبہ میں طب پڑھایا کرتے تھے اس کے علاوہ ان کی فقہ کے مسائل

پر کتاب ''تلخیص المسائل'' ہے صفحات کی تعداد ۴۲۴ ہے جو دوسری بار مطبع احمدی کلکتہ سے ۱۸۷۵ء میں چھپی تھی۔[۳۴]

منشی اسد اللہ تلخص علی جان کلکتہ ہائی کورٹ میں اہل کار تھے۔ کلکتہ میں تعلیم و تربیت پائی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اور نساخؔ کے شاگرد تھے صاحب دیوان تھے مگر ان کا دیوان چھپا نہیں۔[۳۵]

میر اشرف علی تخلص اشرفؔ شاگرد حافظ اکرام احمد ضیغمؔ، اردو میں شعر و شاعری کرتے تھے۔ اور موولی عبدالکریم خان آشناؔ، منشی، فورٹ ولیم کالج باشندۂ کشن نگر کلکتہ میں رہتے تھے۔ شعر بہت کم کہتے تھے۔ لیکن جو کہتے تھے نہایت پاکیزہ کہتے تھے۔[۳۶]

مولوی عبدالصمد تخلص اعظم عرف محبوب جان، برادر خورد مولوی وجہ اللہ خان بہادر متخلص بہ داغؔ، کلکتہ کے رہنے والے تھے اور مدرسہ عالیہ کے مدرس تھے۔ اردو میں شعر و شاعری کرتے تھے۔ تذکرۃ المعاصرین میں نساخ اعظم کے متعلق کہتے ہیں، بہر دو زبان فارسی و اردو شعری گوید و از نظر راقم الحروف میگزراند۔[۳۷]

ڈاکٹر صدر الحق نے بھی اعظم کے بارے میں کہا ہے کہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر موزون کرتے تھے۔[۳۸]

سید محمد باقر علی خان تخلص باقر مخطب بہ اعتضاد الدولہ برادر کوچک ذوالفقار الدولہ شاگرد مرزا مظفر لکھنو کے رہنے والے تھے۔ لیکن کلکتہ میں مقیم تھے صاحب دیوان تھے اور نساخ کے دوستوں میں سے تھے۔[۳۹]

فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا خان بہادر تخلص برقؔ، نساخؔ کے شاگرد تھے۔ واجد علی شاہ کے ہمراہ کلکتہ میں آئے تھے اور ۱۸۵۷ میں یہیں وفات پائی۔ شعر خوب کہتے تھے صاحب دیوان تھے۔ [۴۰]

میر واحد واجد تخلص پریشاںؔ، داناپور کے پیرزادوں میں سے تھے۔ مولوی ذاکر علی ذاکر سے اصلاح لیتے تھے۔ بہت دنوں سے کلکتہ میں رہتے تھے۔ نساخ کے دوستوں میں سے تھے۔ [۴۱]

راجہ جنم جے متر ارمانؔ کلکتہ کے حوالی شیورا میں پیدا ہوئے۔ وہ راجہ پیتمبر کے پوتے تھے۔ راجہ پیتمبر کو خود بھی اردو شاعری کا اچھا مذاق تھا چنانچہ راجہ جنم جۓ متر نے ایسے ماحول میں آنکھ کھولی جہاں شعر و شاعری کا عام چرچا تھا۔ راجہ ارمانؔ بھی فطری طور پر اس ماحول کا اثر قبول کیا اور صغر سنی سے ہی شاعری کرنے لگے تھے۔ ارمانؔ اس عہد کے مشہور و معروف شاعر حافظ احمد ضیغمؔ کے دائرہ تلمذ میں شامل ہوگئے۔ حافظ ضیغمؔ کے علاوہ ارمانؔ کو عبدالغفور نساخؔ، عصمت اللہ اسخؔ اور نساخ کے دوسرے شاگردوں اور اچھے اور بامذاق لوگوں کی صحبت رہی۔ یہی صحبت ان کی شاعری کو چمکانے اور جلا بخشنے میں معاون ثابت ہوائی۔ [۴۲]

حکیم حبیب الرحمٰن ان کے بارے میں کہتے ہیں، اردو شعر و شاعری کے عاشق تھے۔ نساخؔ کے ملنے والوں میں سے تھے۔ نسخہ ''دلکشا'' اردو شعراء کا تذکرہ ہے۔ اس تذکرہ کے لئے ایک اردو مطبع کھولا تھا۔

مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۶۷ شعراء اور ۲۳ شاعرات کا تذکرہ ہے مگر ۳۸۰ صفحات تک شائع ہوسکا کہ بیمار ہوگئے۔ اور وفات پائی یہ تذکرہ ۱۸۳۵ء میں پہلی بار چھپا تھا۔ [۴۳]

سید ابوالقاسم کا ذکر ڈاکٹر جاوید نہال نے اپنی تصنیف ''بنگال کا اردو ادب'' (انیسویں

صدی) میں کیا ہے۔ ''حسن اختلاط'' میر ابوالقاسم کی تالیف ہے۔ یہ چھوٹا سا تاریخی صحیفہ ہے۔ جس میں ہندوستان کی مختلف سلطنتوں کا۔ ہندو، افغان، مغل اور انگریز کا حال بے حد اختصار سے بیان ہوا ہے۔ اور غالباً اس کتاب کے کالج (فورٹ ولیم کالج) کے منشی خلیل علی خان اشکؔ کے دل میں انتخاب سلطانیہ اردو لکھنے کی تحریص پیدا کی ہو۔ انتخاب سلطانیہ اردو بھی ہندوستان کی مختصر تاریخ ہے۔ [۴۴]

''حسن اختلاط'' کا خطی نسخہ صرف ۶۲ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کی اہمیت اس لئے ہے کہ اردو نثر نگاری کا یہ ایک بہت قدیم نمونہ ہے۔ اور فورت ولیم کالج کی داستانوں اور تاریخوں کی تالیف سے پہلے جنوری ۱۸۰۰ میں ترتیب پا چکی تھی۔ سید صاحب کی یہ تاریخ بھی شرمندہ اشاعت نہ ہوسکی۔ اور مخطوطہ کی شکل میں کلکتہ ایشیاٹیک سوسائٹی میں محفوظ ہے۔ [۴۵]

جیمس فرانسیس کارکرن، گل کرسٹ کے بعد سب سے اہم غیر ملکی مصنف جسے اردو سے والہانہ شیفتگی تھی اور ہندوستان کے علماء اور مشاہیر کی صحبت نے اس کے ذہن کو صیقل کیا۔ وہ صدر عدالت کلکتہ کے مترجم تھے۔

قیام کلکتہ کے دوران انہوں نے اپنی مشہور کتاب ''تاریخ ممالک چین'' تصنیف کی اور اس کی ترتیب میں اس نے تقریباً ۲۸ مستند تاریخوں سے مدد لی۔

''تاریخ چین'' کی دو جلدیں ہیں۔ پہلی جلد ۱۸۴۸ع میں اور دوسری جلد ۱۸۵۲ میں شائع ہوئی۔ [۴۶]

جیمس کارکرن کی دوسری کتاب ''جوہر اخلاق'' چھوٹی چھوٹی سبق آموز کہانیوں پر مشتمل ہے۔ جوہر اخلاق میں ہر حکایت کا ماحصل اس نے نظم میں لکھا ہے۔ جس سے اس کی شاعرانہ

صلاحیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔ بلا شبہ زبان اور بیان کے لحاظ سے اس کی ادبی حیثیت نہیں ہے لیکن اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

جوہر اخلاق کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مارش میں کی ''تاریخ بنگلہ'' کا بھی اردو ترجمہ کیا تھا۔ لیکن اب اس کا کوئی مطبوعہ و غیر مطبوعہ نسخہ نہیں ہوتا۔ [۴۷]

ابوالقاسم محمد شمس کلکتہ کے ایک جلیل القدر شاعر اور مستند استاد تھے۔ نساخ کے صاحبزادے تھے۔ اسخ سے اصلاح سخن لیا کرتے تھے۔ جب ذہنی شور بیدار ہوا تو داغ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ اس لئے ان کے کلام میں داغ کا رنگ صاف طور پر نمایاں ہے۔ جرات کے رنگ میں بھی اکثر اشعار کہتے چست بندش، مضمون میں گھلاوٹ، زبان میں حلاوت ش شیرینی، کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ داغ دہلوی نے اپنے ایک مکتوب میں شمس کے کلام کی یوں توصیف کی ہے۔

''تم اچھے تمہای بات اچھی، تمہاری زبان اچھی۔''

ایک کامیاب شاعر کی زبان دانی کی اس سے بہتر جامع و مانع سند کہیں نہیں مل سکتی۔ [۴۸]

مصطفے حیدر نام اور تخلص حیدر تھا۔ یہ مولوی غلام حیدر، سررشتہ دار فورٹ ولیم ککلکتہ و مدرس دوم فارسی مدرسئہ عالیہ کلکتہ کے بیٹے تھے۔ حیدر کا وطن چاٹگام تھا۔ اور مسکن کلکتہ تھا۔ [۴۹]

''تذکرہ بزم سخن'' میں ہے۔ ''از وطن خود چاٹگام برآمدہ وہ کلکتہ سکونت ورزید'' [۵۰]

۱۲۷۵ھ میں کلکتہ میں ملازم تھے۔ [۵۱]

ان کی طبیعت میں نہایت شوخی تھی۔ صاحب دیوان تھے اور ان کا کلام بھی شوخ ہوتا ہے۔ ان

کا دیوان اب ناپید ہے نساخ نے ان کے کچھ اشعار درج کئے ہیں۔ اور ان کی وفات پر یہ قطعہ تاریخ درج کیا ہے۔:

آں حیدر نکتہ پرور و نکتہ شناس
چوں جان عزیز را بخالق بسپرد
نساخ برائے سال ترحیل اور
گفتم کہ حیدر سخن سنج بمرد ۔ [۵۲]

۱۲۹۱ھ

منشی مسیح الدین تمنا کلکتہ کے رہنے والے تھے وحشت کے شاگرد تھے۔ نساخ کے عہد میں چوبیس پرگنہ میں مختاری کرتے تھے اردو میں شعروشاعری کرتے تھے۔

حشم تخلص میر آغا حسین شاگرد علی جان مشتق لکھنو کے باشندے تھے۔ لیکن کلکتہ میں قیام پذیر تھے۔ نساخ نے اپنے تذکرے ''سخن شعراء'' میں ان کا ایک شعر بطور مثال پیش کیا ہے۔ [۵۳]

خان تخلص عبداللہ داناپوری، حافظ ضیغم کے شاگرد تھے اور کلکتہ میں وفات پائی۔ [۵۴]

اور مولوی عبدالعزیز تخلص خواجہ۔ منشی سابق فورٹ ولیم کالج، مولوی عصمت اللہ اسخ کے شاگرد تھے۔ ان کا مولد سلہٹ، لیکن مسکن کلکتہ تھا۔ بڑے ذہین و ذکی تھے شعر اچھا کہتے تھے۔ ۱۲۸۸ھ میں انتقال کیا۔ [۵۵]

مولوی وجہ اللہ خان بہادر تخلص داغ ضلع بیربھوم کے ڈپوٹی مجسٹرٹ ڈپوٹی کلکٹر تھے لیکن زندگی کا بیشتر حصہ کلکتہ میں گزارا کیونکہ ان کے والد مولانا محمد وجیہ صاحب مدرسہ عالیہ کلکتہ کے

مدرس اول تھے۔ داغ رشید النبی وحشت کے شاگرد اور ناسخ کے دوستوں میں سے تھے۔ بیشتر فارسی کہتے تھے اور کبھی کبھی اردو میں بھی شغل شاعری فرماتے تھے۔ ۱۱۸۸ھ میں انتقال کیا۔[۵۶]

سید جعفر علی لکھنوی تخلص رواں شاگرد کاظم علی جواں مقیم کلکتہ اور سیٹھ باپو جی پارسی تخلص رونق شاگرد حافظ ضیغم بھی کلکتہ کے اردو شعراء میں اچھا مقام رکھتے تھے۔[۵۷]

مرزا علی حسین زائر متوطن مشہد لیکن کلکتہ میں قیام پذیر تھے۔[۵۸]

اور سید محمد سجاد تخلص سجاد مخاطب بہ ذوالفقار الدولہ برادر زن واجد علی شاہ بادشاہ لکھنو، حلف محمد تقی علی خان اور نواسہ انشاء اللہ خان لکھنو کے باشندے تھے لیکن کلکتہ ہی میں قیام پذیر تھے۔ اور شعر و شاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔[۵۹] اور مرزا نجف بھی لکھنو کے باشندے تھے لیکن کلکتہ میں قیام پذیر تھے۔ مرزا مہدی قبول کے شاگرد تھے اور صاحب دیوان تھے۔[۶۰]

میاں رحمان بخش شاداں شاگرد ناسخ وطن ان کا فرید پور لیکن مولد و مسکن کلکتہ تھا۔ اور منشی عبد السبحان شاکر باشندہ کلکتہ اور مولوی عصمت اللہ نسخ کے شاگرد تھے۔[۶۱]

مولوی عبد الباری تخلص صید شاگرد مولوی رشید النبی وحشت، مدرسہ عالیہ کلکتہ میں زبان انگیریزی کے مدرس تھے۔ اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ مگر ان کا کلام ضائع ہو گیا ہے۔ ۱۲۷۴ھ میں عین شباب اپنے وطن یعنی فرید پور میں انتقال کیا۔[۶۲]

سید محمد علی، تخلص عارف، مرزا ہاشم علی تخلص عیاں ولد مرزا کاظم علی جوان، غلام ربانی تخلص عبد اور نواب نیاز علی خان تخلص عزت اور منشی عبد العزیز تخلص عزیز ان سب کا شمار بھی کلکتے کے اردو شعراء میں ہوتا ہے۔ عزیز صاحب دیوان تھے۔[۶۳]

مرزا امان علی خان عظیم آبادی تخلص غالب اردو قصہ ''امیر حمزہ'' کے مولف تھے۔ اور مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ مدت تک ڈپٹی کلکٹر تھے بہت دنوں کلکتہ میں سکونت اختیار کی۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔[۶۴]

شاہ الفت حسین فریاد عظیم آباد کے رہنے والے تھے لیکن مدتوں سے کلکتہ میں رہتے تھے۔ بیشتر فارسی کہتے تھے۔ صاحب تصنیف تھے۔[۶۵]

قاسم علی لکھنوی قاسم، صاحب تصنیف مثنوی ''حیرت ارزا'' منشی قادر بخش مغفور شاگرد مولوی عصمت اللہ انسخ، حکیم علی محمد عظیم آبادی تخلص فقیر، شیخ باقر فنا شاگرد حافظ ضیغم، مولوی عبد الکریم خان آشنا اور مولوی محمد مظہر وصل کا شمار بھی کلکتہ کے اردو شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ خواجہ اسد اللہ تخلص قلق مخاطب بہ آفتاب الدولہ ہمشیر زادۂ خواجہ وزیر، واجد علی شاہ کے ہمراہ کلکتہ آئے تھے۔ صاحب دیوان تھے۔ شعر اپنے طرز پر اچھے کہتے تھے۔ انہوں نے اپنی مثنوی ''طلسم الفت'' کلکتہ میں سنائی تھی۔[۶۶]

خواجہ نبی بخش محرور، ناسخ کے شاگرد تھے۔ ۱۸۶۱ میں عین جوانی انتقال کیا۔ اور مولوی ظہور النبی محزون چیت پور توابع کلکتہ میں رہتے تھے اور شعر اچھا صاف کہتے تھے۔ ان کے علاوہ میر فرزند علی مسلم عدالت دیوانی صدر کلکتہ میں محرر تھے اور شاعری میں حافظ ضیغم سے اصلاح لیتے تھے۔ شعر ان کے اچھے ہوتے تھے اپنی شاعری کا غرور رکھتے تھے۔ عین شباب ۱۲۷۶ھ میں انتقال کیا۔[۶۷]

منشی عبد الرحمٰن مواج اور میاں محمد حسین مشہور کا شمار بھی اس دور کے شعراء میں کیا جاتا ہے۔[۶۸]

کلکتہ میں اردو شعروشاعری کا اتنا چرچا تھا کہ وہاں کے بنگالی بھی اردو سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انہوں نے بھی اس ضمن میں کافی نام پیدا کیا۔ان شعرا میں قابل قدر مہاراجہ رام نرائن موزوں ہیں جو نواب علی وردی خان مہابت جنگ کے ملازم تھے جنہوں نے ۱۷۵۲ء میں ان کو نائب ناظم مقرر کیا تھا۔وہ فارسی اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔[۶۹]

اس سلسلے کے ایک دوسرے بڑے شاعر، بھارت چندرائے گنا کار ہیں۔وہ ۱۰ مئی ۱۷۱۲ء کو پیدا ہوئے اور ۲۷ ستمبر ۱۷۶۰ کو فوت ہوئے وہ نہ صرف بنگلہ زبان کے شاعر تھے بلکہ فارسی اور اردو میں بھی انہوں نے اشعار کہے ہیں۔[۷۰]

کلکتہ کے مشہور شوبھا بازار راجا خاندان والوں نے انیسویں صدی میں اردو زبان وادب کی بڑی خدمت کی ہے اس گھرانے کے شعراء میں ایورب کشن دیب بہادر کنورؔ، جادب کرشنا دیب بہادر شفقؔ، راج کرشنا دیب بہادر راجہؔ، راجا کالی کرشنا دیب بہادر اور کشن چندر کھوش کشن اچھے شاعر گذرے ہیں۔[۷۱]

شوبھا بازار راجہ گھرانے بنگالی ہندو شعرائے اردو کے علاوہ انیسویں صدی میں ہم کئی اور بنگالی ہندو شعرائے اردو پاتے ہیں مثلاً کلکتہ ملک گھرانے کے نامور شاعر جگن ناتھ پرشاد ملک متخلص بہ ملکؔ، راجا جنمے جئے متر ارمانؔ شاگرد ضیغمؔ اور مصنف تذکرہ ''نسخہ دلکشا'' بالو دینا ناتھ دیبؔ، مصنف ''جواہر التعلیم'' کے علاوہ بابو ہری موہن داس متخلص متخلص بہ داسؔ کے نام اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔[۷۲]

مرشدآباد میں اردو (انیسویں صدی تک)

بنگال میں اردو ادب کا ایک اہم مرکز مرشدآباد کو قرار دیا جا سکتا ہے۔اس مقام کا قدیم نام ایک پٹھان سوداگر مخصوص خان کے نام پر مخصوص آباد تھا لیکن ۱۷۰۴ میں جب مرشد قلی خان ڈھاکہ کی بجائے اس جگہ کو صدر بنایا تو اس کا نام مرشدآباد رکھا گیا۔

مرشدآباد مرشد قلی خان سے لے کر نواب سراج الدولہ کے عہد تک علم وادب کا ایک گہوارہ رہا ہے۔جس کی وجہ سے دہلی اور لکھنو سے کئی صاحب کمال شاعر اور ادیب نوابان کی علم پروری اور ادب نوازی کی بنا پر مرشدآباد چلے آئے۔بیرون شعراء کے علاوہ اس سرزمین سے بھی کئی باکمال شعراء ابھرے ہیں جن میں انشاء اللہ خان انشاؔء، قدرت اللہ قدرتؔ اور محمد فقیہ درد کے نام سرفہرست ہیں۔

نواب علی وردی خان کے زمانے میں محمد فقیر تخلص دردؔمند ایک ممتاز شاعر تھے۔مرزا مظہر جان جاناں مظہر سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے۔۱۷۴۷ء میں انتقال کیا۔[۷۳]

نواب سراج الدولہ کو بھی فارسی و اردو سے بڑی دلچسپی تھی۔وہ خود بھی عالم تھا اور اہل علم کی دل سے قدر کرتا تھا۔اس نے بھی علم وادب کی بڑی سرپرستی کی اس کے دربار میں نامی گرامی شعراء کو شرف باریابی حاصل تھا۔جن میں قدرت اللہ قدرتؔ اور فرحتؔ زیادہ مقبول ہوئے۔[۷۴] شاہ قدرت اللہ، میر شمس الدین فقیر کے برادر عم زاد تھے۔اور ممکن ہے ان سے مشورہ سخن کیا۔مرزا علی لطف ان کے بارے میں کہتے ہیں:۔

قدرت تخلص، شاہ قدرت اللہ نام، ساکن شاہجہاں آباد کے۔مشہور سخنوروں میں سے

تھے۔رشتہ دار تھے میر شمس الدین فقیر کے۔صاحب مذاق تھے چاشنی درد وتاثیر کے نظم ریختہ میں ذہن رسا رکھتے تھے۔خاطر سخن گستر اور طبع معنی آشنا رکھتے تھے۔طرز مضمون آفرینی سے ماہر،اور ایک شکستگی و برشتگی کلام ان کے ظاہر۔

اکثر فکر اشعار فارسی کی بھی کرتے تھے۔لیکن نظم ریختہ پر مرتے تھے۔تازہ کرنے میں مضمون کے اپنے ہم عصروں میں ممتاز اور صفائی میں بندش کی نازک خیالیوں سے ہند کے دمساز تھے۔وارستہ مزاجی کے یار اور آزادہ خیالی سے سروکار۔ایک مدت سے دلی چھوڑا تھا اور وارد مرشد آباد تھے۔اکابر اور اعزہ اس شہر کے سب ان سے پر عنایت وامداد تھے۔علی ابراہیم خان مرحوم نے لکھا ہے کہ مجھ سے ان کو اخلاص اور اتحاد تھا۔واقعی عزیز اپنے طور کا استاد تھا۔شاید ۱۲۰۵ بارہ سو پانچ ہجری (۱۷۹۰ء) میں اسی بلد کے اندر انتقال کیا اور طبع کو صاحب طبعوں کے حد سے زیادہ تر ملال کیا۔ دیوان میں اس صاحب کے ہر قوم کے اشعار ہیں۔[۷۵]

نساخ نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ قدرت مرزا مظہر خان جان جاناں اور جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے ۱۷۹۰/ ۱۲۰۵ھ میں انتقال کیا۔ دہلی کے رہنے والے تھے لیکن نوابان مرشد آباد کی قدر دانی کی شہرت سن کر مرشد آباد چلے آئے۔ میرؔ ان کی نسبت کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے اور ان کو ’’عاجز سخن‘‘ لکھا ہے مگر میر حسین انکے بہت مداح ہیں۔[۷۶]

مرشد آباد میں انشا اللہ خان کے والد میر ماشا اللہ خان شاہی طبیب تھے جو زوال دہلی کے بعد سے مرشد آباد چلے آئے۔شعر و سخن کے دل دادہ تھے اور ان کا تخلص مصدرؔ تھا۔[۷۷]

ان کی بدیہہ گوئی مشہور تھی۔تذکروں میں اس امر کی شہادت موجود ہے۔مصحفی نے تذکرہ

ہندی میں لکھا ہے۔کہ میر ماشا اللہ گاہ گاہ شعر بھی کہتے تھے۔جب کوئی ان کی پاس آ کر اپنا کلام سناتا تھا۔تو فی بدیہہ اس کے جواب میں شعر کہکے سنا دیتے تھے۔مختلف تذکرہ میں ان کے یہ دو شعر ملتے ہیں:

خدا کرے کہ مرا مجھ سے مہربان نہ پھرے
پھرے جہاں تو پھرے وہ جان جان نہ پھرے
کافر ہو وہ تجھ بن جو کرے چاہ کسو کی
صورت نہ دکھا وے مجھے کسو کی

ان کے علاوہ ’’یادگار ضیغم‘‘ میں بھی ان کے تین شعر درج ہیں۔[۷۸]

نواب میر محمد شرفؔ کا تعلق نوبان مرشد آباد سے تھا جو مشہور شاعر تھے اور میر امیر علی تخلص آشنا، میر سبز مرشد آبادی کے بیٹے اور غلام حسین آتشؔ کے شاگرد تھے۔اردو میں شعر و شاعری کرتے تھے۔میر مظہر علی تخلص آزادؔ کا تعلق بھی مرشد آباد سے تھا۔ ’’گلشن ہند‘‘ میں ان کے چند اشعار مذکور ہیں۔[۷۹]

سید اسد علی تخلص ثریاؔ ابتدائی تعلیم مرشد آباد میں اور اعلی تعلیم انگلستان میں حاصل کی۔انگلستان سے واپس آ کر مرشد آباد میں کم اور کلکتہ میں زیادہ رہا کرتے تھے۔ذوق شعر و سخن خداداد تھا۔[۸۰]

خاک بنگال سے جو نامور شاعر و ادیب ابھرے ان میں مرشد آباد کی خاک سے پیدا ہونے والے انشا اللہ خان انشاؔ کو اردو نظم و نثر کے میدان میں اچھوتا مقام حاصل ہے ہے۔انشا اللہ خان کے والد ماشا اللہ خان شاہی طبیب تھے۔دہلی کی تباہی کے بعد مرشد آباد چلے آئے۔

وہیں انشااللہ خان پیدا ہوئے۔

مرشدآباد میں جوان ہوئے اور یہیں تعلیم حاصل کی۔ بعدازاں دہلی اور پھر لکھنو چلے آئے ان کے کلیات میں غزلیات، قصائد، مثنویات، قطعات، رباعیات، ریختی، چیستان، پہلیاں سبھی کچھ شامل ہے۔[۸۱]

نثر میں ان کا کارنامہ ''رانی کیتکی'' اور '' کنوراودے بھان'' کی کہانی ہے یہ انشا کی ذہانت کی عجیب ونادر کارستانی ہے۔ یہ ایک داستان ہے جس میں عربی فارسی وغیرہ کی کسی ہندوستان باہر کی زبان کا کوئی لفظ نہیں آیا۔ قصہ بھی دلچسپ اور انداز بیان بھی دلکش ہے۔

نثر میں ان کی دیگر کتاب ''دریائے لطافت'' ہے۔ یہ تصنیف اردو زبان وقواعد ادب کے متعلق سید انشا کا نہایت قابل قدر کارنامہ ہے۔ کتاب فارسی زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ اردو کی قواعد ومحاورہ کے متعلق اور دوسرا حصہ منطق ومعانی وعروض پر ہے۔

مولوی عبدالحق اس کتاب کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

یہ پہلی کتاب ہندی اہل زبان نے اردو صرف ونحو پر لکھی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ عجیب جامع اور بے مثال کتاب ہے۔ اردو زبان کے قواعد، محاورات اور روزمرہ کے متعلق اس سے پہلے کوئی ایسی مستند اور محققانہ کتاب نہیں لکھی گئی۔ جو لوگ اردو زبان کا محققانہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں یا اس کی صرف ونحو یا لغت پر کوئی محققانہ تالیف کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہی نہیں بلکہ ناگریز ہے۔[۸۲]

میر امانی تخلص اسدؔ مرزا محمد رفیع سوداؔ کے شاگرد میں داخل تھے۔ شاہ عالم کے زمانے میں مرشد

آباد آکر سکونت اختیار کرلی اور یہیں انتقال کیا۔[۸۳]

جناب سیدالشہدا کی تعزیہ داری کا شغل ہمیشہ رکھتے تھے۔[۸۴]

میر آلمؔ شاہ جہاں آبادی خلف خواجہ میر درد۔ درویش صاحب حقیقت اور رموز معرفت کے پہچاننے والے تھے۔ ۱۱۹۴ گیارہ سو چرانوے ھ میں گیارہ سو چورانوے ہجری میں (۱۷۸۰ع) میں بلدۂ مرشدآباد میں رونق بخش ہوئے۔ اور راجہ دولہ رام کی دوستی میں چند مدت سے شہر میں رہے تھے۔ اردو میں شاعری کرتے تھے۔[۸۵]

میر غلام علی آزاد تخلص اظہرؔ، میر شمس الدین کے شاگرد تھے۔ کچھ زمانہ مرشدآباد میں بسر کیا۔ غرور اور خودستائی میں مشہور تھے۔ اپنی طبع سازی کی بدولت مراد تک نہ پہنچ سکے اور بعدازاں عظیم آباد چلے آئے۔ علی ابراہیم خان ان کے بارے میں کہتے ہیں'' درفارسی سخن رس معنی یاب بود۔ دریں اوقات فکر ریختہ می نمود''[۸۶]

میر اولیاء لکھنو میں قصبہ مہابن کے رہنے والے تھے۔ لیکن مرشدآباد میں ملازمت اختیار کرلی علی ابراہیم نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔'' مردآزادہ وخلیق وحسن پرست وذہین ست۔ بر لغات ہند یہ اقتدار بسیار دارد طبعش در ریختہ رسا۔ ''[۸۷]

علی خان دہلوی تخلص انتظارؔ خلف اکبر علی خان مرحوم۔ نواب علی وردی خان کے زمانے میں مرشدآباد آئے اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ جوان فہمیدہ وخوش تقریر تھے۔ اردو میں اچھے اشعار کہتے تھے۔[۸۸]

مرزا اظہور علی دہلوی خلیقؔ خلف مرزا ہوشدار کے متعلق ''گلشن ہند'' میں یوں رقم ہے۔'' در موسیقی ہندی ومرثیہ خواندن بغایت مہارت دارد۔ بعضے از کتب عربیہ خواندہ۔ جوان آرامیدہ و

خوش ذہن ست۔ گاہے ریختہ می گوید۔ و یا وصف تو مشقی بعضے شعرش دل نشین می افتد۔ از عہد محمد شاہ فردوس آرمگاہ حسب الطلب نواب نوازش محمد خان شہامت جنگ وارد مرشد آباد شدہ۔ دراں بلدہ سکے اختیار کردہ۔'' [۸۹]

پھر ان کے دو شعر نقل کئے ہیں:

مرزا محمد عسکری تخلص عیشؔ مرشد آباد میں رہتے تھے۔ صاحب دیوان تھے۔ ''گلشن ہند'' میں ان کے چند اردو اشعار درج ہیں۔[۹۰]

مرزا محمد علی تخلص فدویؔ معروف مرزا بھجو، شاہ جہان آباد کے رہنے والے تھے لیکن انہوں نے کچھ عرصہ مرشد آباد میں بسر کیا۔ اردو شاعری میں استاد تھے۔ تلاش معنی میں فکر رسا رکھتے تھے اور بیان حسن میں دل دردآشنا۔ زبان ریختہ میں شاعر شیریں بیان تھے۔[۹۱]

تخلص علی خان نام، تخلص مخلصؔ مرشد آباد کے مشہور شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مخلصؔ کی کل کائنات ان کا قلمی دیوان ہے۔ اس کے علاوہ ان کے کسی اور ادبی سرمایہ کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ ایشیاٹیک سوسائٹی کے کتب خانے خطی نسخے میں ۱۳۱ غزلیں اور چھ مخمس ہیں۔[۹۲]

علی ابراہیم کہتا ہے: ''دیوان مخلص بطور اساتذہ ترتیب دیا لیکن کثرت عیش سے از بسکہ دھیان رہا کہیں کا کہیں ہے۔ کلام ان کا خالی لغزش سے نہیں ہے۔'' [۹۳]

مائلؔ تخلص، محمدی دہلوی، شاہ عالم کے زمانے میں مرشد آباد کے شعرائے اردو میں سے تھے۔[۹۴]

خواجہ محمد محترم کے بارے میں علی ابراہیم کہتے ہیں: ''در عالم محبت یکتا و بموزونی اشعار طبعش رسا بود''۔ نواب میر قاسم کے منسلکان میں سے تھے۔ [۹۵]

حمایت علی مجنونؔ کا اصل وطن دہلی اور جائے مسکن مرشد آباد تھا۔ شاہ قدرت علی قدرتؔ سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ نواب مبارک علی خان مبارک الدولہ کے حکم پر ''ساقی نامہ'' نظم کی۔ مجنونؔ کی اردو شاعری کے بارے میں علی ابراہیم لکھتے ہیں: ''از نظم ریختہ سلیقہ دوستی دارد[۹۶]

شیخ علی قلی دہلوی، تخلص ندیمؔ، اشرف علی خان فغان کے استاد تھے۔ دہلی سے مرشد آباد آئے اور نواب میر جعفر خان کے دربار سے منسلک ہو گئے اور اسی دوران میں وفات پائی۔ اکثر مرثیہ لکھتے تھے۔[۹۷]

میر مبارک علی دہلوی، تخلص والہؔ، شاہ قدرت اللہ قدرتؔ کے بیٹے تھے۔ ''از موزونیت طبع و فیض صحبت شاہ مذکور ریختہ می گوید'' اور مرشد آباد میں رہتے تھے۔ [۹۸]

ہمدم، میر محمد حیات حسرتؔ کے بیٹے تھے۔ شاہ قدرت اللہ قدرتؔ اور مرشد آباد کے دیگر اساتذہ سے اشعار میں اصلاح لیتے تھے۔[۹۹]

مندرجہ بالا کے علاوہ مرشد آباد کے شعراء کا ذکر کرتے ہوئے ''گلشن ہند'' میں شیخ عابد تخلص دلؔ، شاہ حمزہ علی تخلص زندؔ، میر محمد سلیم تخلص سلیمؔ، میر شاہ علی خان دہلوی، سید عبدالولی تخلص عزلتؔ، شاہ رکن الدین تخلص عشقؔ اور میر علی تقی تخلص کافرؔ کے نام بھی مذکور ہیں۔

مندرجہ بالا کے علاوہ نساخؔ نے اپنے تذکرے ''سخن شعراء'' میں انیسویں صدی، مرشد آباد میں دیگر اردو شعراء کا ذکر کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:۔

سید عبدالوہاب تخلص بیکلؔ شاگرد میر عبدالولی عزلتؔ، میر محبّ علی مرشد آبادی، مولوی احمد علی لکھنوی تخلص سخنورؔ، میر محمدی شرف خلف سید جعفر خان صوبہ دار مرشد آباد، میر فضل علی فدویؔ،

میر مرتضے قلی خان تخلص فراقؔ، حکیم فصیح العالم فصیحؔ، نظیر احمد فوقؔ، خواجہ فدا علی مثبتؔ، عجائب رائے تخلص منشی شاگرد قدرت اللہ قدرتؔ، نواب مہدی علی خان مہدیؔ، میر احمد علی نالاںؔ، مرزا محمد ولی تخلص ولیؔ وغیرہ۔

ہوگلی میں اردو (انیسویں صدی تک)

اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ضلع ہوگلی بھی اردو شاعری کا ایک مرکز بن چکا تھا۔ دہلی میں افراتفری پھیلنے کے بعد وہاں سے مسلمانوں کے کئی گھرانے بنگال میں آ کر ضلع ہوگلی اور اس کے گرد و نواح میں آباد ہو گئے۔ ہوگلی کے شعراء میں قاضی صادق علی خان اختر سب سے نامور ہوئے ہیں۔

قاضی محمد صادق علی خان اختر ہوگلی میں پیدا ہوئے۔ مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ (۱۸۱۹ تا ۱۸۲۷ء) کے زمانے میں لکھنو پہنچے جو اختر کی فصاحت و بلاغت سے بہت متاثر ہوئے اور انہیں ''ملک الشعراء'' کا خطاب دیا۔

اختر فارسی کہتے تھے اور اردو میں بھی شعر روانی کے ساتھ موزوں کرتے تھے۔ لکھنو میں ناسخ، آتش اور انکے شاگردوں کا زمانہ تھا۔ دہلی میں ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ ان کے ہم عصر تھے۔ اختر نے ایک تذکرہ فارسی شعراء کا موسوم بہ ''آفتاب عالم تاب'' لکھا تھا۔ جس سے نواب صدیق حسن خان کو ''شمع انجمن'' کی تالیف میں بڑی مدد ملی۔ اختر نے غازی الدین حیدر کی توصیف میں ایک کتاب ''محامد حیدری'' لکھی تھی۔ ''مطلع العلوم مجمع الفنون'' ان کی تالیف سے ہے یہ فارسی میں لکھی گئی تھی۔ اور منشی نولکشور نے اس کا اردو ترجمہ شائع کیا تھا۔ مثنوی ''سراپا سوز'' بزبان اردو ایک رنگین رومانی داستان ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تالیفات میں

دیوان فارسی، دیوان اردو، گنج نیرنج، گلدستہ محبت، بہار بی خزن، بہار اقبال اور ہفت اختر شامل ہیں۔[100]

ہوگلی کے دیگر اہم اور نامور شعراء میں عصمت اللہ خان انسخ کا نام آتا ہے جو ناسخ کے شاگرد تھے۔ وہ نہ صرف شاعر تھے بلکہ ان کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے۔ انسخ صاحب دیوان تھے۔ لیکن اب ان کا دیوان ناپید ہے کبھی کبھی مجبورؔ بھی تخلص کرتے تھے۔ انسخ کی شاعری کے متعلق مولانا وحشتؔ مرحوم لکھتے ہیں۔ ''ان کا دیوان راقم کی نظر سے گزرا۔ کلام لکھنو کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ مگر استادانہ پہلو لئے ہوئے، زبان شستہ، بندش چست، مضمون بلند، غرض مرصع غزلیں لکھی ہیں''۔[101]

ناسخ کے بیان کے مطابق :

''ذہن مستقیم رکھتے ہیں۔ شعر و سخن بہت شوق ہے۔ ادا بندی سے نہایت ذوق ہے۔ بڑے پرگو ہیں۔ اور شعر اچھا کہتے ہیں۔[102] بنگالہ میں ان کی شاعری کا بڑا چرچا تھا۔[103]

سید لطیف الرحمٰن کہتے ہیں، ''انسخ کے کلام میں مبتذل خیالات نہیں پائے جاتے ہیں۔ بلکہ ان کی ہر غزل میں دو ایک مولویانہ شعر ملتے ہیں۔''[104]

ان کی ایک تصنیف '' طومار اغلاط'' موجود ہے۔ یہ ایک تنقیدی کتاب ہے جس میں انہوں نے لکھنوی کے شاعر امام بخش ناسخ اور ان کے شاگردوں کے کلام پر کڑی تنقید کی ہے۔ دوسرا غیر مطبوعہ رسالہ ''خرزن'' ہے یہ رسالہ کلکتہ ایشیاٹیک سوسائٹی میں محفوظ ہے۔ بنگالہ اور بہار میں ان کے شاگردوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔[105]

انسخ کے شاگردوں میں منشی باقر رضا باقرؔ، منشی عبدالسبحان شاکرؔ، منشی تراب علی جودتؔ، مولوی

عبدالحمید، مولوی عبدالعزیز خواجہ، منشی عبدالعزیز عزیز، منشی قادر بخش مغفور، حافظ عبدالشکور مرحبا، سید ہمت علی ہمت شامل ہیں۔ جو اپنے زمانے کے اچھے شعراء میں شامل ہوتے تھے۔[106]

ہوگلی کے شعراء میں لالہ کہیم نرائن رند کو بھی اچھا مقام حاصل ہے۔ ''سخن شعراء'' میں نساخ نے رند کے بارے میں یوں لکھا ہے۔:

> ''رند تخلص، لالہ کھیم نرائن کھتری دہلوی نبیرۂ راجہ لچھمن نرائن مہاراجہ ٹکیٹ بہادر کے رفیق تھے۔ طب میں اچھا دخل رکھتے تھے۔ بیشتر فارسی کہتے تھے۔ کلکتہ آئے تھے آخر ایام میں ہوگلی میں سکونت کی تھی۔''

قیام کلکتہ جب وہ فورٹ ولیم کالج سے وابستہ تھے صاحبان کونسل کی فرمائش فارسی میں ''فتوحات حیدری'' لکھی جس کا ترجمہ شیخ احمد علی گوپاموئی نے ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۷۵۷ میں اردو میں کیا اور ''واریخ گزیدہ'' کے نام سے شائع کیا۔ وہ شاعر اور نثر نگار تھے۔ شاعر کی حیثیت سے انہوں نے اپنی کوئی یادگار نہیں چھوڑی غالباً انہوں نے اپنا دیوان مرتب نہیں کیا ورنہ صاحب تذکرہ ''سخن شعراء'' ان کا ذکر یقیناً کرتے۔ اگر وہ اپنی مشق سخن پر زیادہ توجہ دیتے تو اچھے اور کامیاب شاعر ہوتے۔ ان کے اندر اچھے شاعر بننے کی تمام صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ان کے بھائی بنی نرائن جہان نے اپنے تذکرے میں بھائی کا حال لکھا ہے۔ اور ان کی غزلیں بھی نقل کی ہیں۔[107]

ہوگلی کے ایک اور قابل ذکر شاعر منحور ہیں۔ منشی اسداللہ نام، عرف علی جان اور تخلص منحور تھا۔ والد کا نام حیدر تھا جو شاعر بھی تھے اور حیدر تخلص کرتے تھے۔

منحور اردو، فارسی دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ اور شعر بھی موزون کرتے تھے۔ منحور کی شاعری کے متعلق ڈاکٹر صدرالحق کہتے ہیں۔ ''منحور کی شاعری میں سادگی بھی ہے۔ سرمستی اور سرخوشی بھی ہے۔ مے پرستی کا ذکر اور بادہ پرستی کی خواہش کا اظہار بھی ہے۔ شوخی و بے باکی ، حسن و عشق اور لکھنوی انداز کے غمزے اور کرشمے پائے جاتے ہیں۔''[108]

نساخ ان کے متعلق لکھتے ہیں'' طبع ارجمند دارد'' عبدالباری آسی لکھتے ہیں۔ ''نہایت پختہ مشق اور صاحب دیوان تھے۔ مگر کلام اب ناپید ہو گیا۔''[109]

امید علی خان امید، علی خان جہان کے بیٹے ہوگلی کے شعراء میں سے تھے۔ امید کی شاعری روایتی غزل گوئی کے حصار میں بند رہی۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں گل وبلبل وہجر وصال کی خیالی تڑپ اور کسک کو سمونے کی کوشش کی۔ مگر تغزل کی کمی نہیں۔ کلام میں سوز وگداز بھی ہے۔ انہوں نے میر کے طرز پر غزلیں کہنے کی کوشش کی ہے۔[110]

ہوگلی کے شعراء میں منشی حیدر علی حیدر، امید علی خان امید، منشی قادر بخش مفتون، شیخ باقر فنا، ،مولوی مظہر وصل، منشی محمد والی، منشی حسین علی بیدل، نواب جان فخر، منشی محمد مقیم مقیم، خواجہ نجف علی خواجہ وغیرہ چند اہم نام ہیں۔ ان میں لالہ کھیم نرائن رند کو بھی استاد کا مقام حاصل رہا ہے۔[111]

ٹمیابرج میں اردو (انیسویں صدی تک)

ٹمیابرج میں اردو کی شمع نواب واجد علی شاہ نے روشن کی۔ جو ۱۷ فروری ۱۸۵۶ع میں الحاق اودھ کے بعد کلکتہ کا ادارہ کر کے لکھنو سے یہ کہتے ہوئے روانہ ہوئے:

درودیوار پرحسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے وطن ہم تو سفر کرتے ہیں۔

۱۳مئی ۱۸۵۶ کو مٹیا برج کلکتہ پہنچے۔ ۱۸۵۷ میں ہندوستان میں غدر شروع ہوا تو واجد علی شاہ پر بھی آفت آئی وہ اپنے گوشۂ عافیت میں، انتزاع سلطنت کے بعد صبر وشکر کی زندگی بسر کررہے تھے۔لیکن انگریز واجد علی شاہ سے کھٹک رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں واجد علی شاہ کو کو قید کر دیا۔چھبیس مہینے بعد ۹ جنوری ۱۸۵۹ میں انہیں قید سے رہائی حاصل ہوئی اور مٹیا برج میں رہنے لگے۔[112]

واجد علی شاہ خود بھی بڑے اور اچھے شاعر تھے۔ جملہ اضاف سخن پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ غزل، مثنوی، مخمس، مسدس، رباعی، سلام، مرثیہ ہر رنگ میں ان کی انفرادیت قائم ہے۔ زبان پر انہیں غیر معمولی دسترس حاصل تھی خیالات پر باندھے ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ان کے منہ سے نکلا ہر بول سند تھا۔ بدیہہ گوئی ان کی خصوصیت تھی ان کی شاعری وہ رفعت اور سوز وگداز نہیں جو زمانے کے ستانے، دکھوں کے مارے، پریشان حال اور آشفتہ روزگار ناکام و نامراد شاعروں کی خصوصیت ہے ان کی زندگی یکسر عیش ونشاط تھی ان کی شاعری بھی زندگی کے اسی رخ کی ترجمان ہے لیکن زبان کی صفائی اور صحت، بندش کی چستی، خیالات کی روانی، ترکیب کی تراش خراش میں وہ خود اپنی مثال تھے۔[113]

علاوہ اردو کے ٹھیٹ ہندی میں بھی ان کا کلام موجود ہے اور ان کی بنائی ہوئی ٹھمریاں اور دوہے وغیرہ جس میں وہ ''جان عالم پیا'' تخلص کرتے تھے۔اب تک لکھنو میں زبان زد خاص وعام ہیں۔[114]

دیوان اور مثنویوں کے علاوہ ان کے خطوط بھی بہت دلچسپ ہیں جو انہوں نے قیام کلکتہ کے زمانہ میں اپنی محبوب بیوی نواب زینت محل کے نام لکھے تھے۔ یہ خطوط بادشاہ کی اجازت سے مقفٰی اور مسجّٰی دیباچہ کے ساتھ اکبر علی خان توقیر نے جو بادشاہ کے منشی تھے جمع کئے یہ خطوط بترتیب جمع کئے گئے ہیں اور ان میں اکثر شاعرانہ انداز کے ساتھ نہایت محبت اور اخلاص سے اپنا اشتیاق اور لکھنو کی یاد کا دردانگیز صورت میں بیان کیا ہے۔[115]

ان کی تصنیف حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ چھ دیوان جن میں شیوع فیض، قمر مضمون، سخن اشرف، گلدستہ عاشقان، ماہ ملک۔ نظم نامور شامل ہیں۔
۲۔مثنویاں جن میں حزن اختری خطابات، محلات، نبی، ناجو، دلہن، مثنوی در فن موسیقی، دریائے تعشق وغیرہ ہیں۔
۳۔مراثی
۴۔قصائد اردو و فارسی
۵۔مباحثہ بین النفس والعقل
۶۔صحیفۂ سلطانی
۷۔نصائح اختری
۸۔ عشق نامہ
۹۔رسالہ ایمان در بیان مصائب اہل بیت
۱۰۔دفتر پریشان
۱۱۔مقتل معتبر

۱۲۔دستورواجدی درسیاست مدن

۱۳۔صورت المبارک

۱۴۔ہیبت حیدری

۱۵۔جوہرعروض

۱۶۔ارشادخاص

آخردوکتابیں فن عروض پر ہیں۔

مختصر یہ کہ ان کی تصانیف کی ۴۰ ہوں گی۔اصلاح سخن میر مظفر علی اسیرؔ اورنواب فتح الدولہ برقؔ سے لیتے تھے۔[۱۱۶]

واجدعلی شاہ کے زمانے میں مٹیا برج شعروسخن کا مرکز بن گیا۔وہ شعرائے لکھنو جولکھنو میں انکے دامن دولت سے وابستہ تھے ان میں سے بعض تو اپنے آقائے نامدار ہی کے زمانے میں اور بعض غدر کے بعد جب کسی قدر تسلط اورامن وامان ہوگیا راہی کلکتہ ہوئے۔ان سات بڑے شاعروں کوجومٹیا برج میں ان کے ساتھ تھے۔’’سبعہ سیارہ‘‘ کا خطاب دیا تھا۔

ان میں سے ہرایک بڑے بڑے معزز شاہی خطاب سے سرفراز تھا۔ان لوگوں کی وجہ سے مٹیا برج کی صحبتوں میں بڑی گرما گرمی تھی۔مشاعرے آئے دن ہوا کرتے تھے اورمٹیا برج سواد کلکتہ نہیں بلکہ لکھنو کا ایک محلّہ معلوم ہوتا تھا۔

رئیس احمد جعفری مٹیا برج کی اس حالت کا نقشہ یوں اتارتے ہیں:

> لکھنواجڑ گیا تھا۔مگراس کے منتخب صاحبان کمال وہاں پہنچ کے ظل اللہ جہان پناہ کے سایۂ عاطفت میں دریائے بھاگرتی کے کنارے

> بس گئے تھے۔مٹیا برج نہ تھا بلکہ دربار مغلیہ اودھ اور ہندوستان کے اسلامی تمدن کی آخری شمع بنگالہ کے ایک کونے میں روشن ہوئی تھی۔چونکہ بجھنے کو تھی لہذا اکثر اوقات چراغ سحر کی طرح بھڑک بھڑک کر زیادہ نورانیت دکھا دیتی تھی۔[۱۱۷]

ان سبعہ سیارہ میں فتح الدولہ برقؔ،مہتاب الدولہ درخشاںؔ،مرزا مستیا عیشؔ،آغا حجوؔ شرف، مرزا امداد علی یاورؔ،مظفر علی ہنرؔ،گلشن الدولہ میرزا علی بہار، مالک الدولہ صولتؔ، شیخ صادق علی مائلؔ،مرزا جہان قدر نیرؔ،مرزا آسمان جاہ انجمؔ، حامد علی مرزا کوکبؔ ولی عہد اودھ شامل تھے۔محل میں مخدوہ عظمی نواب بادشاہ محل متخلص بعالمؔ عرف نواب خاص محل کا سب سے اول تھا۔

ان کی تصنیف میں سے ایک دیوان ’’بیاض عشق‘‘ اورایک مثنوی بہت پیاری زبان میں مطبوعہ ہے۔[۱۱۸]

اس پرلطف مجمع میں داغؔ اورنظم طباطبائی بھی پہنچ گئے صحبتوں اورمشاعروں سے اردو زبان اور اردوشاعری کا بنگال میں بہت چرچا ہوگیا۔[۱۱۹]

ٹالی گنج میں اردو (انیسویں صدی تک)

انیسویں صدی میں ٹالی گنج جنوبی کلکتہ بھی اردوشعروادب کا گھر رہا ہے۔یہاں انگیریزوں نے شہید ٹیپو سلطان کولا کر قید کیا تھا۔اس طرح یہ علاقہ جو پہلے ضلع ۲۴ پرگنہ کے مشہور جنگل ستدرین کا ہی حصّہ تھا آہستہ آہستہ آباد ہوتا گیا۔میسور خاندان کے شہزادوں کی علم دوستی سے اردوشاعری کا چراغ یہاں بھی روشن ہوا۔یہ شہزدے اپنے اپنے محل سراؤں میں مشاعرے

منعقد کراتے جو اس زمانے میں رئیسوں کی شان سمجھی جاتی تھی۔ میسور گھرانے کی علم دوستی کی وجہ سے کئی عالم ٹالی گنج میں آکر رہے۔ مٹیا برج کی طرح ٹالی گنج میں بھی طباطبائیؔ کے کئی شاگرد تھے۔

ٹیپو سلطان کے خاندان کے شاہزادوں میں ابراہیم رسا کے علاوہ شہزادہ احمد کیوانؔ بھی ان کے شاگرد تھے۔ شہزادوں کے علاوہ تالی گنج کے دیگر شعرائے انیسویں صدی میں تمیز الدین احمد شرفؔ، سید فتح علی فرخؔ، آغا مرزا علی نجم اور منشی نثار حسین نثارؔ بھی نظم طباطبائی کے شاگردوں میں رہے ہیں۔ ۱۲۰

ان شعراء کے علاوہ ٹالی گنج کے نامور شعراء میں میر وزیر علی نامی شاگرد آغا جو شرف، فخر الدین عرف بابو میاں متخلص بہ روشنؔ، صاحبزادہ عظیم الدین نواسہ ٹیپو سلطان متخلص بہ سلطانؔ، صاحبزادہ محمد شاہ عالم، مولوی سید نجم الدین نادرؔ، صمصام حیدر نورؔ شاگرد ناسخؔ، حاجی قمر الدین خوش دل، منشی حسن علی حسن بیدلؔ شاگرد رشید النبی وحشتؔ وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ ۱۲۱

ٹالی گنج کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ وہاں مرزا غالبؔ کے ایک لائق شاگرد بشیر الدین توفیقؔ تھے۔ توفیقؔ ٹیپو سلطان شہید کے فرزند شکر اللہ سلطان کے بیٹے تھے۔ ''خطوط غالب'' میں پانچ خطوط توفیقؔ کے نام ہیں۔ مالک رام نے بھی توفیقؔ کا ذکر بطور شاگرد غالبؔ کیا ہے۔ ۱۲۲ غالب کے ایک دو اور شاگرد بھی ٹالی گنج میں آکر بس گئے تھے۔ ان میں نادر خان شوخیؔ رامپوری اور فخر الدین حسن سخنؔ دہلوی دو ایسے نام ہیں جن کا رشتہ ٹالی گنج سے اٹوٹ ہے اور جو اپنے دور کے ممتاز شعراء میں تسلیم کئے گئے۔ نادر خان شوخی رامپوری کا ذکر مولانا ابو

الکلام آزاد نے بھی کیا ہے۔ ۱۲۳

سخن دہلوی رشتے میں غالب کے نبیرہ ہوتے ہیں۔ ان کا انتقال ۱۹۰۰ء میں کلکتے میں ہوا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی میں میسور گھرانے کے شہزادوں کا تالی گنج میں بس جانے سے وہاں کا ماحول بھی شعروسخن کے لئے سازگار ہوا اور وہاں کی مٹی سے کئی شعراء افق ادب پر ابھرے۔

ڈھاکہ میں اردو (انیسویں صدی تک)

ڈھاکہ نہایت قدیم اور تاریخی شہر ہے لیکن مغل دور حکومت میں ہی اسے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی۔ ۱۶۰۸ میں مغل سپہ سالار اسلام خان یہاں کے صوبہ دار متعین ہوئے اور اسلام خان نے شہنشاہ جہانگیر کے نام پر اس علاقے کا نام جہانگیر نگر رکھا۔ اورنگ زیب کے زمانے تک یہ نام یوں بھی برقرار رہا لیکن رفتہ رفتہ یہ علاقہ ڈھاکہ کے نام سے موسوم ہو گیا۔ ۱۷۰۴ میں مرشد قلی خان نے ڈھاکہ کو خیر آباد کہا اور مرشد آباد کو بنگال کا پایہ تخت بنا دیا۔ جس کی وجہ سے ڈھاکہ کی رونق میں قدرے کمی واقع ہوئی۔ لیکن انگیریزوں کی آمد کے بعد ۱۸۰۱ء میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو ڈھاکہ، کلکتہ سے نزدیکی کے باعث اپنی پرانی عظمت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور انیسویں صدی میں ڈھاکہ میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں خواجہ خاندان نے جو کردار ادا کیا وہ ناقابل فراموش ہے آج ڈھاکہ میں اردو کا چرچا ہے یہ زیادہ تر اس خاندان کی بدولت ہے ان میں پہلے قابل ذکر خواجہ حیدر جان شائقؔ ہیں۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ عبدالغفور نساخ '' تذکرۃ المعاصرین''

میں ان کے بارے میں کہتے ہیں۔
بہر دو زبان فارسی و ریختہ اشعار بامزہ می گوید۔[124] اپنے دوسرے تذکرے ''سخن شعراء'' میں کہتے ہیں ''شعر فارسی اور اردو ان کے پر دور ہوتے ہیں۔''[125]

حکیم حبیب الرحمٰن "ثلاثہ غسالہ" میں ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔
''شاعر مقبول اور نغز گفتار تھے۔''[126]

شائق بذریعہ مراسلت مرزا غالبؔ سے شاعری میں اصلاح لیتے تھے۔ غالب نے کلکتے کے احباب کو فارسی میں جو خطوط لکھے قاضی عبدالودود نے ان خطوط کو ''آثار غالب'' کے نام سے شائع کیا اس مجموعے کے کم از کم چار خطوں میں شائقؔ کا ذکر ہے۔[127]

عبدالرحیم صباؔ عرف پہنچا میاں کو اردو و فارسی میں اچھی دستگاہ حاصل تھی۔ ہر دو زبان میں شعر خوب کہتے تھے۔ حکیم حبیب الرحمٰن ''ثلاثہ غسالہ'' میں ان کے متعلق کہتے ہیں۔ وہ خاندان خواجگان میں بہترین ناثر و ناظم تھے۔ ان کا سرمایہ فارسی میں ہے۔ لیکن اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ اور استادانہ قابلیت دکھاتے تھے۔[128]

خواجہ اسد اللہ کوکبؔ اردو و فارسی دونوں زبانوں میں شعر گوئی کرتے تھے۔ رحمان علی طیش مصنف'' تواریخ ڈھاکہ'' ان کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔'' ان کا کلام نہایت پاکیزہ ہے۔[129]

خواجہ عبدالغفار کا تخلص فارسی میں وفاؔ۔ ریختی میں نزاکتؔ اور اردو میں اخترؔ تھا۔ مرزا غالب سے انہیں عقیدت تھی اور ان سے بذریعہ خط و کتابت اکثر و بیشتر اپنی غزلوں میں اصلاحیں بھی

لی ہیں۔ مرزا غالب سے اپنی عقیدت کا اظہار اس شعر میں یوں کیا ہے۔:

داد غالبؔ بھی تجھے دیں گے زباندانی کی
لے کے اخترؔ جو یہ دلی میں غزل جائیگا۔[130]

خواجہ احسن اللہ شاہینؔ کا اردو اور فارسی کلام ''کلیات شاہین'' کے نام سے ۱۲۶۔ ثلاثہ غسالہ، ص ۲۳۷ چھپ چکا ہے۔ جن میں فارسی کے علاوہ بیشتر غزلیں اردو کی ہیں۔ نثر میں ان کی یادگار عبدالرحیم صباؔ کی فارسی کتاب ''تاریخ کشمیریان ڈھاکہ'' کا اردو ترجمہ ہے۔ کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ اس کا نام ''تواریخ خاندان کشمیریہ'' رکھا۔ یہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے خواجہ خاندان کی ادبی، سماجی و ثقافتی تاریخ کے بہت سے گوشے بے نقاب ہوتے ہیں۔

خواجہ احمد افضل کا تخلص افضلؔ تھا۔ ان کو تاریخ گوئی پر بہت دسترس حاصل تھی۔ چلتے پھرتے فی البدیہہ قطعہ تاریخ لکھے ڈالتے۔ اس لئے آپ ''افضل المورخین'' کے نام سے مشہور تھے۔ انہوں نے داغؔ دہلوی کے انتقال پر اکہتر تاریخیں لکھیں۔ نواب سر احسن اللہ کی رحلت پر بیاسی (۸۲) اور نواب بیگم سر احسن اللہ کی وفات پر جو قطعات تاریخ لکھیں۔ ان کے مجموعہ کا نام ''غم ماہ پیکر'' رکھا۔ علم عروض پر بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ کچھ اردو غزلیات بھی ان کی یادگار ہیں۔[131]

خواجہ عتیق اللہ تخلص شیداؔ عرف شہزادے میاں اردو و فارسی دونوں زبانوں میں شعر آزمائی کرتے تھے۔ انہوں نے ایک رسالہ ''بیت بخشی'' بھی نظم کیا۔ اشعار کا خاتمہ لام پر ہوتا ہے۔ شیدا کو نثر نگاری پر بھی عبور حاصل تھا۔ انہوں نے تین ناول'' افسانہ عبرت خیر، دہی چود

ہرائن اورخدا کی شان'' لکھے۔ان کی نثر نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے وفا راشدی کہتے ہیں:

''شیدا ایک اچھے انشا پرداز بھی تھے اور مشہور ناول نگار بھی ۔ان کا شہرت یافتہ ناول ''افسانہ عبرت خیز'' دہلی اور لکھنؤ جیسی زبان کی خصوصیات کے لحاظ سے ایک شاہکار ہے''۔ ۱۳۲

خواجہ محمد اصغر کی نثری تصنیف '' جنگ ہفت سالہ'' ہے۔جس کا موضوع آزادی امریکہ کی جد وجہد ولڑائی ہے۔

خواجہ محی الدین عرف محمد اشرف نے رینالڈس کے ناول '' مڈلٹسن'' کا اردو ترجمہ بنام ''خوبی قسمت'' کیا۔جونثر کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

خواجہ نور اللہ نے مچھلی کے شکار کے مختلف طریقے، مچھلی کی خوراک، اس کی اقسام، شکار کے موسم، ڈور اور ہسی کی قسمیں بیان کرتے ہوئے۔ ''مچھلی نامہ'' لکھی۔لیکن یہ کتاب ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔

خواجگان کے علاوہ ڈھاکہ میں اردو کی خدمت کرنے والوں میں سرفہرست حافظ اکرام احمد ضیغم ہیں۔وہ ان برگزیدہ اور غیر معمولی ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کی بدولت اس صوبہ میں شعر وشاعری کا شوق عام ہوا۔اس صوبہ (بنگلہ دیش) کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں ان کے تلامذہ کا سلسلہ اب تک موجود نہ ہو۔وہ اپنے زمانے میں پورے بنگال پر چھائے ہوئے تھے۔اس زمانے میں حافظ صاحب کی علمیت، مشق سخن، تجزیہ اور فن کا کوئی دوستا حاصب کمال کہیں آس پاس نہ تھا۔۱۳۳

غزل کے علاوہ ضیغم ہزل، ریختی اور مرثیے بھی کہتے تھے۔اور ان تینوں اصناف میں مہمان تخلص کرتے تھے۔علم عروض کے صرف ماہر ہی نہ تھے بلکہ مجتہد بھی تھے۔اور مختلف صنعتوں

میں شعر کہتے تھے۔مشکل سے مشکل زمینوں کا انتخاب کر کے ان میں غزل کہتے اور صاف شعر نکالتے۔بنگال کو فخر ہے کہ عروض کا اتنا بڑا ماہر و مجتہد اس کے حصے میں آیا۔۱۳۴

ڈھاکہ میں انیسویں صدی کے ادبی حلقوں میں مرزا جان طپش کو ایک خصوصی مقام حاصل ہے۔وہ فورٹ ولیم کالج کے ایک نامور شاعر تھے۔ڈھاکہ میں اپنے قیام کے دوران انہوں نے ادبی چرچوں سے اس سرزمین کو مہکایا۔اور نواب شمس الدولہ کی فرمائش پر ۱۷۹۳ میں اردو محاورات روزمرہ اور ضرب الامثال پر مبنی ایک کتاب لکھی اور اپنے مربی کے خطاب کی مناسبت سے اس کتاب کا نام ''شمس البیان فی مصطلاحات الہندوستان'' رکھا۔یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۸۴۹ء/ ۱۲۶۵ھ میں مطبع آفتاب عالمتاب، مرشدآباد سے چھپی۔۱۳۵

طپش ڈھاکہ میں اردو اسکول کے بانی تھے۔ان کی ڈھاکہ آمد سے پہلے اردو شعر وادب کا میدان سنسان نظر آتا ہے۔لیکن انہوں نے اپنے ادبی کارناموں سے ڈھاکہ میں اردو کو مقبول بنایا اور ان کے شاگردوں نے اردو زبان وادب کی بیل کو مزید پروان چڑھایا۔مرزا غلام حسین آتش طپش کے شاگرد اور داماد تھے۔آتش کے سلسلہ سے مولوی فرجام علی بیخود، شیخ احمد جان عطش، موموی رحمان علی طیش اور مرزا الطیف گستاخ کے نام قابل ذکر ہیں۔۱۳۶

فورٹ ولیم کالج کلکتہ قیام کے دوران انہوں نے ۱۸۰۲ء/ ۱۲۱۷ھ مثنوی '' بہار دانش'' لکھی۔یہ پہلی مرتبہ ۱۸۳۷ء/۱۲۵۵ھ میں مطبع محمدی کلکتہ سے چھپی، طپش سے ایک اور اردو منظوم داستان '' قصہ یوسف زلیخا'' بھی منسوب ہے لیکن اس قصہ کا کہیں وجود نظر نہیں آتا۔

نواب سید محمود آزاد ۱۸۴۳ء میں ڈھاکہ میں پیدا ہوئے۔ابتدائے شاعری میں شیدا تخلص کرتے تھے۔بعد ازاں آزاد تخلص اختیار کیا۔مشہور مزاح نگار اور نامہ نگار ''اودھ پنچ

سید محمد آزاد کے بڑے بھائی تھے۔ابتداء میں آقا احمد علی اصفہانی اور پھر حافظ اکرام احمد ضیغم کے شاگرد ہوئے۔کہا جاتا ہے وہ غالب کے بھی شاگرد تھے۔[۱۳۷]

آزاد کا دیوان ۱۸۸۹ء میں مرشد آباد سے چھپا۔صفحات کی تعداد ۱۲۲ ہے جس کی کل ۱۳ غزلیں اور پانچ رباعیات ہیں۔اور باقی صفحات فارسی غزلیں ہیں۔اس کی سختی کے باوجود اردو کلام متانت،فصاحت،بلاغت،روانی،پختگی،نشست الفاظ کی ترتیب اور مضمون آفرینی سے مملو ہے۔اور یہ وہ خوبیاں ہیں جن کی بنا پر انہیں نہ صرف فارسی بلکہ اردو شاعری میں بھی ممتاز مقام حاصل ہے۔[۱۳۸]

سید محمود آزاد ۱۸۴۶ء میں ڈھاکہ میں پیدا ہوئے ان کو شعر گوئی کا شوق نہ تھا۔آزاد ان قلمی نام تھا۔آزاد گذشتہ صدی کے بہترین انشا پردازوں میں تھے۔اوران کے مضامین ''اودھ پنچ'' لکھنو کے علاوہ ''آگرہ اخبار'' آگرہ،''مشیر قیصر'' لکھنو، ''اکمل الاخبار'' دہلی،'' دوربین''، دہلی اور کلکتہ کے انگیریزی اخبار''رئیس اینڈ رعیت'' میں شائع ہوتے تھے۔

''خیالات آزاد'' ان کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔''نوابی دربار'' ایک ڈرامہ ہے۔یہ ڈرامہ اپنے وقت کے مقبول ترین ہفتہ وار اخبار ''اودھ پنچ'' میں قسط وار چھپتا تھا۔

نوابی دربار اردو کا پہلا نثری ڈرامہ ہے عبد الغفور شہباز اسکے بارے میں لکھتے ہیں۔

''اردو زبان میں ''نوابی دربار'' سب سے پہلا فسانۂ مکالمت ہے۔فسانۂ مکالمت سے میری مراد ڈراما ہے جس کو ہندی میں ناٹک کہتے ہیں۔ممتاز منگلوری اس ڈرامے کے بارے میں میں کہتے ہیں۔'' اردو ڈرامے کی دنیا میں اس کے چالیس پچاس برس بعد بھی اور کوئی ایسا ڈرامہ نہیں دکھائی دیتا جسے اس کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتے۔'' [۱۳۹]

آزاد کی ایک اور کتاب ''سوانح عمری مولانا آزاد'' ہے۔جس میں مصنف نے مغربی تہذیب کے دل دادہ اور نئی روشنی کے چلتے پرزوں کے خوب خوب پرزے اڑائے ہیں۔ ۱۶۸ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۸۹۱ میں صبح صادق پریس عظیم آباد سے چھپی۔

انکی ایک اور مزاحیہ تصنیف ''نوابی کھیل'' ہے مگر اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔

رحمٰن علی طیش کی تاریخ پیدائش کا پتہ نہیں چلتا مگر سن وفات ۱۳۲۲/۱۹۰۶ ھ ہے۔وہ اچھے مورخ، نثار اور شاعر تھے۔ان کی تصانیف میں ''گلزار نعمت''، ''گلدستہ خیال''، ''گلشن قدرت''، ''مناظر آہن ورز''، ''معرکہ شہر و دیہات'' اور ''دیوان طیش'' ہیں۔''دیوان طیش'' ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔لیکن ان کی معرکتہ الآرا تصنیف ''تواریخ ڈھاکہ'' ہے۔یہ کتاب تاریخی نقطۂ نگاہ سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔جس میں ڈھاکہ کا حدود اربعہ، ہندو راجگان سے لے کر انگریزی حکومت تک ڈھاکہ کی سیاسی تاریخ۔پھر ناظمان ڈھاکہ، اولیائے ڈھاکہ، روسائے ڈھاکہ نوابان ڈھاکہ،شاعران ڈھاکہ اور قدیم وجدید عمارت کا حال درج ہیں۔

احمد حسین وآفر ڈھاکہ محسنیہ مدرسہ میں معلم تھے۔بنگالہ،انگریزی،فارسی،اردو ،ہندی ہر زبان میں شعر کہتے تھے۔[۱۴۰] شعر وشاعری کے علاوہ ان کو ڈرامہ لکھنے کا شوق تھا۔

''پیار بلبل'' ان کا مشہور ڈرامہ ہے۔یہ ڈراما ۱۸۶۷ میں مطبع محمدی ڈھاکہ سے چھپا۔

مولانا عبید اللہ عبیدی۔اکرام احمد ضیغم،سید محمود آزاد اور نساخ کے زمانے میں ڈھاکہ آئے اور یہیں آباد ہوگئے۔عربی،اردو،فارسی تینوں زبانوں میں بہت اچھا شعر کہتے تھے۔صاحب دیوان تھے۔ان کا اردو دیوان جس میں ۸۷ صفحات ہیں ۱۸۸۸ میں مڈیکل پریس آگرہ سے چھپا۔

مندرجہ بالا اصحاب کے علاوہ ڈھاکہ میں شیخ احمد جان عطشؔ، مرزا احمد کوکبؔ، محمد اشرف خان اشرفؔ، شاہ سید برہان اللہ قادری، منشی سید غلام مصطفےٰ، آغا محمد علی، مولانا قدر علی خان، شیخ بنگالی، مرزا غلام حسین، میر حسن مرزا حرقؔ، مرزا لطیف گستاخؔ، شیخ محمد حسین عاصیؔ، منشی وارث علی ضیاؔ، واحد علی مخمورؔ، مولوی عبدالرحمٰن، سید واحدؔ علی خوندکار اور سید محمد باقر طباطبائی کے نام بھی ڈھاکہ کی ادبی تاریخ میں اچھا مقام رکھتے ہیں۔ جنھوں نے اپنی ادبی تحریروں سے ڈھاکہ کی ادبی حثیت کو جاگرو برقرار رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

سلہٹ میں اردو (انیسویں صدی تک)

سلہٹ میں اسلامی تہذیب و ثقافت کی ابتدا آٹھویں صدی ہجری میں حضرت شاہ جلال الدین مجرد رحمہ اللہ کی آمد سے ہوئی۔ اس زمانے میں دہلی کا بادشاہ علاء الدین خلجی (۱۳۱۶۔ ۱۲۹۶ ء / ۷۱۶۔۶۹۵ ھ) اور بنگال کا حکمران شمس الدین فیروز شاہ (۱۳۲۲۔۱۳۰۱ء/۷۲۲۔۷۰۱ ھ) تھا لیکن سلہٹ پر راجہ گوڑ گوبند کی حکمرانی تھی۔ حضرت جلال الدین نے ہندو راجہ گوڑ گوبند کو شکست دے کر اس علاقے کو اسلام سے روشناس کرایا۔

اسلام کی آمد کے بعد دیگر علاقوں کی مانند سلہٹ کی دفتری اور سرکاری زبان بھی فارسی ہی تھی۔ اور بول چال کی زبان مقامی تھی۔ انگریزی دور کے اوائل تک یہی حالت رہی لیکن جب انگریزوں کا سیاسی اقتدار ہندوستان پر مستحکم ہوگیا تو ۱۸۳۷ء میں یہیں فارسی کی جگہ اردو کو دے دی گئی تو سلہٹ بھی اردو سے روشناس ہوا۔ پھر مرشد آباد کے دربار میں دہلی کے

علمائے وفضلاء کے پناہ لینے سے اردو خطہ بنگال میں پھیلی۔ علاوہ ازیں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی وجہ سے اردو کا اثر پھیلا اور وہ بنگال کے مشرقی اضلاع اور ان سے ملحق آسام کے علاقوں تک پھیل گیا۔ سلہٹ کا ضلع بنگال سے ملا ہوا تھا۔ پھر وہاں مسلمان شرفا کی خاصی آبادی تھی۔ اس لئے اردو زبان جلد اس علاقہ میں مقبول ہوگئی۔ چونکہ شروع ہی سے دینی کتابیں اردو میں لکھی جارہی تھیں۔ اس لئے دین اسلام سے دلچسپی رکھنے والے سلہٹی باشندوں نے عربی اور فارسی سے تعلق کمزور پڑنے کے بعد اردو ہی کی پذیرائی کی اور بہت جلد اس سے یگانگت کا سا تعلق قائم کرلیا۔ پھر جب رسل و رسائل کی آسانیاں ہوگئیں اور کاروبار اور حصول علم کے سلسلہ میں بنگال اور آسام کے لوگوں نے دہلی اور اس کے آس پاس کے شہروں میں آنا جانا شروع کردیا تو ان علاقوں میں اردو کے لئے زمین اور ہموار ہوگئی۔ رامپور، لکھنو، دیوبند وغیرہ کے دینی مدارس نے اس کام میں اور بھی سہارا دیا ا ادھر علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم پانے والے بنگالی اور آسامی اردو کو اپنے علاقوں میں منتقل کرنے کا ذریعہ بنے۔ لیکن سلہٹ میں خاص طور پر دینی تعلیم کے لئے اردو نشر و اشاعت کا بڑا ذریعہ بنی اور یہ تمام اثرات چونکہ انیسویں صدی میں پڑے اس لئے ان علاقوں میں تصنیف و تالیف کا باقاعدہ کام انیسویں صدی کے آخری نصف حصہ سے ہوا۔ اس سے قبل جو کچھ ہوا ہوگا وہ بول چال کی حد تک یا چند افراد تک رہا۔ جس کی ادبی اہمیت کچھ نہیں۔[۱۴۱] ذیل میں انیسویں صدی میں اردو کا ایک مختصر سا جائزہ ہے۔

اللہ بخش حامد، اردو، فارسی اور عربی زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ کلام میں مذہبی رنگ غالب ہے۔ ان کی تصانیف حسب ذیل شامل ہیں:

۱۔ تحفۃ الاحباب مطبوعہ ۱۸۳۹ء

۲۔ مسائل ضروریہ مطبوعہ ۱۸۴۵ء

۳۔ قاتل الفجار مطبوعہ ۱۸۵۳ء

۴۔ برہان الموحدین

۵۔ تحفۃ الحسنین مطبوعہ ۱۸۵۹ء

۶۔ دیوان حامد قلی (فارسی وعربی اور اردو کلام کا مجموعہ)

۷۔ لباب العقائد والیقین (قلمی) ۱۸۴۶ء

۸۔ قوائد المومنین فی عقائد اہل الحق (غیر مطبوعہ) ۱۸۵۰ء

حکیم اشرف علی مست شعر وشاعری میں اکرام احمد ضیغم کے شاگرد تھے۔ان کی تصانیف میں حسب ذیل چھوٹے چھوٹے رسالے شامل ہیں:۔

۱۔اشرف البیان فی حکمت الایمات ،۵۶صفحات پر مشتمل کتابچہ جس میں مذہبی مسائل بیان ہیں۔

۲۔ رسالہ چیچک (مطبوعہ ۱۸۶۶ ء)

۳۔ رسالہ طاعون (مطبوعہ ۱۸۶۶ء)

۴۔ رسالہ ہیضہ (مطبوعہ ۱۸۶۶ء)

۵۔ رسالہ دافع سموم

۶۔ رسالہ ترک الصلوۃ

۷۔ رسالہ کشتی۔فن کشتی کے بارے میں (مطبوعہ ۱۸۵۹ ء)

۸۔ رسالہ تصویر غم،مجموعہ غزلیات (مطبوعہ ۱۸۷۴ ء)

۹۔ سراپا۔اس میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک درج ہے۔

۱۰۔ رسالہ کشتہ۔کشتہ جات جا مجموعہ

۱۱۔ رسالہ ردشرک (مطبوعہ ۱۸۴۵ع)

حاجی سعید بخت مجموعہ دار،تخلص بخت حافظ اکرام احمد ضیغم کے شاگرد اور اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔دو تصانیف ان کی یادگار ہیں جن میں ''مخلص العقائد'' مطبوعہ ۱۸۵۵ء اور ''رسالہ موتی''،مطبوعہ ۱۸۴۵ شامل ہیں۔ ''رسالہ موتی'' میں موت اور تجہیز وتکفین کے مسائل درج ہیں۔سعید کے کلام کا قلمی نسخہ بھی موجود ہے۔

حاجی عبداللہ آشفتہ،حافظ اکرام احمد ضیغم کے شاگرد اور اردو فارسی دونوں زبانیں جانتے تھے۔ اچھے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔نساخ کے دوستوں میں سے تھے۔ان کا ذکر نساخ نے اپنے تذکرہ'' سخن شعراء'' میں کیا ہے۔ان کی مثنوی ''گلہ دوستانہ'' قابل ذکر ہے۔

خلیل اللہ خلیل اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔مثنوی،قصیدہ،غزل،مرثیہ، مطائبات، پند، چیستان،ہجو،تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔''کشکول خلیل'' فارسی اور اردو نظموں کا مجموعہ اور ''می باید دید'' فارسی قصیدوں،نظموں اور مثنویوں کا مجموعہ ہے۔

مولوی عبدالکریم نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔جن میں پہلی قابل ذکر ''تاریخ ہند'' ہے جو اردو اور انگریزی دونوں ہی زبانوں میں لکھی گئی۔اس کتاب کی تعریف علامہ شبلی نعمانی،مولانا الطاف حسین حالی،شمس العلماء نواب سید امداد امام اثر اور شاہ عظیم آبادی نے کی ہے۔

مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کی اشاعت ۱۸۹۶ سے ۱۹۳۶ تک سات بار ہوئی۔

ان کی دیگر کتابوں میں ''اسلام اور عروج اسلام'' قابل ذکر ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے بنگلہ، ہندی اور انگریزی میں متعدد کتابیں لکھیں۔

مولوی فرجام علی بیخودؔ، مرزا محمد اسماعیل طپشؔ دہلوی کے شاگرد تھے اور صاحب دیوان تھے۔

صحیفہ بانو، عرف حاجی بی بی (پیدائش ۱۸۵۰ء، وفات ۱۹۲۶ء) اس علاقے کی واحد اردو شاعرہ ہیں۔انہوں نے نعتیں ہی کہیں ہیں۔جن کا مجموعہ ''یادگار صحیفہ'' ہے۔

مذکورہ بالا کے علاوہ سلہٹ میں اردو ادب کی خدمات انجام دینے والوں میں مولوی عبد الرحمان، مولانا اجیر الدین، عبدالمنعم ذزقیؔ۔ محمد حسن حسنؔ۔ حاجی بخت مجموعہ دار، محمد ابراہیم تشنہؔ، علیم اللہ اخگر اور مولانا مبشر علی بشیر کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ بنگلہ دیش میں فرید پور، چٹا گانگ، میمن سنگھ، نوا کھالی، کمیلا اور دیگر حصوں میں بھی اردو کا خوب چرچا رہا ہے۔

حوالہ جات

۱۔شادانی، وجاہت حسین عندلیب۔پیش لفظ سلہٹ میں اردو، (کراچی، انجمن ترقی اردو ۱۹۸۰ء) ص ۱۲

۲۔سلہٹ میں اردو، ص ۶

۳۔بنگال میں اردو وفا راشدی (حیدر آباد مکتبۂ اشاعت اردو ۱۹۵۵) ص ۵

۴۔ایضاً، ص ۵

5. Abdul Karim, Social History of the Muslims in Bengal, (Chittagong Baitush Sharaf, 1985) P. 142

۶۔نساخ، ڈاکٹر محمد صدر الحق (کراچی، انجمن ترقی پسند پاکستان، ۱۹۸۹ع) ص ۱۸

۷۔ڈاکٹر اختر اورنیوی، بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا (پٹنہ لیتھو پریس ۱۹۵۷ء) ص ۴۹_۴۸

۸۔روح ادب (سہ ماہی رسالہ، کلکتہ مغربی بنگال اردو اکاڈمی ۱۹۸۵ء) ص ۱۷

۹۔ ایضا۔ص ۶۹۔۶۷

10. Reverend James Long, Calcutta and its Neighbourhood (Calcutta: Indians Publicatons, 1974) P. 2

11. Ibid. P. 3

۱۲۔ روح ادب، ص ۶۱

۱۳۔ حامد حسین قادری، داستان تاریخ اردو۔ (کراچی، اردو اکیڈمی، ۱۹۶۶م) ص۔ ۹۶_۹۵

۱۴۔رام بابو سکسینہ۔تاریخ ادب اردو، (لکھنو، نول کشور، ۱۹۵۵) ص۔۵۔

۱۵۔ محمد یحیٰ تنہا، سیر المصنفین، (لاہور شیخ مبارک علی) ص۔۴

۱۶۔ تاریخ ادب اردو ص۔ ۶

۱۷۔ تاریخ ادب اردو ص ۷

۱۸۔ عبدالحی، گل رعنا (لاہور، عشرت پبلشند ہائس ۱۹۹۴ء) ص ۳۷

۱۹۔ سخن شعراء، عبدالغفور نساخ (لکھنو، نول کشور، ۱۸۷۴ء) ص ۲۹۲

۲۰۔ مشرقی بنگال میں اردو۔ص ۳۵

۲۱۔ سخن شعراء،ص۲۹۳

۲۲۔ ایضاً، ص۱۹۰

۲۳۔ نساخ۔ڈاکٹر محمد صدرالحق،ص۱۱۰

۲۴۔ بنگال میں اردو،ص۸۷

۲۵۔ رسالہ جادو ص۔۵۳

۲۶۔ رسالہ ساز،فروری ۱۹۶۲،ص ۱۲

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۱

۲۸۔ایضاً، ص ۱۳

۲۹۔ نساخ،ص۱۱۱

۳۰۔ حکیم حبیب الرحمٰن،ثلاثہ غسالہ (غیر مطبوعہ)ص ۲۳۳

۳۱۔ ایضاً، ص۲۳۷

۳۲۔ ایضاً، ص۲۴۳

۳۳۔ ایضاً، ص۳۲۳

۳۴۔ ایضاً، ص۲۰۱

۳۵۔ایضاً، ص۲۳۰

۳۶۔ ایضاً، ص۳۲

۳۷۔ تذکرۃ المعاصرین،ص ۳۲

۳۸۔ نساخ،ص ۱۰۶

۳۹۔ سخن شعراء،ص۶۰

۴۰۔ ایضاً، ص ۶۴

۴۱۔ ایضاً، ص،۷۹

۴۲۔ ڈاکٹر جاوید نہال، بنگال کا اردو ادب (کلکتہ،عثمانیہ بک ڈیپو،۱۹۸۴)ص۲۶۰

۴۳۔ ثلاثہ غسالہ (غیر مطبوعہ)ص۳۶۱

۴۴۔ بنگال کا اردو ادب،ص۲۴۹۔۲۴۸

۴۵۔ ایضاً، ص۲۵۴

۴۶۔ بنگال کا اردو ادب،ص۲۵۶

۴۷۔ ایضاً، ص۲۵۹

۴۸۔بنگال میں اردو،ص۷۲

۴۹۔ایضاً، ص۸۷

۵۰۔ تذکرہ بزم سخن،ص۴۳

۵۱۔ خمخانہ جاوید،(جلد دوم)ص۵۳۳

۵۲۔ گنج تواریخ،ص ۳۷

۵۳۔ سخن شعراء،ص۱۲۹

۵۴۔ ایضاً، ص۱۴۷

۵۵۔ایضاً، ص۔۱۵۳

۵۶۔ ایضاً، ص۱۵۶

۵۷۔ ایضاً، ص۱۹۷

۵۸۔ ایضاً، ص۱۰۸

۵۹۔ایضاً، ص۲۱۶

۶۰۔ ایضاً، ص۲۳۶

۶۱۔ایضاً، ص۲۸۶

۶۲۔ایضاً، ص

۶۳۔ ایضاً، ص۳۲۷

۶۴۔ایضاً، ص۳۴۹

۶۵۔ایضاً، ص۴۶۷

۶۶۔ ایضاً، ص ۳۸۲

۶۷۔ایضاً، ص ۴۳۴

۶۸۔ایضاً، ص ۴۶۵

۶۹۔ روح ادب،ص۱۸

۷۰۔ ایضاً، ص۲۰

۷۱۔ ایضاً، ص۲۱

۷۲۔ ایضاً، ص۲۲

۷۳۔ بنگال میں اردو،ص۳۰

۷۴۔ ایضاً، ص ۳۰

۷۵۔ مرزا علی لطف،گلشن ہند،(لاہور،دارالاشاعت پنجاب ۱۹۰۶ء)ص ۱۹۸

۷۶۔ بنگال میں اردو،ص۳۱

۷۷۔ایضاً، ص۳۳

۷۸۔ عابد پشاوری،انشااللہ خان انشا(لکھنو،اتر پردیش اردو اکاڈمی ۱۹۸۵)ص۶۴

۷۹۔ گلشن ہند،ص۲۹

۸۰۔ بنگال میں اردو،ص۳۳

۸۱۔ایضاً، ص ۳۲

۸۲۔ داستان تاریخ اردو،ص۱۷۲

۸۳۔ گلشن ہند۔ص۳۶

۸۴۔ ایضاً، ص۴۳

۸۵۔ایضاً، ص۳۹

۸۶۔ ایضاً، ص۴۶

۸۷۔ایضاً، ص۴۷

۸۸۔ ایضاً، ص ۴۸

۸۹۔ ایضاً، ص ۱۲۵

۹۰۔ ایضاً، ص ۱۸۰

۹۱۔ ایضاً، ص ۱۸۹

۹۲۔ بنگال کا اردو ادب،ص۳۴۱

۹۳۔ گلشن ہند،ص ۲۲۲

۹۴۔ ایضاً، ص ۲۲۵

۹۵۔ ایضاً، ص۲۲۷

۹۶۔ ایضاً، ص۲۳۵

۹۷۔ ایضاً، ص۲۴۴

۹۸۔ایضاً، ص۲۵۳
۹۹۔ ایضاً، ص۲۵۹
۱۰۰۔ تاریخ ادب اردو،ص۲٦۴
۱۰۱۔اردوئے معلّیٰ اکتوبر،نومبر ۱۹۰۷ ،ص۲
۱۰۲۔سخن شعراء،ص۵۰۔۵۱
۱۰۳۔خم خانہ جاوید،(جلداول)ص۴٦٦
۱۰۴۔ نساخ سے وحشت تک ازسید لطیف الرحمٰن،ص۹۲
۱۰۵۔ اردوئے معلّیٰ اکتوبر،نومبر ۱۹۰۷ع،ص۲
۱۰٦۔ روح ادب،ص ۵۳
۱۰۷۔ بنگال کااردوادب۔ص۳٦۲
۱۰۸۔ نساخ،ص ۱۴۰
۱۰۹۔ عبدالباری آسی،تذکرہ حمزہ گل۔ص۲۰۹
۱۱۰۔ بنگال اردوادب، ص۳٦۴
۱۱۱۔ روح ادب،ص۵۳
۱۱۲۔رئیس احمد جعفری،واجد علی شاہ اوران کا عہد، (لاہور،کتاب منزل،۱۸۵۷ء) ص۳۹۴
۱۱۳۔ایضاً، ص۱۰۴
۱۱۴۔ تاریخ ادب اردو،ص۲۵۷
۱۱۵۔ایضاً، ص ۲۵۹
۱۱٦۔ایضاً، ص ۳۴۵
۱۱۷۔واجد علی شاہ اوران کا عہد،ص ۳۷۰
۱۱۸۔ایضاً، ص ۱۰۷
۱۱۹۔تاریخ ادب اردو،ص۲۴٦

۱۲۰۔روح ادب،ص۵۸
۱۲۱۔ایضاً، ص ۵۹
۱۲۲۔ بنگال میں اردو،شانتی رنجن بھٹاچارجیہ،ص۷٦
۱۲۳۔روح ادب،ص ۵۹
۱۲۴۔ تذکرۃ المعاصرین،ص۱۲۳
۱۲۵۔ سخن شعراء،ص ۲۴۱
۱۲۷۔ ڈاکٹر شوکت سبزوادی،شائق جہانگیرنگری''ماہ نو'' کراچی ۱۹۵۳ء،ص ۴۵
۱۲۸۔ ثلاثہ غسالہ، ص ۱۴٦
۱۲۹۔ تواریخ ڈھاکہ،ص۳۳۸
۱۳۰۔ مشرقی بنگال میں اردو،ص ۵۰
۱۳۱۔تواریخ ڈھاکہ،ص ۳۱۵
۱۳۲۔ بنگال میں اردو،ص ۸۲
۱۳۳۔ مشرقی بنگال میں اردو،ص ۷۲، ۳۴
۱۳۴۔ ایضاً،ص۳٦
۱۳۵۔ مرزا جان طپش کی ادبی وسیاسی سرگرمیاں،ص۲۴
۱۳٦۔ مشرقی بنگال میں اردوص ۲۵
۱۳۷۔بنگال میں اردو،ص ۴۸
۱۳۸۔بنگال میں اردو،ص ۵۲
۱۳۹۔ محمد آزادسید،نوابی دربار (مقدمہ) ص ی
۱۴۰۔مشرقی بنگال میں اردو،ص ۱۰۲
۱۴۱۔ سلہٹ میں اردو،محمد عبدالجلیل بسمل،ص۳٦

باب چہارم

بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں

سیاسی تاریخ کے مأخذ

جامع التواریخ

تعارف: ''جامع التواریخ'' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے تاریخ کی کتاب ہے مصنف قاضی فقیر محمد ہیں۔ کتاب میں صفحات کی تعداد ۴۱۰ ہیں۔

حالات مصنف: قاضی فقیر محمد نواب عبداللطیف اور اردو فارسی کے مشہور شاعر عبدالغفور نساخ کے والد تھے۔ یہ فرید پور ضلع میں راجہ پور میں سکونت پذیر تھے۔ بعد ازاں ۱۸۱۶ء میں راجہ پور کو چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے خوش قسمتی سے فقیر محمد کے چچا خسر منشی بقا اللہ نظامت و عدالت صدر دیوانی میں وکیل تھے۔ جہاں فقیر محمد، منشی بقا اللہ کے تائید مقرر ہوئے۔ منشی بقا اللہ کی وفات کے بعد ججوں کی وساطت سے فقیر محمد ان کی جگہ وکیل مقرر ہوئے اور اٹھائیس سال تک اپنے کام کو بحسن و خوبی انجام دیتے رہے ان کا سال وفات ۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۴ ہے۔[1]

نواب عبداللطیف نے لکھا ہے کہ انتقال کے وقت ان کی عمر ۷۰ برس کی تھی۔[2] اس حساب

سے فقیر محمد کا سال ولادت ۱۱۸۹ھ مطابق ۱۷۷۵ء ہوتا ہے۔ نواب عبداللطیف اپنے والد مرحوم کے متعلق لکھتے ہیں۔

> ''آں جناب خیلے مہذب النفس و خداترس و شکستہ نہاد و درست اعتقاد و مستشرع و متورع و منشر ...... و بجملہ متداولہ از علم حدیث و تاریخ حظ وافی و وافر داشتند چنانچہ نتیجہ تاریخ دائی ایں تالیف شرف ست۔''[3]

آن کی ایک اور کتاب ''خلاصۃ النجوم'' بھی ہے۔

تاریخی اہمیت: ''جامع التواریخ'' کے مطالعے سے تاریخ کے بہت سے گوشے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ فقیر محمد نے اس کتاب کو بہت سی تاریخی کتابوں کے مطالعے کے بعد لکھا تھا۔ لہذا یہ کتاب ان سب کا نچوڑ ہے۔

چنانچہ فصل اول (صفحہ ۱ تا ۴) میں لوح و قلم۔ عرش کرسی، ارض و سموات صفات بیت المعمور، سدرت المنتہیٰ، وسط ارض، بیان اجنہ و ریاست ابلیس کا بیان ہے۔

فصل نمبر ۲ (صفحہ ۴ تا ۸۸) میں قصص انبیاء علیہم، قصہ ہاروت و ماروت، یاجوج و ماجوج، شدید و شداد و اصحاف کہف و اصحاب اخدود کا ذکر ہے۔

فصل نمبر ۳ (صفحہ ۸۹ تا ۹۷) میں راہبان بنی اسرائیل اور بعثت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے حکماء کا ذکر ہے۔

فصل چہارم (صفحہ ۹۸ تا ۱۴۵) میں قدیم ایرانی بادشاہوں یعنی شاہان پیشدادہان، کیانیان، اشکانیان و ساسانیان کا بیان ہے۔

فصل پنجم (صفحہ ۱۴۶ تا ۱۷۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اوران کے عہد میں واقع ہونے والی جنگی مہمات،غزوات اوران کی اولا دو ازواج مطہرات کے بیان پر مشتمل ہے۔

فصل ششم (صفحہ ۱۷۵ تا ۱۹۵) میں خلفائے راشدین اوران کے عہد میں واقع ہونے والی جنگی مہمات وفتوحات کا بیان ہے۔

فصل ہفتم (صفحہ ۱۹۶ تا ۲۱۳)اس فصل میں امام حسن (رض) ،امام حسینؓ اور چار اماموں کا ذکر شامل ہے۔

فصل ہشتم (صفحہ ۲۱۴ تا ۲۲۷) یہ خلفاء بنی امیہ کے کارناموں کے بیان پر مشتمل ہے۔

فصل نہم (صفحہ ۲۲۸ تا ۲۵۹) اس فصل میں خلفائے بنی عباس کے حالات وکارناموں کا بیان ہے۔

فصل دہم (صفحہ ۲۶۰ تا ۳۲۱) اس فصل میں خلفای بنی عباس کے معاصر دیگر ملوک کا ذکر ہے۔

اس کے تحت اس فصل کومندرجہ ذیل ''گفتار'' میں تقسیم کیا گیا ہے۔

گفتاراول: ذکرسلطنت طاہریان۔

گفتاردوم : بیان سلطنت اولادلیث صفار۔

گفتارسوم : ذکرسلطنت سامانیان

گفتارچہارم: ذکرسلطنت شمکریان

گفتارپنجم: ذکراحوال اولادابوشجاع بویہ

گفتارششم: بیان سلطنت لموک غزنویہ

گفتارہفتم: بیان سلطنت طبقہ اسماعلیہ

گفتارہشتم: بیان شیعہ اسماعلیہ

گفتارنہم: بیان سلطنت طبقہ اول ملوک سلجوقیہ

گفتاردہم: بیان سلطنت خوارزمشاہیان

گفتاریازدہم: بیان سلطنت چارطبقہ اتابکان موصل وشام ومصر ازبایجان وفارس

گفتاردوازدہم: بیان سلطنت غوریان

گفتار شیزدہم:: بیان سلطنت ملوک بامیان

گفتار چہاردہم: بیان سلطنت ملوک مصر

گفتار شانزدہم: بیان سلطنت سیستان

گفتار ہفدہم: بیان ملوک کرٹ

گفتار ہاجدہم: بیان ملوک قراختایہ

گفتار نوزدہم: بیان آل مظفر

فصل یازدہم (صفحہ ۳۲۲ تا ۳۳۳) دربیان خوانین دیارمشرق وترکستان ہے۔

فصل دوازدہم (صفحہ ۳۳۴ تا ۳۷۴) اس فصل ملوک تیموریہ ہندمع حال مرہٹہ۔ناظمان اودھ وبنگال اورانگریزوں کا ہندوستان میں آمد کا بیان ہے۔

فصل سیزدہم: (صفحہ ۳۷۵ تا ۳۹۱) میں شیان نقشہ ربع مسکون تقسیم ہفت اقلیم اورطول وعرض ہریک بلادشامل ہے۔

فصل چہاردہم (صفحہ ۳۹۱ تا ۴۱۰) اس فصل میں ہندوستان میں ہندوراجگان،تسلط اسلام و صوبجات ہندوستان اورآخر میں خطہ امریکہ کا بیان ہے۔

''جامع التواریخ'' لکھتے ہوئے فقیر محمد نے مندرجہ ذیل کتابوں کا مطالعہ کیا ہے جس کا ذکر

انہوں نے مقدمے میں کیا ہے۔ وہ کتابیں یہ ہیں:

خلاصۃ کتب التواریخ، روضۃ الصفا، معارج النبوت، اخلاق العارفین، تفسیر الحسینی، تذکرۃ ہفت اقلیم، کلیات خلفای بنی امیہ و خلفائی عباس، تاریخ فرشتہ، تاریخ نادری، لب السیر، سیر المتاخرین، اکبرنامہ، خلاصہ تاریخ ہند اور مہابھارت وغیرہ۔

مصنف نے اپنی کوشش و محنت کا ذکر یوں کیا ہے:

''سالہا سال در انتخاب آن دور چراغ خوردہ یہ چہاردہ فصول مرتب و بہ جامع التواریخ موسوم گردانید''

چنانچہ تاریخ نویسی سے ان کا ذوق ''جامع التواریخ'' سے ظاہر کوتا ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے دنیا کی تاریخ سے سرسری طور پر واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ انہوں نے گویا دریا کو ایک کوزے میں بند کر دیا ہے۔

''جامع التواریخ'' کے بارے میں Bradley. BirtF.B. کہتے ہیں:

"The study of history exercised for him an absorbing fascnation and the result of his researches was universal history written by him in Persian and entitled Jamiul. Tawarikh. It was published in 1836 and met with considerable success." 4

ڈاکٹر انعام الحق کہتے ہیں:

"He was a great orient sholar and well known literary man, being the author of several works, chief among which is an Universal History in persian, the Jamioot Tawareekh, which originally published in a

thick quarto in calcutta in 1836, has passed through more Editions in Lucknow."5

ڈاکٹر صدر الحق فرماتے ہیں:

''قاضی فقیر محمد کو پیشہ وکالت کے علاوہ علم و فن سے بھی کافی شغف تھا۔ بالخصوص تاریخ سے اچھی واقفیت تھی اور فرصت کے اوقات زیادہ تر کتب بینی میں صرف کرتے تھے۔ چنانچہ اسی والہانہ ذوق کا نتیجہ ان کی فارسی کتاب ''جامع التواریخ'' ہے۔[6]

زبان و اسلوب بیان: ''جامع التواریخ'' بزبان فارسی لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب اس وقت لکھی گئی تھی جب ملک میں فارسی کا چرچا اپنے عروج پر تھا۔ لہذا فقیر محمد کو بھی فارسی زبان پر خوب دخل تھا۔ ان کی فارسی دانی کے متعلق سی۔ سی باکلینڈ (C.C. Buckland) کہتے ہیں:

" His father (Nowab Abdul Latif) was respected for his high attainments as persian scholar." 7

اسی لئے ''جامع التواریخ'' کی فارسی نہایت معیاری، سہل و آسان ہے۔ انداز بیان عالمانہ، تصنع و بناوٹ سے عاری ہے۔

اشاعت:۔ ''جامع التواریخ'' ۱۲۵۲ھ/ ۱۸۳۶ء میں منشی ارادت کلکتہ پریس سے چھپی تھی۔ صفحات کی تعداد ۴۱۲ ہے۔ فقیر محمد کے انتقال کے بعد دوبارہ ۱۸۷۱ء میں مطبع نولکشور لکھنو اور تیسری بار پھر اسی مطبع نولکشور سے ۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء میں طبع ہوئی۔ آخری اشاعت میں نواب عبداللطیف کا دیباچہ شامل ہے۔

احادیث الخوانین

تعارف:۔"احادیث الخوانین" کا موضوع چٹا گانگ کی سیاسی وسماجی تاریخ ہے۔مصنف حمیداللہ خان ہیں۔اس کتاب میں چٹا گانگ میں اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے، عالم گیر کے عہد سے قبل کے واقعات، ہندوستان میں انگریزوں کا دخل اور چٹا گانگ میں ان کی آمد کے اثرات بیان ہیں۔کتاب میں صفحات کی تعداد ۴۴۱ ہے۔

احوال مصنف:۔خان بہادر حمیداللہ خان کا تخلص حمید تھا۔

چاٹگام کے نامور رئیس اور سلہٹ کے ڈپٹی کلکٹر تھے۔ان کے والد عبید اللہ خان بہادر چٹا گانگ کے صدر الصدور تھے۔حمی اللہ ۱۸۰۸ع میں پیدا ہوئے۔علاقہ چاٹگام میں مغل روایات کے دلداد، اورعربی و فارسی ادب پر عبور کامل رکھنے والے آخری مسلمان ادیب و شاعر تھے۔انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں یہ چاٹگام میں ریونیو آفیسر تھے۔۱۸۵۷ء کے غدر کے وقت ان کی عمر ۵۰ تھی۔قیام امن و مان کے سلسلہ میں انہوں نے سرکار انگریزی کی بہت مدد کی اور خطاب خان بہادر سے سرفراز ہوئے۔نہایت درمند اور متقی مسلمان تھے۔[8]

حمیداللہ خان فارسی و بنگالہ دونوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔"احادیث الخوانین" جو" تاریخ حمید" کے نام سے بہت مشہور ہے۔بزبان فارسی ہی انہوں نے اس کتاب کا مقدمہ بنام"فرع اول" بھی فارسی زبان میں تحریر کیا جسے ان خاندان کا نسب نامہ بھی کہ سکتے ہیں۔ ۶۱ صفحات (۶×۹) پر مشتمل یہ مقدمہ انہوں نے ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ع میں کلکتہ سے وطن واپسی کے وقت چھالو کاٹھی بریسال میں تکمیل کیا۔مگر ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔[9]

اس کے علاوہ ان کی ایک فارسی کتاب"انوار النیرین فی اخبار الخیرین" بھی ہے۔[10]

محبوب العام نے اپنی کتاب میں ان کی ایک اور تصنیف"عجائب المخلوقات" کا ذکر کیا ہے۔

جس میں حمیداللہ نے چٹا گانگ کے علاقے کی جڑی بوٹیوں کا ذکر کیا ہے۔

سید مرتضی علی نے ہسٹری آف چٹا گانگ میں" گلزار شہادت" اور" راہ نجات" نامی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

حمیداللہ خان نے ۱۸۷۰ میں انتقال کیا۔آپ کا مزار چاٹگام کے شمالی مضافات فتل گنج میں ہے۔

فہرست مضامیں " احادیث الخوانین"

مقالہ اول: اس مقالے میں چٹا گانگ کی ابتدائی عمارات، اس کی سابقہ فتوحات، آب و ہوا اور زمیں پیداوار کا ذکر ہے۔

اس مقالےکوتین فصول میں منقسم کیا گیا ہے۔

مقالہ دوم: اس مقالے میں عہد شاہی کے حکام، روسا، زمیں داران اصحاب علم وفضل اور چٹا گانگ کی زمیں کے خواص بیان ہیں۔

اس مقالے تین حصے ہیں۔

مقالہ سوم: مسجد جامع سنگین واقع مقام قلعۂ اسلام آباد کا بیان ہے۔

یہ مقالہ تین حصوں میں منقسم ہے۔

مقالہ چہارم: اورنگ زیب عالم گیر کی صفات اور شائستہ خان کے فضائل کا بیان ہے۔ یہ مقالہ بھی تین حصون پر مشتمل ہے۔

تاریخی اہمیت:"احادیث الخوانین" چٹا گانگ کی پہلی سماجی تاریخ ہے۔"احادیث"

حدیث کی جمع ہے جس کے معنی باتیں ہیں۔ ''خوانین'' خان کی جمع ہے۔ جو برسر آوردہ قوم کا خطاب ہے۔ یعنی ''احادیث الخوانین'' میں خان قوم کے افراد کی باتیں ہیں۔ ''احادیث الخوانین''، مصنف کے نام حمید اللہ خان کی وجہ سے ''تاریخ حمید'' کے نام سے بھی مروج ہے۔

مقالہ اول میں چٹا گانگ جسے اسلام آباد کہا جاتا تھا۔ اس علاقے میں قدیم ہندوؤں کا حال، ناصر الدین نصرت شاہ کی اس علاقے میں آمد (۳۲۔۱۵۱۸) ان کا مراسم مسلمانی کو رواج دینا، لیکن اس علاقے کا دوبارہ قوم مگ کے ہاتھوں چلے جانا اور ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۵ء میں اورنگ زیب عالم گیر کا دوبارہ اس علاقے کا فتح کرنے کا حال بیان ہے۔ فصل دوم میں اس علاقے کو چاٹگام، اسلام آباد اور چٹا گانگ پکارنے کی وجہ تسمیہ بیان کی ہے۔ فصل سوم میں اس علاقے کی زمین کا طول وعرض، جزائر، دریا، زمین کی زرخیزی، قدرتی درختوں کا حال، جانواران و پرندگان کا نہایت عمدہ تذکرہ کیا ہے۔

مقالہ دوم :۔ اول اسلام آباد کی مچھلیوں اور ان کی اقسام کا ذکر ہے۔ اس کے بعد اس علاقے میں آباد مختلف انواع کے لوگ جن میں ہندو، مسلمان، قوم مگہ، چکمہ، دیگر کوہیان وحشی، مگان و چکمہ کا طریق زراعت انکی رسومات کردار وگفتار کا بیان ہے۔ فصل دوم میں حکام عہد شاہی، امراء، روساء، زمیں داران، بزرگان، ادبا، معلمین، شعراء، منشیان، خوندکاران، اولیائے کرام، چودھریان، شیعہ، مغول اور مھنتان کا بیان ہے۔ اس کے بعد مغل عہد کے مختلف اہل حرفت وصعت وہنر کا ذکر ہے

فصل سوم میں چٹا گانگ کی مختلف پیداوار، وہاں کی زمین کی پیدائش، مردم شماری، آب وہوا

اوراس کا اثر لوگوں کی عام جسمانی صحت وموت پر۔ ان سب کا ذکر موجود ہے۔

تیسرے مقالے میں ۱۰۷۷ھ/ ۱۶۶۶ء میں شائستہ خان صوبہ دار بنگال کی چاٹگام فتح کے بعد بزرگ امید خان پہلے مغل گورنر قلعہ چاٹگام میں ایک شاندار جامع مسجد کا تعمیر کروایا (۱۶۶۷ء) نواب یسین محمد خان کا جامع مسجد کے نزدیک ایک دوسری مسجد التعمیر کروائی اور بزرگ امید خان کی مسجد کی رونق میں کمی آنا ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۰ء میں چاٹگام پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے بعد انگریزوں کا جامع مسجد کو دخل کرنا اور تقریبا سو سال تک مسجد کو بطور اسلحہ خانہ اور محکمہ تعمیرات عامہ کے گودام کی حیثیت سے استعمال کرنا پھر حمید اللہ خان کا چٹا گانگ کے لوگوں کے ترغیب سے مسجد کو انگریزوں سے استخلاص دلانے کی کوشش کرنا اور واگذاری کے لئے ایک قصیدہ لکھ کر ۲۹ نومبر ۱۸۵۵ء میں کلکتہ جانا اور بنگال کے لفٹننٹ گورنر سر فریڈرک ہیلی ڈے سے ملاقات کرنا اور ان کی کوششوں سے مسجد کا دوبارہ مسلمانوں کا حاصل کرنے کا تذکرہ ہے۔

چوتھے مقالے کے فصل اول کو حمید اللہ خان نے اورنگ زیب عالم گیر کی صفات بیان کرنے کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ بادشاہ کی جود وسخاوت، شجاعت وفتوحات، تقوی ودین داری کا تفصیلی بیان کیا ہے۔ فصل دوم میں'' سیر المتاخرین'' کے مصنف غلام حسین نے اورنگ زیب پر اپنے باپ شاہ جہان کو قید کرنا، بھائیوں کے ساتھ خراب برتاؤں معاملات کرنا، دکن کی اسلامی ریاستوں کو مٹانا، مرہٹوں پر ظلم وستم، ہندوؤں پر جزیہ لگانا اور ان کے ساتھ کینہ عداوت رکھنا، سنہ شمسی کو قمری میں بدلنا میر جملہ کی ناقدردانی، منجمان وشعراء کی برطرفی، قوالوں کو قوال خونی سے منع کرنا جیسے الزمات عائد کئے ہیں۔ حمید اللہ خان نے ان کی پرزور تردید کی

ہے۔اور بادشاہ کے کردار واعمال کا ایک روشن خاکہ کھینچا ہے۔

چوتھے مقالے کے تذکرہ ثانیہ کے تحت فصل اول میں مصنف نے شائستہ خان کی تعریف و توصیف کی ہے اس سلسلے میں فصل اول میں آصف خان، غیاث بیگ اور اس کی بیٹی نور جہان، نور جہان کے شوہر علی قلی خان اور اس کا قتل، بعدازاں نور جہان کی جہانگیر کے ساتھ شادی، نور جہان کی تعریف وتوصیف، شاہ جہان کی چہیتی بیوی ممتاز بیگم کا ذکر، اس کے اوصاف حمیدہ، روضۂ تاج محل کی تعمیر اور شاہ جہان کا سلطنت مغلیہ کو بام اوج پر پہنچانے کا ذکر ہے۔

فصل دوم میں شائستہ کے جاہ ومنصف، خطاب اور مختلف عہدوں پر اس کی ترقی ومراتب کا ذکر ہے۔

فصل سوم میں شائستہ خان کے جہانگیر نگر یعنی ڈھاکہ میں قیام کے دوران اس کے رفاہ عام کے نشانات وتعمیرات کا بیان ہے۔جن میں قلعہ، بلند استوار محرابیں، قلعہ کی پائدار دیواریں، زیر زمیں تہ خانہ، لعل باغ، اردو بازار، چوک بازار، جامع مسجد چوک بازار، لعل باغ مسجد، پری بی بی کا سنگ مرمر سے تیار کردہ مقبرہ شامل ہیں۔اس کے حسن انتظام کے نتیجے میں کھانے پینے کی اشیاء خصوصاً چاول کے سستا ہونے کا ذکر ہے اس کے بعد شائستہ خان کے زہد وتقوی اور عبادت گذاری اور شیعہ فرقے کا پیرو ہونے کے باوجود اہل سنت کے شعار پر چلنے کا ذکر ہے۔آخر میں مولوی کرامت علی جونپوری کی مقبولیت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں،''اکثر مسلمان اطراف واکناف شہر جہانگیر بلکہ تا بھندواودھ مرید او بودند''۔[11]

مصنف نے اپنی کتاب کا خاتمہ یوں کر دیا ہے۔''در کتاب مسمی باحادیث الخوانین در کفیت و

سیر وتاریخ مکان ومکین اسلام آباد وحال مسجد جامع سنگین محکم بنیاد مع برخی از سیر واحوال بانیاب نیکونہاد فاتحین این بلدہ'' مینوسواد''۔

'' احادیث الخوانین'' چاٹگانگ کی سماج وتاریخ کا آئینہ ہے۔ مطیع الرحمٰن'' آئینہ ویسی'' میں اس کی اہمیت واضح کرتے ہوتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''یہ کتاب فارسی میں چاٹگام کی ایک مستند تاریخ ہے۔جس میں چاٹگام کے علاوہ وہاں کے علماء اور فضلاء بزرگان اور صوفیائے کرام کے حالات ملتے ہیں۔[12]

Chittagong District Gazetter اس پر یوں تبصرہ کرتا ہے:

> "He (Khan Bahadur Hamid Ullah Khan) pulished, in 1971, his " Tarikhul Khawanin " which as a gazwtteer of Chittagong with a chapter defending the policy of Aourangzeb. But historical accounts of Chittagong are hopelessly wrong and indefinite, even in respect of the period after the Timurid conquest of the district." 13

ایس۔ ایم۔ اکرام کہتے ہیں:

> "Towrads the end of the nineteenth century Khan Bahadur Moulvi Hamidullah Khan wrote a comprehensive history of Chittagong in beautiful persian. He was a poet also and has quoted a number of his poems in his book. One of the most interesting of these is in praise of Islamabad (Chittagong),while his long qasida in which he

successfully appeled to the Lt. governor of Bengal to restore a mosque in Chittagong to Muslims, is of historic interest. " 14

زبان واسلوب بیان: ''احادیث الخوانین'' کی زبان فارسی ہے۔مصنف کو فارسی زبان پر پورا عبور حاصل تھا۔اس لئے کتاب کی زبان معنی دراز اور ادبی ہے۔تحریر لطیف اور تکلف وتصنع سے عاری، قدرتی مناظر کی عکاسی کرتے ہوئے ان کا قلم خوب زوروں پر آجاتا ہے اور بہت روانی سے منظر کشی کرتا ہے کہ واقعے کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔حمید اللہ نثر نگار کے علاوہ شاعر بھی تھے۔اکثر اپنی بات کی وضاحت اشعار سے کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ان کے اشعار نثر پڑھنے کا لطف دوبالا کرتے ہیں۔

اشاعت:۔''احادیث الخوانین'' مظہر العجائب پریس، کلکتہ سے ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی تھی۔

صحیفۃ الاعمال

'' صحیفۃ الاعمال'' میں چٹاگانگ کے سیاسی، سماجی ومعاشرتی حالات کی تصویر کشی ہے۔ اس کے مصنف عبدالعلی دری ہیں۔'' صحیفۃ الاعمال'' لکھنے کے پیش نظر ان کے چار سالہ فرزند احمد عزیز الرحمٰن کی تعلیم وتربیت تھی۔جب ان کا سن چوالیس برس کو پہنچا تو ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ زندگی فانی کا کوئی بھروسہ نہیں اس دنیا میں نہ کوئی یار غم خوار ہے نہ آشنائے وفادار ہے کہ اپنے فرزند کو اس کے دست تربیت میں سونپ جائیں نہ مال کی فراوانی ہے کہ فرزند کی تعلیم کے لئے سرمایہ چھوڑ جائیں، لہٰذا سوچا کہ تجربات ومشاہدات پر مبنی ایک ایسی کتاب چھوڑ جائیں جو بیٹے کے لئے مشعل راہ کا کام انجام دے چنانچہ فرماتے ہیں:

'' ایں صحیفہ کہ برائے تو آئینہ جہاں نما و از ترکہ می گزارم۔اگر بموجب آں عمل کنی گنج یابی و توانگر شوی۔پس بیوستہ من عاصی را بادائے خیر یاد کن و در کار خود کرم باش و آئینہ ام راھمو راہ پیش نظر دار کہ برای دین و دنیائے تو یاری و مددگار باشد'' ۱۵

عبدالعلی دری کے ان خیالات کے نتیجے کے طور'' صحیفۃ الاعمال'' وجود میں آئی۔

احوال مولف:۔ عبدالعلی دری کی ولادت چٹاگانگ کے چکوریہ تھانہ میں واقع بمقام ہربانگ نامی علاقے میں ۱۸۴۵ء میں ہوئی۔ان کے والد کا نام عبدالعلی اور دادا کا نام منت علی تھا۔جن کا شمار اپنے علاقے کے رؤسا اور زمینداران میں ہوتا تھا۔ابتدائی تعلیم کی حصول کے بعد دری ۱۸۶۰ء میں پندرہ برس کی عمر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے کلکتہ عالیہ مدرسہ پہنچے۔تکمیل تعلیم کے بعد ۱۸۹۰ء میں ۲۴ برس کی عمر میں کلکتہ عالیہ مدرسہ میں ہی اینگلو پرشیئن ڈیپارٹمنٹ میں فارسی کے استاذ کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔چار سال بحسن وخوبی معملی کے فرائض انجام دینے کے بعد سیتا کنڈ کے سب رجسٹرار مقرر ہوئے۔دو سال بعد میر سرائے میں ان کا تبادلہ ہو گیا۔مگر ہندوؤں کی دست درازی سے ان کا دل ناگوار ہو گیا چار و ناچار یہاں دو برس قیام کیا۔اور ملازمت سے استعفیٰ دینے کے بعد رنگون سے اشیائے برآمد کی تجارت شروع کر دی لیکن اس پیشے سے بھی ان کا دل جلد ہی اچاٹ ہو گیا کہ ۱۸۸۰ء میں قسمت یاوری سے ہوگلی مدرسے فارسی کے معلم دوم کی حیثیت سے معلم مقرر ہو گئے اور جلد ہی ان کو یہاں اعلیٰ ترقی حاصل ہو گئی۔اور اسی جگہ قیام کے دوران انہوں نے'' صحیفۃ الاعمالً ومراۃ الاحوال'' لکھی۔

ابواب کی تقسیم: دری نے '' صحیفۃ الاعمال'' و مراۃ الاحوال'' کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

باب اول :میں مصنف نے اپنی سوانح عمری تحریر کی ہے۔

باب دوم: چاٹگام کے اہم حالات اور یہاں سے تعلق رکھنے والے مختلف فرقوں اوران کے اطوار وکردار کا بیان ہے۔

باب سوم: چاٹگام کے علاوہ چند دوسرے ممالک اور مذہبی عقائد کا ذکر ہے۔

تاریخی اہمیت: باب اول میں مصنف نے اپنے ذاتی حالات جن میں ان کا سن پیدائش، بچپن میں سر سے ماں کے سایے کا اٹھ جانا۔ انکی کشمکش زندگی، تعلیم اور حصول ملازمت کا ذکر ہے۔ چنانچہ باب اول کو ہم شخصی تاریخ بھی کہہ سکتے ہیں۔

باب دوم میں اسلام آباد جو بعد میں چاٹگام کے نام سے معروف ہوگیا اس علاقے کی تاریخ ہے۔ اس سلسلہ میں ''تاریخ حمید'' کا بھی حوالہ دیا گیا ہے۔ اوراس علاقے کو چاٹگام، اسلام آباد اور شہر سبز کہنے کی وجہ تسمیہ درج کی ہے۔ قوم مگھ کے ہاتھوں سے نصرت شاہ کی فتح اس علاقے کا دوبارہ مگھان کے پاس انتقال اور ۱۶۶۵ء میں اورنگ زیب کے عہد میں شائستہ خان کی دوبارہ فتح اور یہاں اسلامی حکومت کے ازسرنو قیام کا بیان ہے۔

اس کے بعد یہاں کی آب وہوا، عام جسمانی صحت، مذہبی مسلک اوران کے بلند کردار کا ذکر ہے۔ پھر چٹاگانگ کی زبان کی لسانی خصوصیات کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''زبان ایں دیار بہ کلمات عربی وفارسی وہندی وبنگالی وغیرہ باہم پیوستہ شدہ زبان نو پدید آمدہ است کہ یکی ازینہا پیوند سے ندارد لیکن بہرحال بلسان بنگالی نزدیک است''۔

لیکن ۱۸۵۷ء تک اس علاقے میں فارسی کا خوب رواج تھا۔ فارسی کی مقبولیت کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہم درعہد سلاطین اسلامی وہم دراوائل حکومت انگریزی تا سنہ دوازدہ

صد ہفتاد و چہار ہجری جمیع دفاتر سرکاری ومکاتیب ضروری بزبان فارسی مروج بود وشرفائے باشندگان چہ ہندو چہ مسلمان زبان فارسی را از روے شرف وافتخار بتوجھے وشوقے بسیار آموختندے نظر برآں جا بجا مکتبھا و دبستنہا قائم بودند وعوام نیز درمحاورات خود جملات فارسی رابطور تمثیل درج نمودے وملاحان وحراثان وشیانان نیز دربدفع کسالت وتعب خود اشعار پارسی بالحان بلند خواندے و بدان لغت مطائبہ کردندے گوئی نمونۂ پارس بود۔[16]

اس کے بعد فارسی زبان کے زوال پر اظہار تاسف کیا ہے۔

دری نے چٹاگانگ میں آباد مسلمان سوسائٹی کا بہت عمیق نگاہوں سے مطالعہ کیا۔ اس نے ان کو پیشے کے اعتبار سے نوگروہوں میں منقسم کیا اوران کے عادات واطوار اور فضائل وعادات کا جائزہ پیش کیا۔ جس سے پڑھنے والا انیسویں صدی کے ان پیشہ وروں کے ذہنی آئینے سے روشناس ہوجاتا ہے۔ دری نے ان کو گروہوں میں اس طرح منقسم کیا ہے۔:

۱۔علماء ومولویاں ۲۔سادات وخواندکاراں ۳۔ امراء وزمیں دراں ۴۔ خدمتیاں و نوکری پیشگاں ۵۔ دبیراں ونویسندگاں ۶۔ بازارگاناں وتاجران ۷۔حراثان و کشتگاران ۸۔صناعان ودس وزران ۹۔فقراء ودرویشان

مصرع دوم میں'' حالات عامہ'' لکھتے ہوئے انسانی فطرت کے ان پہلوؤں کو بیان کیا ہے جوان کو خرابی کی طرف لے جاسکتے ہیں۔ مثلاً نفسانیت، کذب، حسد، نفاق، حرص، جہل و نادانی لیکن چاٹگام کے باشندوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ فضائل اعلی سے آراستہ ہیں۔ دروغ گوئی کی بری خصلت ان میں ہوسکتی ہے مگر مے خواری، سعدخواری، زناکاری و

مسکرات نوشی سے یہ لوگ بالعموم مستثنیٰ ہیں۔

باب سوم میں اول مصنف نے ہندوستان کا حوداربعہ، زراعت، پیداوار، معدنیات، زبان و گفتار اور مختلف علاقوں کے مذہبی اعتقادات بیان کئے ہیں۔ خصوصا دارالسلطنت کلکتہ کا ذکر انہوں نے خصوصی طور پر کیا ہے۔ انگریزوں کے تحت یہاں کی حیرت انگیز تغیر و ترقی، سامان تفریح و آسائش، علاج معالجے کی سہولتیں، شادی بیاہ، زبان، لباس، مذہبی خیالات ومختلف مذہبی فرقوں کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد برما کے سماجی و معاشرتی حالات کی تصویر کشی کی ہے۔

برما میں اسلام کا چرچا، مقامی لوگوں کی لسان و بیان، لباس باشندگان بنگالہ خصوصا اہل چٹا گانگ ونوا کھالی کے ساتھ برما کے تجارتی تعلقات آپس کی شادی بیاہ چٹا گانگ کے مختلف فرقوں مثلا شیعہ، غیر مقلد، نیچریاں، اطباء و معالجان، علماء و مولویان، امراء و نوابان، وکلا، ومختاران، اخبار نویسان، مجلسیان کے اطوار و عادات ذہنی خیالات اور سماج میں ان کی کارکردگی کی تصویر کشی کی ہے۔

اس فصل کے مصرع دوم میں ایشیاء، یورپ وافریقہ کے مختلف ممالک جیسے عرب، روم، مصر، بربرہ، زنگبار، فارس، ترکستان، افغانستان، بلوچستان جسے علاقوں کے سیاسی، سماجی و مذہبی خیالات قلم بند کئے ہیں۔

باب چہارم میں اسلام کی حقیقت اس کی اشاعت و اثبات اہل سنت و جماعت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے اسلام کے چار بڑے فرقوں حنفی، شافعی، مالکی و حنبلی کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستان میں حنفی مسلک کی مقبولیت ورواج کا ذکر ہے۔

کتاب کے آخری حصے میں اپنے بیٹے کو تعلیم کی ترغیب دیتے ہوئے چند نصیحتیں کی ہیں۔ اور فارسی بنگالی اردو اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی طرف مائل کرتے ہیں کہ معاشرے میں مقام حاصل کرنے کے لئے ان زبانوں کی بے حد ضرورت ہے۔ خصوصاً انگریزی کو انیسویں صدی کے معاشرے میں فوقیت حاصل تھی چنانچہ کہتے ہیں۔ ’’ درتحصیل ادب انگریزی جھدے بلیغ نمائی تابعد فراغ تحصیل عربی مایۂ ازتحریر وتقریر انگریزی بدست آورہ خود را نسبت جہل کلی برھائی، علاوہ براں حالا آموختن انگزیزی بقدر کاروائی بصیانت حریت نفس اسلامی ضروراست۔‘‘[۱۷]

مختلف زبانوں میں صرف ونحو اور فصاحت و بلاغت کی صلاحیت پیدا کرنے کی اہمیت ظاہر کرتے ہوئے فارسی، نظامی میں نظامی، سعدی اور حافظ شیرازی کے کلام اور عربی کلام الہی، حدیث نبوی اور اس زبان میں ادب عالیہ کا مطالعہ کرنے کی ضرورت بیان کرتے ہیں۔ اخلاق کی درستی واصلاح کی اہمیت بیان کرتے ہوئے اخلاق جلالی، مخزن نظامی، احیاء العلوم اور مثنوی مولانا روم کا بغور مطالعہ کرنے کو کہتے ہیں اور سحر خیزی، سادہ خوری، سادہ وپوشی، حق گوئی، حق شنوی کی نعمت، خوشامد ناحق سے بیزاری کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ذاتی ونجی طور ہر طبی تعلیم حاصل کرنے کی خوب اہمیت واضح کرتے ہیں تا کہ باوقت ڈاکٹر میسر نہ ہونے کی صورت میں گھریلو طور پر بھی علاج کیا جا سکے۔ کیونکہ بنگال جیسی آب و ہوا میں مختلف امراض خصوصا طب بلغی جیسی بیماری خوب عام ہے۔ علم طب کے حصول کی ضرورت بیان کرتے ہوئے ایک جگہ کہتے ہیں: ۔’’ از علم طب آنقدر ربایدکہ بر حفظ صحت طبیعت خود و دفع علت عارضہ از نفس و عیال خود قادر باشی‘‘ اس کے ساتھ تاریخ بینی کی بھی تاکید کرتے ہیں تا کہ رسول کریمؐ اور صحابہ کرامؓ کے کارناموں اور سیرت سے آگاہ اور مطلع رہیں۔

زبان واسلوب بیان: ''صحیفۃ الاعمال'' کی زبان فارسی ہے۔ جو دلنشین اور رواں انداز میں لکھی گئی ہے۔ طرز نگارش بے تکلف ہے۔ مصنف کو شاعری کرنے پر بھی عبور حصل تھا۔ اس لئے اپنے مطلب کی وضاحت کے لئے کہیں کہیں اشعار کا استعمال بھی کرتے ہیں۔

اشاعت:۔ یہ کتاب ۱۲۰۶ھ / ۱۸۸۸ع میں لکھی گئی اور کچھ عرصہ بعد کلکتہ سے طبع ہوئی۔

گنج تواریخ

''گنج تواریخ'' نساؔخ کی لکھی ہوئی قطعات تاریخ کا مجموعہ ہے۔ اس میں ۸۷ صفحات ہیں۔ ''گنج تواریخ'' میں ضمیمۂ گنج تواریخ بھی شامل ہے۔ ''گنج تواریخ'' ۵۶ صفحات کے وسط میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ۴ صفحات پر مشتمل حاجی ناظر عبداللہ آشفتہ اور حکیم اشرف علی مست کی تقریظیں ہیں۔ ضمیمہ ''گنج تواریخ'' کی ابتداء صفحہ ۶۱ سے ہوتی ہے۔ آخری دوصفحات پر نساخ کے معاصرین اور خود ان کی اپنی کلیات کی ترتیب و طباعت سے متعلق تاریخی قطعات ہیں۔

تاریخی اہمیت: ''گنج تواریخ'' میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، صوفیائے کرام، علمائے دین، سلاطین، شعراء، ادباء اور مشاہیر اسلام کی تاریخ وفات قطعہ اور فرد کی صورت میں شامل ہیں۔ تاریخ وفات کے علاوہ ایسے بہت سے واقعات کی تاریخیں ہیں جن کا تعلق نساخ کی ذات سے ہے۔ نساخ کی زندگی کے حالات اور بعض پہلو اس رسالے کی مدد سے منصۂ شہود پر آجاتے ہیں۔ باوجودیکہ انہوں نے اپنی سوانح عمری خود لکھی پھر بھی تفصیلی حالات اور بعض گم شدہ کڑیوں کو جوڑنے کے لئے اس رسالے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

اس کے علاوہ بنگال کے بعض شاعر اور ادیب کی تصنیفات کی تاریخیں بھی اس میں موجود ہیں جو آج ادبی اہمیت کی حامل ہیں۔ جیسے حکیم اشرف علی مست کی تصنیف ''رسالہ علم کشی''، ''رسالہ دافع السموم''، ''رسالہ چیچک''، ''رسالہ ہیضہ وطاعون'' اور سراپائے تصور غم کے سلسلے کی تاریخیں۔ بنگال میں اردو ادب پر کام کرنے والوں کے لئے یہ مشعل راہ بنیں گی۔

نیز نساؔخ نے اپنے بعض شاگردوں کی وفات اور اپنی تصنیفات کی تاریخیں بھی لکھی ہیں، پھر بعض واقعات بھی اس میں درج ہیں جیسے ڈھاکہ کا جلنا، ژالہ باری کی تاریخ وغیرہ۔ اس کی اہمیت صرف اس لئے نہیں کہ اس میں وفات کی تاریخ بلکہ اس سے نساؔخ کی تاریخ گوئی مہارت کا ثبوت ملتا ہے۔[۱۸]

حکیم اشرف مست ''گنج تواریخ'' کے بارے میں کہتے ہیں: ''گنج تواریخ'' مادہ ہائے مرغوب کا خزینہ ہے۔ تاریخہائے عمدہ وخوب کا گنجینہ ہے۔[۱۹]

ڈاکٹر صدرالحق فرماتے ہیں:

> ''گنج تواریخ'' ان کی ماہرانہ مہارت کی یہ رسالہ ایک زندہ و پائندہ دلیل ہے۔ نیز بنگالی کی بعض شخصیتوں، شعراء و ادبا سے متعلق واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس رسالے سے بہتر کوئی دوسری سند ملنی دشوار ہی نہیں محال بھی ہے۔''[۲۰]

زبان واسلوب بیان: قطعات اردو اور فارسی دونوں میں ہیں۔ قطعات جیسا کہ ظاہر ہے بصورت نظم ہیں۔

اشاعت: ''گنج تواریخ'' کا سال ترتیب ۱۳۹۰/۱۸۷۳ء ہے۔ لیکن ''گنج تواریخ'' کی

طباعت کے بارے میں کتاب کے آخر میں یوں درج ہے۔’’ گنج تواریخ‘‘ ......تصنیف ......مولوی عبدالغفور خان بہادر نساخ در مطبع تامی اودھ اخبار بماہ جنوری ۱۸۷۵ء مطابق شہر ذی الحجہ ۱۲۹۱ھ بحلل انطباع پیراستہ‘‘ ۲۱

کنزالتواریخ

’’کنزالتواریخ‘‘ عبدالغفور نساخ کی تاریخی واقعات پر مشتمل ایک رسالہ ہے جو ’’کنز التواریخ ‘‘ کا ضمیمہ ہے سرورق پر یوں لکھا ہے۔’’ ضمیمۂ گنج تواریخ موسوم بنام تاریخی کنز تواریخ‘‘ اس میں صفحات کی تعداد پچاس ہے۔

’’کنزالتواریخ‘‘ کا موضوع مختلف مشاہیر کی تاریخ وفات ہے۔موضوع سے ہی اس کتاب کی تاریخی اہمیت واضح ہے۔نساخ کو تاریخ گوئی سے دلچسپی تھی اس لئے انہوں نے مختلف ارباب واصحاب کی تاریخ وفات کو یکجا کیا اور انہیں بزبان فارسی نظم کی صورت میں ’’کنز التواریخ‘‘ میں پیش کیا۔

کتاب کی ابتداء گیارہویں ہجری سال وفات سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ سے ہوتی ہے۔اس ہجری سے یہ سلسلہ چلتا ہوا ۱۲۹۴ ہجری تک پہنچتا ہے۔یعنی آخر میں ان اشخاص کی تاریخ وفات ہیں جن کا انتقال ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ میں ہوا۔جن میں مولوی محمد اعظم منصف بریسال، قاضی عبدالباری صدر انجمن مذاکرۂ علمیہ کلکتہ، منشی شمس الدین احمد خان بہادر چاٹگام، منشی عنایت علی رئیس ڈھاکہ، یعقوب خان غازی امیر کا شعر، شرف اللہ شریف کعبۂ معظمہ وشاہ عبدالغنی شامل ہیں۔یہ سب نساخ کے ہم عصر تھے۔

لیکن کہیں کہیں تاریخ وفات درج کرتے ہوئے اپنے موضوع سے ہٹ گئے ہیں یعنی صفحہ ۳۷ پر تاریخ کدخدائی جناب مرزا محمد شیرازی مخمور اور صفحہ ۲۷ پر تاریخ کدخدائی شاہ عضدالدین رئیس ہیبت نگر ضلع میمن سنگھ درج ہے۔صفحہ ۳۷ اور صفحہ ۴۶ پر تاریخ ترتیب مثنوی ’’ذو بحرین‘‘ مسمی بہ ’’منتھے الافکار‘‘ تصنیف جناب سید محمود آزاد اور تاریخ ترتیب دیوان خواجہ عبدالغفار اختر، صفحہ ۴۵ پر مولوی عبیداللہ عبیدی کی ’’دستور پارسی آموز‘‘ کی تاریخ ترتیب، صفحہ ۴۸ پر تاریخ جلوس حضرت سلطان مراد افندی سلطان روم اور اسی صفحہ پر تاریخ مراجعت سید محمد باقر (شاعر ڈھاکہ) صفحہ ۴۸ پر تاریخ جلوس حضرت سلطان عبدالحمید خان سلطان روم اور تاریخ لقب کوئین وکٹوریا ملکہ معظمہ انگلستان درج ہیں۔

صفحہ ۳۷ پر تاریخ بنای باغ جناب احسن اللہ رئیس ڈھاکہ اور صفحہ ۳۹ پر تاریخ بنای شاہ باغ خواجہ عبدالغنی رئیس ڈھاکہ مذکور ہیں۔شاہ باغ کی تاریخ بنیاد ۱۸۷۳ ہے۔یہ ایک اہم تاریخی واقعہ ہے۔باغ کی صحن ورعنائی کی تعریف کرتے ہوئے اردو میں ایک مختصر سی مثنوی بھی لکھی ہے۔

مہتمم مطبع نظامی ’’کنز التواریخ‘‘ کے خاتمے میں نساخ کے بارے میں فرماتے ہیں۔

کیسے کیسے تاریخوں کے عمدہ اور بے نظیر مادے ایجاد فرماتے ہیں گویا خزانہ الہام سے ہاتھ آئے ہیں۔ہر تاریخ مورخ لہ کے حسب حال ہے۔۲۲

آخر میں نساخ کی تعریف میں ایک شعر یوں درج کیا ہے۔

زباں سے ہو سکے توصیف کب اسے سخنور کی
نہیں ذرے سے ہے ممکن خورشید انور کی۔۲۳

زبان و بیان اسلوب: ایک دو کے علاوہ باقی سب تاریخیں فارسی زبان میں ہیں۔اور نظمیہ صورت میں درج ہیں۔اور زبان نہایت سیدھی سادھی ہے۔

اشاعت: کنز تواریخ نام تاریخی ہے۔جس سے ۱۲۹۴ھ تاریخی نکلتی ہے لیکن سن طباعت درج نہیں۔مقام اشاعت مطبع نظامی کانپور ہے۔

ریاض النور

تعارف: ''ریاض النور'' مختلف شخصیات کی تاریخ وفات ہے۔اس میں صفحات کی تعداد ۴۲ ہے۔

احوال مئولف: مولانا اجیر الدین کا تخلص مدحتؔ ہے اور والد کا نام مولوی ظہیر الدین ہے۔ مولانا پھولباڑی ضلع سلہٹ کے باشندے تھے۔سلھٹ کے اجیر یہ مدرسہ کی بنیاد بھی مولانا اجیر الدین کے نام پر پڑی۔

تاریخی اہمیت: ''ریاض النور'' مختلف قطعات پر مشتمل ایک رسالہ ہے اس میں مختلف مشاہیر کی تاریخ وفات درج ہیں۔جس کی ابتدا، تاریخ وفات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی اس کے بعد خلفائے راشدین، چند صحابہ کرام، چند خلفاء عباسی، چند محدثین، مشہور شعرائے ایران و ہندوستان، اولیائے کرام اور مصنف کے عہد کی مشہور شخصیتوں کی تاریخ وفات درج ہیں آخر میں مولانا اجیر الدین نے رسالے کے آخر میں ''ریاض النور'' کی تاریخ تصنیف درج کی ہے۔

طرز تحریر: تمام قطعات نظمیہ ہیں اور زبان اردو ہے۔

زبان و بیان اسلوب: سادہ، صاف اور عام فہم ہے۔

اشاعت: ''ریاض النور'' ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۵ء میں مطبع نظامی کانپور سے چھپا۔

تاریخ کشمیریان ڈھاکہ

تعارف: فارسی میں لکھی ہوئی ''تاریخ کشمیریان ڈھاکہ'' کے مصنف خواجہ عبدالرحیم صباؔ ہیں۔ یہ کتاب ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔اس میں ڈھاکہ کے خواجہ خاندان کے تاریخی سماجی و معاشرتی کوائف درج ہیں۔اس میں صفحات کی تعداد ۱۷۳ ہے۔

احوال مئولف: خواجہ عبدالرحیم صبا معروف بہ پنچا میاں ابن خواجہ سلیم اللہ مرحوم داماد و برادر زادۂ خواجہ علیم اللہ رئیس اعظم ڈھاکہ تھے۔[24] انہوں نے ۱۲۸۸ھ/ ۱۸۹۱ء میں انتقال کیا اور ڈھاکہ میں دفن ہوئے۔

خواجہ عبدالرحیم صبا اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔حکیم حبیب الرحمٰن ان کے بارے میں کہتے ہیں:

وہ خاندان خواجگان میں بہترین ناثر و ناظم تھے۔ان کا بیشتر سرمایہ فارسی میں ہے۔لیکن اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔اور استادانہ قابلیت دکھاتے تھے۔آقا احمد علی اصفہانی جیسا محقق بھی ان کی صحبتوں سے فیض یاب ہوا۔انہیں کے دم سے ''احسن منزل'' میں شعر و شاعری کا چرچا ہوا۔[25]

عبدالغفور نساخ اپنے تذکرہ ''سخن الشعراء'' میں ان کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:۔

"صبا تخلص، خواجہ عبدالرحیم خلف الرشید خواجہ سلیم اللہ۔ داماد و برادر
زادۂ خواجہ علیم اللہ مرحوم رئیس اعظم ڈھاکہ ہر دو زبان میں شعر خوب
کہتے ہیں۔ راقم دوستوں میں ہیں۔ ۱۲۸۸ھ میں انتقال کیا۔"[۲۶]

تاریخی اہمیت:۔ اس کتاب میں خواجگان ڈھاکہ کا کشمیر سے بنگلہ دیش آنا۔ ڈھاکہ میں ان کی آبادی، شغل تجارت کا شروع کرنا، ان کی معاشی ترقی، زمین و جاگیر کا حاصل کرنا۔ افراد خانہ کی شادی بیاہ کا حال، افراد خاندان کے نام، ان کے عادات واطوار، ان کی تعلیم و تربیت، وقت گزاری کے مشاغل، شعر و شاعری میں ان کی دلچسپی، ملک میں بڑے بڑے نامور خاندان کے ساتھ ان کے تعلقات کی تفصیلات درج ہیں۔ کتاب کا خاتمہ خواجہ عبدالعلی کی ذات وصفات کے بیان پر ہوتا ہے۔

زبان و بیان اسلوب: اس کتاب کی زبان فارسی ہے۔ اور طرز بیان بھی سیدھا سادھا ہے۔

اشاعت: یہ کتاب ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا ایک نسخہ ڈھاکہ یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

تواریخ خاندان کشمیریہ

تعارف: "تواریخ خاندان کشمیریہ" کے مصنف خواجہ احسن اللہ شاہین ہیں۔ یہ کتاب سماجی اور تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ ۲۹۵ صفحات کا یہ مخطوطہ ڈھاکہ یونیورسٹی کی لائبریری میں ابھی تک غیر مطبوعہ حالت میں ہے۔ یہ خواجہ عبدالرحیم صاحب کی فارسی زبان میں لکھی "تاریخ کشمیریان ڈھاکہ" سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔

احوال مئولف: خواجہ احسن اللہ شاہین ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سر عبدالغنی تھا۔ خواجہ احسن اللہ اردو فارسی اور انگریزی زبانوں پر بہت مہارت رکھتے تھے۔ اور نہایت نفاست پسند، ادب دوست اور علم پرور رئیس تھے۔[۲۷] شعر کہتے تھے اور شاہین تخلص کرتے تھے۔ "کلیات شاہین" ان کا اردو و فارسی پر مشتمل مطبوعہ دیوان ہے۔ اس میں ۴ فارسی غزلیں، ۱۳۰ اردو غزلیات، ۱۵ اردو ریختیاں اور ۸۵ ہندی گیت اور راگ راگنیاں شامل ہیں۔

ان کی قابلیت واستعداد کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے والد عبدالغنی نے ان کی حین حیات ان کو اپنی آبائی جائداد کا متولی مقرر کر دیا۔[۲۸]

اپنی قابلیت کے بل بوتے پر ڈھاکہ میونسپلٹی کے کمشنر اور آنریری مجسٹریٹ کے فرائض انجام دیتے تھے۔ سرکار انگریزی نے ۱۸۷۱ء میں خان بہادر ۱۸۷۵ء میں نواب، ۱۸۹۱ میں سی، آئی، ای ۱۸۹۲ میں نواب بہادر، ۱۸۹۷ میں کے، سی، ایس، آئی کے خطابات سے نوازا گیا۔[۲۹] انہوں نے ۱۹۰۱ء میں ڈھاکہ میں انتقال کیا۔

تاریخی اہمیت: "تواریخ کشمیریان ڈھاکہ" ادبی، سیاسی وسماجی لحاظ سے تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے مطالعے سے خواجہ خاندان کی گذشتہ تاریخ سے روشنی حاصل ہوتی ہے۔ شاہ دہلی محمد شاہ (۱۷۱۹۔۱۷۴۸ء) کے زمانے میں خواجہ خاندان کے جد اعلی، حاکم کشمیر، خواجہ عبدالحکیم کو محمد شاہ کا کشمیر سے بےدخل کرنا۔ جس کے نتیجے کے طور پر خواجہ خاندان کا ترک کشمیر کر کے دہلی آنا۔ ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ، شاہ ایران کا دہلی میں داخل ہو کر قتل عام، غارت گری اور بے شمار لوگوں کا قتل عام کرنا۔ بعد بسیار خرابی کے خواجہ خاندان کے افراد کا

ڈھاکہ آنا اور یہاں شغل تجارت شروع کر کے مستقل طور پر بود و باش اختیار کرنے کی تفصیلات درج ہیں۔ ڈھاکہ میں اس خاندان میں بہت سے نامور افراد پیدا ہوئے اس کتاب سے ان افراد کی ذاتی زندگی، ان کی وقت گذاری، تفریح طبع کے ذرائع اور ان کے ادبی، سیاسی اور سماجی چرچوں کا پتہ چلتا ہے۔ اس خاندان کی مستورات کی تفصیل بھی اس کتاب سے مطالعے سے حاصل ہوتی ہے۔ ڈھاکہ میں اس خاندان کے نامور خواجہ عبدالحکیم، خواجہ عبدالحفیظ، خواجہ عبدالقادر، خواجہ عبداللہ بن اسداللہ، خواجہ احسن اللہ، خواجہ محمد اصغر نقشبندی، خواجہ عبدالرحیم اثیم عرف لنگڑا میاں، خواجہ عبدالعلی، خواجہ عتیق اللہ عرف شہزادہ، خواجہ سلیم اللہ عرف بھولا میاں، خواجہ عبدالصمد، خواجہ عبدالرحیم صبؔا، خواجہ علیم اللہ، خواجہ محمد یوسف، خواجہ عبدالحکیم، خواجہ عبدالغنی اور احسن اللہ شاہین یہ سب حضرات شامل ہیں۔

ان میں خواجہ عبدالغنی کا نام قابل ذکر ہے کہ ڈھاکہ کے مسلمانوں میں آپ ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ آنرری مجسٹریٹ مقرر ہوئے اس کے بعد خان بہادر ہوئے ۱۸۶۶ء میں لیجو لیٹو کونسل کے ممبر مقرر ہوئے ۱۸۷۵ء میں نواب ہوئے، اس کے بعد انڈیا کونسل کے ممبر ہوئے، ۱۸۷۱ء میں سٹار آف انڈیا، ۱۸۷۵ء میں نواب لقب پایا اس کے بعد ایڈورڈ ہفتم نے تمغۂ یادگاری عنایات فرمایا اس کے چند روز بعد نائب کمانڈر آف سٹار آف انڈیا کے لقب سے ملقب ہوئے۔ ان خطابات کے علاوہ ان کی داد و دہش کے بے شمار واقعات درج ہیں۔

"تواریخ خاندان کشمیریہ" ڈھاکہ کی ادبی تاریخ مرتب کرنے میں بہت مددگار ذریعہ ہے۔ اس خاندان میں بہت اہل قلم پیدا ہوئے جنھوں نے اردو، فارسی دونوں زبانوں کی خدمات انجام دیں جن کی وجہ سے ڈھاکہ میں ان زبانوں کا چرچا پھیلا ان میں سب سے پہلے قابل

ذکر حیدر جان متخلص بہ شائق ہیں۔ وہ اپنے کلام میں مرزا غالب سے بذریعہ خط اصلاح لیا کرتے تھے۔ اور غالب نے انہیں "طوطی بنگالہ" کا خطاب دیا تھا۔[۳۰]

ان کے فارسی و اردو کلام کا نمونہ بھی درج ہے۔ دوسرے شاعر جن کا ذکر ہے وہ خواجہ اسداللہ کوکبؔ ہیں فارسی اور عربی میں اچھی لیاقت تھی۔[۳۱]

شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ فارسی اشعار خوب کہتے تھے۔ کلام بیشتر خشک ہوتا تھا یعنی درد اور ملاحت کم پائی جاتی تھی۔ تخلص ان کا کوکبؔ تھا۔[۳۲] اس کے بعد مختصر کلام ان کا بطور نمونہ درج ہے۔

خواجہ عبداللہ بن اسداللہ جب کہیں مشاہرہ ہوتا وہ بھی غزل لکھتے تھے مگر مضمون الگ ڈھنگ نرالا جو مزہ ان کے اشعار میں تھا وہ بھلا اور کسی کے اشعار میں کب تھا۔[۳۳]

مصنف نے بطور نمونہ ان کے دو اردو اور دو فارسی شعر پیش کئے ہیں:

خواجہ عبدالعلی برقؔ تخلص کرتے تھے۔ کلام ان کا محفوظ نہیں مصنف نے ان کا ایک شعر بطور مثال پیش کیا ہے۔

خواجہ عبدالرحیم عرف لنگڑہ میاں ان کا تخلص اثیم تھا۔ مگر کلام کا نمونہ موجود نہیں۔

عبدالرحیم صبؔا کو عربی اور فارسی میں اچھی دستگاہ حاصل تھی۔ منشی تو اتنے بڑے تھے کہ تمام ملک بنگال میں کوئی ان کے مقابل نہ تھا۔ فارسی اور اردو کلام دونوں سے مثال لاجواب ہے۔ ایک قصہ ناتمام" داستان صبا" اردو زبان میں ان کی تصنیف ہے۔

بچوں کی تعلیم میں بھی بہت دلچسپی لیتے تھے۔ عیدین میں امامت وہی فرماتے تھے۔ لڑکوں کی مکتب خوانی وہی پڑھاتے تھے۔ خاندان کے لڑکوں کے علاوہ شہر کے طلباء جوق در جوق روز

ان سے درس لیا کرتے تھے۔[۳۴]

مستورات کی تعلیم کا ان کو اس درجہ خیال تھا کہ ایک کتاب مسائل کی سہل عبارت میں تصنیف کی تھی۔اور خود اصرار کر کے سب کو پڑھاتے تھے۔[۳۵]

بعد میں ان کے قصیدوں، قطعہ، تاریخ، غزلیات اردو و فارسی اور آخر میں منظوم فارسی نامہ، ہمشیرہ صاحبہ کی خدمت درج ہیں۔

خواجہ عبد العلیم فرزند خواجہ عبد الرحیم کے بارے میں درج ہے کہ شعر وسخن کا شوق رکھتے تھے۔[۳۶] اس سے زیادہ تفصیل بیان نہیں۔

آخر میں احسن اللہ شاہین کا یوں ذکر ہے۔''فارسی میں یہ حالت تھی کہ کلام بالکل اہم زبان سے ملتا تھا۔شیرینی بھری تھی۔راگ راگنیاں بھی بہت سی لکھیں''۔[۳۷] ان کے اردو و فارسی نمونے بھی درج ہیں۔

اس کتاب کے اہم تاریخی واقعات میں نواب عبد الغنی کے زمانے میں ایڈورڈ ہفتم کا ہندوستان تشریف لانا ہے۔مگر کوئی سن و تاریخ درج نہیں۔

خواجہ احسن اللہ شاہین کے زمانے میں ڈھاکہ میں ایک بڑا طوفان آیا۔ لاکھوں روپے کا نقصان ہوا۔ڈھاکہ میں برپا ایک زلزلے کا بھی تذکرہ ہے۔بہت سی عمارات تباہ ہوگئیں جن میں قابل ذکر حسینی دالان ہے۔جیسے احسن اللہ کے زیر سرپرستی ایک کروڑ و پچھتر ہزار روپیہ جمع کر کے از سرنو بنایا گیا۔

اس کتاب کے مطالعے سے خواجہ خاندان کے افراد کی سماجی زندگی کے بہت سے گوشے بے نقاب ہوتے ہیں۔جس میں مذہبی معاملات میں دلچسپی، داد وخیرات، شادی بیاہ، شادی کے

موقع پر دھوم دھام کی رسومات، ان کے ہاں منعقدد دعوت، اس موقع پر کھانے کی تفصیلات۔شکار میں دلچسپی، پرندوں و پالتو جانوروں کا پالنا۔فن موسیقی میں دخل، آتش بازی کا شوق، شطرنج کھیلنا، مشاعروں کا انعقاد، گھوڑ دوڑ میں حصہ لینا، ناچ و سرود کا اہتمام ان سب کی تصویریں آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہیں۔

جنگ ہفت سالہ

تعارف:''جنگ ہفت سالہ'' امریکہ کی سات سالہ جدوجہد آزادی کے واقعات پر مبنی ہے۔ جس کے مصنف خواجہ محمد اصغر ہیں۔کتاب میں صفحات کی تعداد ۱۱۵ ہے۔ بنگلہ دیش میں امریکہ کی جنگ آزادی کے موضوع پر اردو میں یہ واحد کتاب ہے۔

احوال مئولف: خواجہ محمد اصغر نقشبندی کا تعلق ڈھاکہ کے خواجگان ڈھاکہ سے تھا اور ان کا شمار ڈھاکہ کے نامور ان میں ہوتا تھا وہ ڈھاکہ کے پہلے مسلم گریجوئٹ ہیں۔۱۲۹۱ھ/۱۸۱۴ء تا ۱۲۹۲ھ ۱۸۷۵ء میں دھاکہ کے میونسپل کمشنر رہے۔اور ۱۸۷۹ میں ڈھاکہ میونسپل کمشنر رہے۔اور ۱۸۷۹ میں ڈھاکہ میونسپلٹی کے وائس چیئر میں کی حیثیت سے برقرار ہوئے اور ۱۸۹۴ء تک اس عہدے پر برقرار رہے۔ ۱۶اپریل ۱۹۰۶ میں شاہ باغ ڈھاکہ میں جو ایجوکیشنل کانفرنس ہوئی۔اس میں انہوں نے زنانہ تعلیم کی ترقی کی پرزور حمایت کی۔۱۹۰۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔

ابواب تقسیم:۔ 'جنگ ہفت سالہ' سات باب پر مشتمل ہے:۔

باب اول: امریکہ کی سلطنت جمہوریہ کی بناڈالنا۔

باب دوم: جنرل پرگویں کی گرفتاری۔

باب سوم: امریکہ کی فتح جنگ بحری میں

باب چہارم: بیان روز تریہ و تار کا

باب پنجم: میجر جنرل ارنولڈ صاحب کی شازش کا بیان

باب ششم: لارڈ کورن والیس کی گرفتاری

باب ہفتم: جنرل واشینگٹن کا استعفا دینا اور فوج سے رخصت ہونا۔

تاریخی اہمیت: باب اول میں ان ناگریز واقعات کا بیان ہے جن کے تحت ۴ جولائی ۱۷۷۶ء کو دنیا کے نقشے پر امریکہ جیسا عظیم ملک ابھرا۔ امریکہ کی عوام دولت انگلیہ کے نافذ کردہ بھاڑی ٹیکسوں کے تلے دبی چلی جا رہی تھی۔ مگر شاہ انگلستان جارج سوم نے ان کی آہ و زاری کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ آخر مجبور ہو کر ۴ جولائی ۱۷۷۶ میں فیلاڈیفیا میں مسٹر جان آدم، مسٹر جفرسن اور واشنگٹن کی سرکردگی میں عوام امریکہ کا انگلستان سے قطع علائق کا متفقہ فیصلہ کیا گیا۔

باب دوم میں مسٹر واشنگٹن کی سرکردگی میں امریکہ کی جنگ آزادی کی ابتداء کی تاریخ ہے۔ انگلستان کی فوج کے سالار جنرل برگوین تھے جو مئی ۱۷۷۷ میں امریکہ میں وارد ہوئے۔ پہلی چھڑپ چمیکین، دوسری کراؤن یونٹ اور تیسری ٹیکن ڈروگا کے مقام پر ہوئی۔ آخر بنینگٹن کو شکست فاش ہوئی۔ ۱۹ دسمبر ۱۷۷۷ میں سراٹو کا کے میدان میں گھمسان کا رن ہوا جس میں انگریزی کو واضح شکست ہوئی مگر دوسری جانب مسٹر واشنگٹن کو جرمن ٹاون کے مقام پر پسپائی ہوئی۔

باب سوم؛ باب سوم میں شاہ انگلستان کا لارڈ کورن والیس کا فوج کثیر کے ساتھ امریکہ روانہ کرنے کا بیان ہے۔ تین برس کے عرصے میں طرفین کے درمیان کئی نا فیصلہ کن بڑی جنگیں ہوئیں آخر میں بحری لڑائی میں امریکہ کے لفٹننٹ جونس کی فتح و کامرانی کا ذکر ہے۔

باب چہارم: اس باب میں کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں۔ مصنف نے صرف ان خائی اندھیاروں کا ذکر کیا ہے۔ جس نے اچانک امریکہ کی سرزمین کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور تمام لوگ سراسیمہ و پریسان ہو گئے۔ اور تمام لوگ اپنے خیال کے مطابق اس اندھیرے کی تحویل کرنے لگے۔

باب پنجم: اس باب میں امریکہ فوج کے میجر جنرل آرنلڈ کی اپنے وطن سے غداری و جاسوسی کا ذکر ہے۔ جس نے انگریزی فوج کے جنرل انڈر کے ساتھ مل کر اپنی قوم سے شازش کا جال بچھایا۔ جنرل آرنلڈ کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط جس میں امریکہ کی فوج کے تمام حالات اور مغلوب کرنے کی ترکیب اور تدبیر اشاروں میں درج تھی ان کے ہاتھوں پکڑا گیا اس طرح سازش کا حال طشت ازبام ہو گیا اور خوف وہشت سے میجر جنرل آرنلڈ لاپتہ ہو گیا۔

باب ششم: اس باب میں ۱۶ اکتوبر ۱۷۸۱ کو ورجینیا کے مقام پر انگلستانی فوج کی شکست، جنگی جہازوں کی تباہی، ۱۷ اکتوبر ۱۷۸۱ کو امریکن فوج کا جشن فتح منانا، ایک عالی شان مینار یورک ٹاون میں تعمیر ہونا اور اس پر ایک پتھر کا نصب کرنا تا کہ سن و تاریخ اس لڑائی کا تا قیامت اسمیں کندہ رہے۔ وہ مینار اس وقت سے اس شہر میں کھڑا آزادی کی گواہی زبان حال سے دے رہا ہے۔[۳۸]

باب ہفتم: اس باب میں ”جنگ ہفت سالہ“ کے اتمام کا ذکر ہے اور ۱۷۸۳ میں انگلستان کا امریکہ کی نئی سلطنت کے وجود کو تسلیم کر لینا، مسٹر واشنگٹن کا بطور سپہ سالار فوج سے استعفی دینا اور الوداعیہ تقریر مذکور ہیں۔

زبان و بیان اسلوب: کتاب اردو زبان میں لکھی گئی ہے۔ بیان میں سادگی کے باوجود بناوٹ اور تکلف و وضع کا الزام برتا گیا ہے۔ اور کہیں کہیں فارسی اشعار کا سہارا بھی لیا گیا ہے۔ کتاب کے طرز بیان کے بارے میں مصنف خود کہتے ہیں۔ ”چونکہ تواریخ کی

عبارت اکثر خشک ہوا کرتی ہے۔اس سبب سے پڑھنے والوں کا جی نہیں لگتا۔لہذا طرز بیان ایسا رکھا گیا کہ نہایت دلچسپ اور عام پسند ہے۔''

اشاعت: یہ کتاب جنوری ۱۸۸۹ میں قومی پریس لکھنو سے چھپی تھی۔

تاریخ نصرت جنگی

تعارف: ''تاریخ نصرت جنگی'' تاریخ جہانگیر نگر کے نام سے بھی موسوم ہے کتاب کے مصنف نواب نصرت جنگ ہیں۔کتاب کے واقعات ڈھاکہ کی تاریخ پر مبنی ہیں۔یہ کتاب اس شہر کی اکبر (۱۵۵۶۔۱۶۰۵) کے عہد سے لے کر ۸۶۔۱۷۸۵ تک مختصر تاریخ ہے۔ مصنف نے مقدمہ میں بتایا ہے کہ یہ کتاب ان انگریزوں کی مرضی سے لکھی گئی جو حقائق کی تصدیق کرنے اور سچ معلوم کرنے کے لئے متجسس تھے۔

احوال مئولف: نصرت جنگ کی ابتدائی زندگی کے حالات معلوم نہ ہو سکے ۱۷۸۶ میں وہ اپنے بھائی نواب حشمت جنگ کے بود جانشین ہوئے اور نائب ناظم کا عہدہ حاصل کیا۔اور انتظام الدولہ نصیر الملک سید علی خان بہادر کا خطاب حاصل کیا۔

انہوں نے ۲۷ سال تک (۱۷۹۶۔۱۸۲۳) کامیابی کے ساتھ فرائض انجام دیئے اپنے وقت میں بڑی رعونت اور تجمل کے ساتھ نوابی کی اس وقت کے لوگ ان سے بہت فیض یاب تھے۔ صاحبان انگریز اور سرکار کمپنی میں بھی بڑے نیک نام تھے۔[۳۹] وہ ایک اچھے عالم، خوشخط اور مصور بھی تھے۔ان کی مصوری میں دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے D. Oyly

(Glimpses of Old Dhaka) میں کہتے ہیں:

> " He possesses taste for Fine Arts. He resides in Dhaka in a palace aslendidly omamented in oriental manners and his audience chamber is so much crowded with English prints and paintings that not an inch of wall could be seen. "[40]

نواب نصرت جنگ نے ۱۸۲۲ء میں ڈھاکہ میں وفات پائی۔اور حسینی دالان کے احاطے میں مدفون ہوئے۔[۴۱]

تاریخی اہمیت: ''تاریخ نصرت جنگی'' کی ابتداء جلال الدین محمد اکبر (۱۵۵۶۔۱۶۰۵) کا صوبہ بنگال کا قلمروشاہی میں داخل کرنے سے ہوتی ہے اس کے بعد اسلام خان، صوبہ دار قطب الدین خان، شاہزادہ عظیم الشان، مرشد قلی خان، شاہ شجاع، معظم خان، جعفر خان، علی وردی خان، سراج الدولہ جیسے صوبہ داران کا ذکر ہے اور فرداً فرداً ہر صوبہ دار کے عہد کے سیاسی حالات قلم بند ہیں۔اس کے بعد ڈھاکہ کے نائب ناظم جساتر خان، حشمت جنگ اور نواب نصرت جنگ کے زمانے تک کے سیاسی واقعات اور ان کے ذاتی کردار اور اعمال کا بیان ہے۔

۱۸۲۲ء میں نواب نصرت جنگ کے انتقال کے بعد عرضی بیگ سید عبدالغنی عرف حمید میر نے ''تاریخ نصرت جنگی'' میں کچھ اضافہ کیا سب سے پہلے انہوں نے نواب نصرت جنگ کی وفات کا ذکر کرنے کے بعد مختصر طور پر ان کے حالات و کردار کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا۔اس کے بعد ذکر ریاست نواب شمس الدولہ بہادر ہے۔اس دور کا قابل ذکر واقعہ نواب شمس الدولہ کا انگریزوں کے خلاف خفیہ سازش کرنا ہے اور اس سلسلے میں نواب وزیر علی خان و الی صوبہ اودھ، اطراف کے دیگر راجگان اور فرانسیسی فوج سے مدد کا طلب کرنا بیان ہے۔

اس سازش کے فاش ہونے کے بعد نواب کو کلکتہ میں سات برس قید کیا گیا۔ اس کے بعد نواب فخر الدولہ اور نواب سید غازی الدین محمد کے عہد کے واقعات درج ہیں۔

صوبہ کے انتظام وانصرام میں سہولت پیدا کرنے کے لئے ''عمدہ داروغہ'' کا تعین کیا گیا تھا۔ اس داروغگی کے تحت مولوی عبدالحلیم، خیراتی جمعدار، میر علی نقی، شیخ کانو مچھوا، میر افضل علی، میر محمد اسماعیل اور منشی عنایت کے نام اور فرائض درج ہیں۔

نواب نصرت جنگ کی وفات سے لے کر غازی الدین حیدر کی وفات تک (۱۸۲۲ تا ۱۸۴۳ء) بیس برس کا عرصہ ہوتا ہے۔ اس عرصے میں ڈھاکہ میں جو عمائد اور روسا ہوئے حمید میر نے ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں میر اشرف علی، علی مہدی خان بہادر، علی حسن خان بہادر، نواب عبداللہ، مرزا محمد کاظم خان، میر عطاء الرحیم، مرزا حسن علی خان، مرزا لطیف حسین، مرزا زین الدین حسین، راجہ پرسرام، مرزا حیدر علی، مرزا محمد علی خان بہادر اور خواجہ اراتون ارمنی کے ناموں کا ذکر ہے۔

کتاب کے آخر میں دوبارہ نواب نصرت جنگ کی قلم سے لکھا ہوا ڈھاکہ کی عمارات کا ذکر شامل ہے۔ جن میں چھوٹا کٹرہ، بڑا کٹرہ، کٹرہ محمد مقیم، مسجد کار طلب خان اور بازار لعل باغ، مقبرہ پری بی بی، نرائن گنج کے متصل ومقابل میں برج وقلعہ، پل معین خان، پل چاند خان، پل دولائی، پل ٹونگی اور رمنہ میدان کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ سواری گھاٹ پر توپ کلاں اور مغلائی چر میں توپ دیگر کا بیان ہے۔ خانخان کے زمانے میں ان کے نصب کرنے کا مقصد از ختگیوں کی تادیب اور ان کی اذیت سے بچنا تھا۔

''تاریخ نصرت جنگی'' تاریخی لحاظ سے اتنی اہم نہ ہونے کے باوجود، بنگلہ دیش کی تاریخی موضوعات پر لکھی جانے والی کتابوں میں اہم مقام کی حاصل ہے اس کا ایک خطی نسخہ جو کلکتہ

ایشیاٹیک سوسائٹی میں رکھا تھا اس کا مطالعہ ایچ بلاک مین (۱۸۳۸۔۱۸۷۸) نے کیا تھا۔ اس نسخے پر انہوں نے رائے اظہار کر کے اپنے دستخط بھی ہیئے۔ جو یوں تھے:۔

"This book is good for nothing."

لیکن بہت سے تاریخ دانوں نے اس کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ جیسے ہری ناتھ دے کہتے ہیں:

"This subject.matter of the work is much more important."

زبان و بیان اسلوب: اس کتاب کی زبان فارسی ہے۔ جو نہایت آسان، عام فہم اور سہل ہے۔ تاریخی واقعات کو سیدے سادھے انداز میں پیش کیا ہے۔ پڑھنے والے کو نفس مضمون تک پہنچنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔

اشاعت: ''تاریخ نصرت جنگی'' عرف تاریخ جہانگیر نگر کب لکھی گئی تھی کچھ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ ۱۸۱۷ تک اس کا مسودہ لکھا جا چکا تھا۔ کیونکہ ۱۸۲۰ میں مسٹر سٹینٹیون نے بنگال ایشیاٹیک سوسائٹی کلکتہ کو ''تاریخ نصرت جنگی'' کا ایک مخطوطہ پیش کیا تھا۔ اس کے آخری صفحہ پر یوں تحریر تھا:۔

"Account of Dacca by nawab Nustat Jung, the present Nawab of the city, 1817.

یہ مخطوطہ تقریباً ایک سو برس تک یوں ہی غیر مطبوعہ رہا۔ کہ ۱۹۰۸ میں ہری ناتھ دے نے حمید میر کے اضافے کے ساتھ اصل نسخے کو امپیریل لائبریری کلکتہ سے شائع کرایا۔

صولت عالم گیری

'' صولت عالم گیر'' ایک تاریخی ڈرامہ ہے۔ جس کے مصنف سید ابوالفضل رنگپوری ہیں۔ یہ کتاب ۱۰۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ چونکہ کتاب کے ابتدائی صفحات ناپید ہیں لہذا اس اشاعت

اور مقام اشاعت کا پتہ نہیں چلتا۔لیکن دیباچے کے مطالعے سے اس بات کی توثیق ضرور ہوتی ہے کہ یہ انیسویں صدی کی تصنیف ہے۔کیونکہ مصنف ایک جگہ لکھتے ہیں:

’’ اس کتاب کی تصنیف میں اہل انگلستان کا اتباع اور حتی الامکان قوانین کا پاس کیا ہے یعنی یہ انیسویں صدی کے اس زمانے کی تصنیف ہے جب ہمارے ملک میں لکھنے والے حضرات انگریزی طرز اسلوب اور فن کا اتباع کر رہے تھے۔یہ کتاب بھی اسی عہد میں لکھی گئی۔‘‘

تاریخی اہمیت: ڈرامے کا موضوع خالص تاریخ ہے دکن میں اورنگ زیب عالم گیر اور مرہٹوں کے سردار شیواجی کے بیٹے سنبھاجی جن کے درمیان جو لڑائی ہوئی۔اس واقعے کو مصنف نے ڈرامے کے انداز میں پیش کیا ہے۔ڈرامے کا خاتمہ اورنگ زیب عالم گیر کی فتح اور مرہٹوں کی شکست پر ہوتا ہے۔اس ڈرامے میں مصنف نے اورنگ زیب کا کردار اجاگر کرنے اور مرہٹے قوم کو عیار اور چال باز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔مصنف کا واضح مقصد یہ تھا کہ کردار و جنگی نکتہ نگاہ سے مسلمانوں کی فوقیت کو برقرار رکھا جائے۔

زبان واسلوب بیان: ڈرامے کی زبان نہایت سادہ اور عام فہم ہے۔لیکن مصنف چونکہ بنگالی نژاد تھے اس لئے جا بجا مکالموں میں بنگالی الفاظ کی آمیزش ہوگئی ہے۔اس وجہ سے ایک غیر فطری فضا پیدا ہو جاتی ہے جو اس ڈرامے کے لطف کو کم کر دیتی ہے۔تمام مکالمے نثر میں ہیں۔صرف ایک دوجگہ غزلیں ہیں۔غالباً اردو زبان میں مکالمہ کی حیثیت سے یہ پہلا ڈرامہ ہے۔مصنف نے اکثر مضامین کو تاریخ سے لے کر پیرائیہ خام پہنایا ہے۔[۴۲]

تواریخ ڈھاکہ

تعارف: ’’تواریخ ڈھاکہ‘‘ کے مصنف رحمان علی طیش ہیں۔اس کتاب کا حجم ۳۵۲ صفحات ہے۔اس کتاب میں ڈھاکہ کی تاریخی، سماجی اور ادبی گوشوں کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔

حالات زندگی: رحمان علی طیش ڈھاکہ کے بااخلاق اور باوضع بزرگوں میں سے تھے۔اور ڈھاکہ میں رجسٹری آفس میں ملازمت کرتے تھے۔وہ اچھے شاعر، مورخ اور نثر نگار تھے۔ان کی ایک تصنیف ’ گلزار نعت ‘ ، نعتیہ قصائد وغزلیات کا مجموعہ ہے۔دوسری تصنیف ’’گلدستہ خیال‘‘ ہے۔تیسری ’’گلشن قدرت‘‘ بچوں کی تعلیم کے لیے ایک مفید کتاب ہے۔ان کے علاوہ ان کی تصنیفات میں دیوان طیش، مناظرہ آہن وزرو معرکہ شہر و دیہات بھی قابل ذکر ہیں۔لیکن طیش کی معرکۃ الآرا تصنیف ’’تواریخ ڈھاکہ‘‘ ان سب کتابوں پر سبقت رکھتی ہے۔

طیش نے ۱۹۰۸ء میں ڈھاکہ میں انتقال کیا۔اور ڈھاکہ میں ہی دفن ہوئے۔

تاریخی اہمیت: ڈھاکہ کی تاریخ جاننے کے لئے ’’تواریخ ڈھاکہ‘‘ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ڈھاکہ کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: کہ ڈھاکہ تقریباً ایک سو برس تک بنگال، بہار اور اڑیسہ کا دارالسلطنت رہا ہے۔اسلام خان نے شہر ڈھاکہ آباد کرکے اس کا نام جہانگیر نگر رکھا اور دار السلطنت سونار گاؤں سے منتقل کر کے ڈھاکے میں لایا۔[۴۳] اس دوران جتنے صوبہ دار دہلی سے یہاں آئے سب اپنے ساتھ ہر فرقے کے لوگوں کو لائے گئے اور ہر فن وحرفہ کے لوگ یہاں آ کر بسے۔اہل علم، اہل قلم، اہل سیف، اہل حرفہ وصنعت، اہل تجارت، خیاط، زردوز، رفوگر، ارباب نشاط، نان پز، حلوائی وغیرہ۔سب دہلی سے آئے۔یہ

شہر اس وقت وسعت و آبادی اور علم وحرفت میں دہلی کا نمونہ تھا اور بڑے بڑے صاحب دولت اور امیر کبیر اس شہر میں تھے۔[۴۴]

ڈھاکہ صنعت وحرفت کے میدان میں بھی بہت اہمیت کا حامل تھا۔ چنانچہ زرگری، مرصع سازی، رزدوزی، رفوگری، چکن سازی اور بادلہ کشی جیسی صنعتیں یہاں ہوتی تھی وہ بنگال میں اور کہیں نہیں۔ سوتی کپڑے کے باب میں بھی ڈھاکہ لاجواب تھا۔ انہیں کپڑوں کی تجارت کے واسطے غیر ولایت کے لوگوں نے یہاں آکر بذریعہ تجارت لاکھوں روپے کمائے اور بڑی بڑی زمیں داریاں اور کائنات حاصل کیں۔[۴۵]

''تواریخ ڈھاکہ'' باب اول (صفحہ ۱۰ تا ۲۲ تک) میں ڈھاکہ کی زمیں، حدود اربعہ، ندیاں، پرگنہ جات اور تھانہ جات کا بیان ہے۔

باب دو: (صفحہ۲۳ تا ۳۰)اس باب میں ہندوراجگان کی سلطنت کا ذکر ہے۔

باب سوم: (صفحہ ۳۰ سے تا ۳۶) اس باب میں ڈھاکہ میں اسلامی سلطنت کا قیام اور افغانوں کی آمد کا بیان ہے۔

باب چہارم: (صفحہ۳۷ تا۴۰) اس باب میں افغانوں کی حکومت،، بعد ازاں حکومت کا مغلوں کے ہاتھ چلے جانے کا ذکر ہے۔

باب پنجم: (صفحہ ۴۱ تا ۵۱) اس باب میں سلطنت مغلیہ کا قیام اور سلطان محمد شجاع کی آمد سے پہلے تک واقعات درج ہیں۔

باب ششم: (صفحہ ۵۲ تا ۵۷) اس باب میں سلطنت سلطان محمد شجاع تا ابتدائے حکومت شائستہ خان کا ذکر ہے۔

باب ہفتم: (صفحہ ۵۷ تا ۶۳) اس باب میں شائستہ خان کی حکومت کا بیان ہے۔ شائستہ خان کا وقت بہت امن وچین کا تھا۔ اور شہر نہایت آراستہ اور ہر طرح کے کارخانہ جات، بازار اور عمارات سے معمور تھا۔[۴۶]

باب ہشتم (صفحہ ۶۴ تا ۶۷) اس باب میں ابراہیم خان کی صوبہ داری کے عہد میں ظہور پذیر واقعات کا بیان ہے۔

باب نہم: (صفحہ ۶۹ تا ۷۵)اس باب میں شاہزادہ محمد عظیم کا ڈھاکہ آنا اور یہاں صوبہ داری کے فرائض انجام دینے کے واقعات درج ہیں۔

باب دہم: (صفحہ ۷۶ تا ۷۹) اس باب میں مرشد قلی خان کی صوبہ داری کا بیان ہے۔

باب یازدہم: (صفحہ ۸۰ تا ۸۷) اس باب میں شجاع الدین کی نظامت کا ذکر ہے۔

باب دوازدہم: (صفحہ ۸۷ تا ۹۶)اس باب میں علی وردی خان صوبہ دار بنگالہ کے عہد کے واقعات درج ہیں۔

باب سیزدہم: (صفحہ ۹۷ تا ۱۰۱) اس باب میں نواب سراج الدولہ کی تخت نشینی اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات درج ہیں۔

باب چہاردہم: (صفحہ ۱۰۱ تا ۱۰۴) اس باب میں انگریزوں کا کلکتہ آنا اور بنگال فتح کرنا درج ہے۔

باب پانزدہم: (صفحہ۱۰۴ تا ۱۰۹) اس باب میں میر محمد جعفر خان کا مسند صوبہ داری بنگالہ و بہار پر بیٹھنا درج ہے۔

باب شانزدہم: (صفحہ ۱۱۰ تا ۱۱۱) یہ باب ذکر صوبہ داری میر محمد قاسم خان ہے۔

باب ہفتدہم: (صفحہ ۱۱۲ تا ۱۱۵) اس باب میں لارڈ کلایو کا ۱۷۶۵ میں کلکتہ آنا اور الہ

آباد جا کر شاہ عالم سے مسند دیوانی بنگال، بہار اور اڑیسہ کا بنام کمپنی حاصل کرنا اور اسی سال ڈھاکہ اور مرشد آباد میں دو کچہریوں کا مقرر کرنا درج ہے۔ ایک حضوری اور دوسری نظامات، حضوری کچہری میں مقدمات امور سلطنت اور معاملات بندوبست خزانہ، اور نظامات کی کچہریوں میں مقدمات عدالت فوجداری اور انجام امور اخراجات ریاست کے ہوتے تھے۔[۴۷]

باب ہیزدہم (صفحہ ۱۱۶ تا ۱۱۸) میں ذکر عہد حکومت لارڈ ہیسٹنگز ہے۔

باب نوازدہم (صفحہ ۱۱۹ تا ۱۲۴) اس باب میں ذکر عہد حکومت لارڈ کارنوالیس ہے۔

باب بستم (صفحہ ۱۲۴ تا ۱۳۰) اس باب میں لارڈ مویرا کی حکومت کا بیان ہے۔

باب بست و یکم: (صفحہ ۱۳۰ تا ۱۴۲) اس باب میں ۱۸۵۷ء میں ڈھاکہ کے سپاہیوں کی حکومت کے خلاف بغاوت اور اس سلسلے میں پیش آنے والے واقعات کا بیان ہے۔

باب بست و دوم: (صفحہ ۱۴۳ تا ۱۵۶) اس باب میں کمپنی کی عملداری کا خاتمہ اور پانچ نومبر ۱۸۵۷ء کو سلطنت ہندوستان کا ملکہ وکٹوریہ کے تحت چلے آنے کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد مختلف گورنر جنرل اور لفٹنٹ گورنر صاحبان بنگال کے نام اور ان کے عہد میں وقوع پذیر اہم واقعات ہیں۔

باب بست و سوم: (ص ۱۵۶ تا ۱۷۲) یہ باب نائب ناظمان ڈھاکہ کے لئے مخصوص ہے۔

باب بست و چہارم: (صفحہ ۱۷۲ تا ۱۸۰) اس باب میں اولیاء کرام کا ذکر ہے جس میں ان کے مختصر حالات بھی درج ہیں۔

باب بست و پنجم (صفحہ ۱۸۱ تا ۱۸۶) اس باب میں دھاکہ کے قدیم رؤسا اور عمایدہ کا ذکر ہے۔

باب بست و ششم (صفحہ ۱۸۷ تا ۱۹۸) اس باب میں ان رؤسا کا ذکر ہے جو نواب نصرت کے ہم عصر تھے۔

باب بست و ہفتم: (صفحہ ۱۹۸ تا ۲۰۶) اس باب میں ان رؤسا کا ذکر ہے جو بعد نواب نصرت جنگ کے تھے۔ ان کے مختصر حالات زندگی بھی درج ہیں اس باب میں ان مسلمان حاکموں کا بھی تذکرہ ہے جو اس وقت اعلی عہدوں پر فائز تھے۔ پھر وکلائے ڈھاکہ کا بیان ہے جو اس شہر میں وکالت کرتے تھے۔ اسی باب کے تحت خوش نویسان ڈھاکہ، ہندو حکام و عہدہ داران ڈھاکہ، ہندو زمین دار، پہلوان ڈھاکہ، نامور و کلاونت ڈھاکہ، مدرسہ ڈھاکہ، اس کا اجرا اور اس کے مختلف شپرنٹنڈ صاحبان کا بیان ہے۔

باب بست و ہشتم: (صفحہ ۲۴۸ تا ۲۵۳) اس باب میں ڈھاکہ کے نواب جن کا تعلق خواجہ خاندان سے تھا ان کا ذکر ہے۔

باب بست و نہم: (صفحہ ۲۵۳ تا ۳۱۰) اس باب میں ڈھاکہ کی قدیم عمارتوں یعنی مسجدوں، قلعہ لال باغ، بڑا کٹرہ، چھوٹا کٹرہ، نیم تلی کا نوابی مکان، حسینی دالان، عیدگاہ، دار بیگم کا مقبرہ، گرونانک کا کنواں، مختلف مندر، پل، چک بازار، درگاہ، سرکاری عمارتیں اور محل جزیرہ شامل ہیں۔ پھر سنار گاؤں کی قدیم تعمیرات، بکرم پور میں بلال باڑی کے مقام پر بلال مین کا محل، راجہ باڑی کا مٹھ، مختلف مسجدیں اور سرکاری عمارتیں شامل ہیں۔

باب سی ام: (صفحہ ۳۱۰ تا ۳۱۴) اس باب میں ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو تقسیم بنگال کا ذکر ہے۔ جس کے نتیجے کے طور پر ڈھاکہ کی اہمیت از سر نو بڑھ گئی۔

اس بارے میں رحمان علی طیش کہتے ہیں:۔

> ڈھاکہ جو کسی وقت اسلامی دار السلطنت تھا ایک مدت دراز کے بعد سلطنت انگلیشیہ میں پھر راجدھانی قرار پایا۔ زمانے نے کروٹ

دلی۔اس کے سوتے ہوئے نصیب جاگ اٹھے اور ترقی کی ایک نئی
ہوا چلنے لگی۔[48]

اس کے بعد نئی عمارات جو ڈھاکہ میں تعمیر ہوئیں ان کی ایک فہرست ہے۔ باب سی وکیم (صفحہ ۳۱۴ تا ۳۴۵) اس باب میں ڈھاکہ کے اردو و فارسی شعراء کا تذکرہ ہے۔ جو ادبی نقطہ نگاہ سے بہت اہمیت کا حاصل ہے۔ یہ تذکرہ شعرء اخواجہ محمد افضل نے اس کتاب کے لئے عنایت کیا تھا۔

چنانچہ ''تواریخ ڈھاکہ'' ڈھاکہ کی تاریخ جاننے کا ایک مستند ذریعہ ہے۔ اس کے مطالعے سے ڈھاکہ کی فضیلت، ہندو راجاؤں، مسلمان حکمرانوں اور انگریز حاکموں کے عہد میں ڈھاکہ کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ خصوصاً انگریزوں کے عہد میں ڈھاکہ جو انتظامی، مالیاتی، عدالتی اور تعلیمی اصلاحات ہوئیں ان کا سن وار ذکر ہے۔ اس کے علاوہ ڈھاکہ میں ۱۷۷۰ء میں جو قحط عظیم واقع ہوا، جس کے نتیجے میں ڈھاکہ ''کئی قعم'' آباد ہوئی۔ اس کا ذکر اسی کتاب میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ڈھاکہ کے گلوکار اور موسیقار اور ڈھاکہ کے اردو فارسی شعراء کا ذکر سب سے پہلے اس کتاب میں درج ہے۔

زبان وبیان اسلوب: ''تواریخ ڈھاکہ'' اردو زبان میں لکھی گئی ہے۔ کتاب کی زبان نہایت عام فہم ہے۔ مصنف نے اپنا مدعا سیدھے سادھے الفاظ میں ادا کر دیا ہے۔ جس میں گنجلگ، تعقید اور ابہام نام کو نہیں۔ جس کی وجہ سے ہر پڑھنے والا کتاب سے لطف اندوز ہو سکتا ہے اور گذرے ہوئے ڈھاکہ کے واقعات سے خط اٹھا سکتا ہے۔

اشاعت: ''تواریخ ڈھاکہ'' رحمان علی طیش کی وفات کے بعد ان کے بیٹے احمد علی نے اسٹار آف انڈیا آرہ سے چھپوائی اور حسب ضرورت تاریخ میں کچھ ترمیم و اضافہ بھی کیا۔

تواریخ ہند

تعارف: ''تواریخ ہند'' کے مصنف مولوی عبدالکریم ہیں۔ یہ تاریخ انیسویں صدی میں ان حالات میں لکھی گئی جب ہندوستان میں مدارس کی تعلیم کے واسطے کسی مسلمان کی تالیف موجود نہ تھی عبدالکریم نے ایک نہایت عمدہ اور کار آمد تصنیف سے ہندوستانیوں کو مرہون احسان کیا اور نہایت متین اور سنجیدہ اردو زبان میں تواریخ ہندوستان لکھ کر ان غلط فہمیوں کو دور کیا ہے۔ جو انیسویں صدی میں ہندوستانیوں کے دل و دماغ میں نقش کا الحجر ہو چکی تھیں۔ کیونکہ اس سے قبل اکثر کتابیں تاریخ کی ایسے لوگوں کی زبان سے نکل کر شائع ہو چکی تھیں جنکو مذہبی تعصب کے علاوہ اور کوئی کام نہ تھا۔[49]

حالات مصنف:۔ مولوی عبدالکریم سلہٹ کے رہنے والے تھے۔ لیکن ان کی پیدائش ۲۰ آگست ۱۸۶۳ میں بمقام کلکتہ ہوئی۔[50] ابتدائی تعلیم سلہٹ سے حاصل کرنے کے بعد ۱۸۸۹ میں پریسڈنسی کالج سے انگلش میں آنرز کی ڈگری حاصل کی۔[51] علم وادب کی خدمات کے علاوہ سیاست میں بھی حصہ لیتے تھے۔ ہندوبنگال قانون ساز کونسل کے ممبر تھے۔ ان کا نام بنگال کی ان معدودے چند قابل ہستیوں میں ہے جنہوں نے انگریزی اور اردو زبان کی تعلیم و ترقی میں بے لوث خدمات انجام دیں۔[52] اور مسلم ثقافت پر بنگلہ، انگریزی اردو اور ہندی میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ انہوں نے اگست ۱۹۴۳ میں انتقال کیا۔[53]

تاریخی اہمیت: ''تواریخ ہند''. ہندوستان کے مختلف حصوں کا بیان یعنی ہند کی قدرتی تقسیم، انتظامی تقسیم اور یہاں کے قدیم باشندوں کے ذکر سے شروع ہوتی ہے۔ اور اس کی انتہا لارڈ

ریڈنگ (۱۹۲۱ء) تک ہوتی ہے۔ ابتدائیہ میں ہندوستان کی زمین کی ساخت، پیداوار اور آبادی کا ذکر ہے اور ساتھ ہی یہاں کے قدیم باشندوں کا حال اور مختلف عہد میں یہاں حکومتوں کا بیان ہے۔

فصل اول میں قوم آریا کا بیان ہے۔ ان کے مختلف فرقے اور ہندوستان میں ان کے عمل و کردار کا ذکر ہے۔

دوسری فصل میں ہندوؤں کی متبرک کتابیں اور ان کی خصوصیات درج ہیں۔

تیسری فصل میں بدھ اور اس مذہب کے بانی اور عقائد کا بیان ہے۔

چوتھی فصل میں ہندوستان پر غیر ملکی قوموں کے حملہ کا بیان ہے۔ جن میں قابل ذکر سکندر اعظم کا حملہ ہے۔

پانچویں فصل میں ہندوتان کے مختلف حصوں پر قوم آریا کی سلطنت کا بیان ہے۔

قدیم سلطنتوں میں ایک اجودھیا کی حکومت تھی جسے اب اودھ کہتے ہیں۔ دوسری سلطنت متھیلا کی تھی جسے آج کل ترھٹ کہتے ہیں۔ آرسا کے لوگوں کی دو اور قدیم عمل داریاں پانڈوؤں اور پنچلونس کے نام سے ہو گذری تھیں۔ پاندوؤں کی راجد ہانی ہستینا پور پور دہلی سے اتر پورب گوشے (میرٹھ) پر واقع تھی اور پنچلون کا پائے تخت قنوج کے نزدیک کمپیلیا میں تھا۔ دکن میں بھی آریا قوم کی بڑی بڑی سلطنتیں قائم تھیں۔ ان کے علاوہ بہار، بنگال، قنوج اور مالدہ میں بھی ان کی حکمرانی تھی۔

چھٹی فصل میں ہند میں اسلامی سلطنت کی ابتداء کا بیان ہے۔ اس سلسلے میں ۷۱۲ میں سندھ پر عربوں کا حملہ، سلطان محمود (۹۹۸۔۱۰۳۰) کی ہندوستان پر سترہ چڑھائیاں اور شاہان غور (از ۱۱۴۸ تا ۱۲۱۵) کا ذکر ہے۔

ساتویں فصل میں ہندوستان کے پٹھان بادشاہوں کا بیان ہے اس کے تحت غلام بادشاہان (از ۱۲۰۶ تا ۱۲۸۷) شاہان خلجی (از ۱۲۹۰ تا ۱۳۲۰) شاہان تغلق (از ۱۳۲۰ تا ۱۴۱۲) اور شاہان سید اور لودھی (از ۱۴۱۴ تا ۱۵۲۶) کا بیان ہے۔

آٹھویں فصل میں سلطنت دہلی کی ہمسر سلطنتوں کا بیان ہے۔ جن میں دکن میں بہمنی سلطنت (از ۱۳۴۷ تا ۱۵۲۶) بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت (از ۱۴۸۹ تا ۱۶۸۶)، احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت (از ۱۴۹۰ تا ۱۵۹۵) گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت (از ۱۵۱۲ تا ۱۶۸۷)، برار کی عماد شاہی سلطنت (از ۱۴۸۴ تا ۱۵۷۲) اور بنگال میں اسلامی حکومت کی ابتداء از محمد بختیار الدین خلجی (۱۲۰۲) تا کرارانی عہد کے بادشاہ داؤد شاہ بن سلیمان (۱۵۷۲ء) تک ذکر ہے۔

نویں فصل میں مغل بادشاہوں کا بیان ہے۔ ہندوستان میں مغل سلطنت کی بنیاد ظہیر الدین محمد بابر نے ۱۵۲۶ میں رکھی تھی اور ۱۸۲۶ میں بہادر شاہ ثانی کی قضا کے ساتھ اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ اس فصل میں مصنف ۱۵۲۶ سے لے کر ۱۸۲۶ تک تخت نشین تمام مغل بادشاہوں کا مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔

دسویں فصل میں مرہٹوں کا بیان ہے۔

گیارہویں فصل میں ہندوستان میں یورپین قوموں کی عملداری کا بیان ہے۔ جن میں پرتگیز، ولندیز، فرنسیس اور انگریز شامل تھے۔

بارہویں فصل میں ہندوستان میں انگریزی سلطنت کی ابتداء کا ذکر ہے۔ لارڈ رابرٹ کلایو نے ۱۷۹۹ میں ہندوستان میں فرانسیسیوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک دم نیست نابود کر دیا اور رفتہ رفتہ بنگال اور یکے بعد دیگرے ہندوستان کے دوسرے علاقوں پر اپنا قبضہ جمالیا۔

تیرہویں فصل میں ایسٹ انڈیا کمپنی حکومت اوراس کے تحت مختلف گورنر جنرل کی ہندوستان آمداور تقرری کا بیان ہے۔

چودھویں فصل میں ہندوستانی عوام کی انگریزی کے خلاف بدظنی اور ۱۸۵۷ء میں دیشی فوج کی بغاوت کی روداد ہے۔لیکن انگریزی فوج نے اس سے سختی سے فرو کیا۔ اورکل ہند میں انگریزوں کا تسلط خوب جم گیا۔

پندرہویں فصل میں ہندوستان میں شاہان انگلستان کی حکومت کے قیام کا ذکر ہے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد اہل انگلستان کو یہ معلوم ہوگیا کہ کمپنی سے اتنی بڑی سلطنت کا انتظام دشوار ہے۔ لہذا یہ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد ہندوتان کی عنان حکومت ملکہ معظّمہ وکٹوریہ نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ان کی طرف سے لارڈ کننیت (۱۸۵۶ءتا۱۸۶۱ء) پہلے واسرائے مقرر ہوئے۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا ہوآخر میں لارڈ ریڈنگ تک پہنچا جواپریل ۱۹۲۱ء میں ہندوستان آئے۔ فی الواقع'' تواریخ ہند'' میں عبدالکریم نے اس قدر بسیط مضامین کواس قلیل صحامت میں ختم کرکے دریا کوکوزہ میں بندکردکھانے کی مشہور مثل زبانی کو عملی طور پر بھی پورا کرکے دکھایا ہے۔تمام واقعات کوایسا مفصل اور ساتھ ہی اس کے ایسے مختصر الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جو مصنف کی بےنظیر قابلیت کا ایک اعلی درجہ کا نمونہ ہے۔

یہ کتاب تمام تاریخ ہند کا لب لباب ہےاوراپنی جامعیت کی وجہ سے بڑی بڑی ذخیم تواریخ ہندوستان کے دیکھنے سے مستغنی کردیتی ہے۔

زبان وبیان اسلوب: کتاب اردو زبان میں ہے۔طرز ادا کی برجستگی ،عبارت کی لطافت واقعات کی ترتیب،نتائج کا استنباط قابل رشک ہے۔[54] عبارت نہایت شستہ اورسلیس ہے اورفقرے بہت صاف ، ہرایک واقعہ فروعات سے بری ہے۔اور صرف اس کا لب لباب

درج کیا گیا ہےلیکن نہ اس اختصار کے ساتھ کہ طبیعت کوالجھن پیدا ہو۔[55]

اشاعت:'' تواریخ ہند'' پہلی مرتبہ ۱۸۹۶ء میں چھپی تھی۔اس کے بعد مزید گیارہ بار چھپی۔ چنانچہ بار دواز دہم مچھوابازار کلکتہ سے ۱۹۲۴میں چھپی۔

حوالہ جات

۱۔ نساخ۔ص۴۲

۲۔ جامع التواریخ (لکھنو،مطبوعہ نولکشور پریس،۱۸۹۷ع)ص ۳

۳۔ایضاً، ص ۳

4. Bradley-Birt, F.B. Twelve men of Bengal (Third Edition) (Calcutta : S.K. Lahiri Co. 1968) P. 112

5. Enamul Haq, Abdul Latif his writings and Related Documents (Dhaka: Samudra Prokashani, 1968) P. 123

۳۔ نساخ،ص۴۲

7. Buckland, C.C. Bengal Under Lieutenant Governors Vol. II, (New Delhi: Deep Publication, 1976) P. 1061

۸۔ آئینہ ویلیسی،ص ۸۹۔۸۸

۹۔ عبداللہ محمد ڈاکٹر، بنگلہ دیشے فارسی ساہتیہ(ڈھاکہ: اسلامیک فاونڈیشن،۱۹۸۳) ۲۹۲

۱۰۔ احادیث الخوانین، ص ۳۲۲

۱۱۔ تاریخ حمید،ص ۲۸

۱۲۔ آئینہ ویسی، مطبع الرحمٰن،ص ، ۹۱۔۹۰

13. Chittagong District Gazetter, 1975, P. 356

14. Cultural Heritage, P. 117

۱۵۔صحیفۃ الاعمال،ص ۷

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۸
۱۷۔ صحیفۃ الاعمال ص ۲۴۹
۱۸۔ نساخ،ص ۲۱۰۔۲۰۹
۱۹۔ گنج تواریخ،ص۶
۲۰۔ نساخ،ص ۲۱۱
۲۱۔ گنج تواریخ،ص ۸۷
۲۲۔ کنز تاریخ۔ص ۵۰
۲۳۔ ایضاً۔ص ۵۰
۲۴۔ تواریخ ڈھاکہ صفحہ ۳۳۸
۲۵۔ ثلاثہ غسالہ از حکیم حبیب الرحمٰن،ص ۱۴۶
۲۶۔ سخن شعراء ص ۲۷۸
۲۷۔ مشرقی بنگال میں اردو ص۶۳
۲۸۔ مشرقی بنگال کے اردو ادب (مجموعہ مضامین) (کراچی،ادارۂ مطبوعات پاکستان، ۱۹۵۱)ص ۱۹
۲۹۔ تواریخ خاندان کشمیریہ، ص ۲۳۸
۳۰۔ تواریخ خاندان کشمیریہ ص ۱۹
۳۱۔ ایضاً ص ۳۱
۳۲۔ ایضاً،ص ۳۲
۳۳۔ ایضاً، ۴۳
۳۴۔ ایضاً،ص ۱۳۰
۳۵۔ ایضاً،ص ۱۳۴
۳۶۔ ایضاً،ص ۲۲۵

۳۷۔ ایضاً،ص ۲۶۷
۳۸۔ جنگ ہفت سالہ، ص ۷۶
۳۹۔ تواریخ ڈھاکہ،ص ۱۵۸
40. Glimpses of Old Dhaka, Pp. 236.237
۴۱۔ تواریخ جہانگیر نگر،ص ۱۶
۴۲۔ ثلاثہ غسالہ، ص ۲۷۵
۴۳۔ تواریخ ڈھاکہ ،ص ۷
۴۴۔ ایضاً، ص ۵
۴۵۔ ایضاً، س ۶
۴۶۔ ایضاً، س ۶۳
۴۷۔ایضاً، ،ص ۱۱۳
۴۸۔ایضاً، ص ۳۱۶
۴۹۔آگرہ اخبار ۱۴جون۱۸۹۶ء
50. Naresh Kumar Jain (ed) Muslims in India (New Dehli Monohar Publication, 1979) P. 14
51. Ali Azam Md. Life of Moulavi Abdul Krarim (Calcutta : 1939) P. 11
۵۲۔ سلہٹ میں اردو،ص ۱۱۸
53. Mujeeb M. The Indian Muslims (London: George Allen and Unwin Ltd, 1957) P. 546
۵۴۔ شبلی نعمانی،معارف اعظم گڑھ،جون۱۸۹۶(ماخوذ از تواریخ ہند)
۵۵۔ آزاد لکھنو ۲۳ اپریل سنہ ۱۸۹۹(ماخوذ از تاریخ ہند)

باب پنجم

بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو میں سماجی تاریخ کے مآخذ

خیالات آزاد

''خیالات آزاد'' میں انیسویں صدی کی سماجی تاریخ کو طنز وظرافت کے آئینے میں دکھایا ہے۔

حالات مصنف: سید محمد آزاد ۱۸۴۶ میں ڈھاکہ میں پیدا ہوئے۔سید محمود آزاد ان کے بڑے بھائی تھے۔رؤسائے وقت کی روایت کے مطابق ان کی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔اور آقا محمد علی اصفہانی جیسے معلم کی شاگردی اختیار کرنے کا شرف حاصل ہوا۔تکمیل تعلیم کے بعد نواب صاحب نے سرکاری ملازمت میں قدم رکھا اور سب رجسٹرار کے عہدے سے ترقی کرتے کرتے انسپکٹر جنرل آف رجسٹریسن ہوئے اور خدمات کے صلہ میں خان بہادر اور نواب کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ بنگال کونسل میں دومرتبہ ممبر منتخب ہوئے۔۱۹۱۲ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور ۱۹۱۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔[1]

نواب صاحب اپنے زمانے کے بہترین انشاپرداز تھے۔ان کے مضامین''اودھ پنچ'' لکھنوٗ

کے علاوہ'' آگرہ اخبار'' آگرہ،''مشیر قصیر'' لکھنو،'' اکمل الاخبار'' دہلی، ''دوربین'' دہلی اور کلکتہ کے انگریزی'' رئیس انڈ رعیت'' میں شائع ہوتے تھے۔وہ آزاد کے علاوہ وہ اپنے فرض نام''سعید ازلی''، ''تیغ بے نیام''،''لیڈی خروش''، '' صوفیہ''، ''ستائش نیچر''،'' فطرت''،''تمدنی سوپر'' ،''کوئی نہیں'' اور'' نئی روشنی کا ہستی سوز چراغ'' کے نام سے مضامین چھپواتے تھے۔[2]

مضامین: (۱) باب نمبر اول سے نہم تک ڈکشنری کا پرایہ اختیار کیا گیا ہے۔(۲) دس سے ۱۷ ابواب تک نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے یہ خطوط جو مختلف حیثیتوں سے لکھے گئے ہیں تعداد میں پندرہ ہیں۔''سات خط'' سعید ازلی کی طرف سے پانچ خط '' تیغ بے نیام'' کی طرف سے مولانا اودھ پنچ کو اور تین خطوط ایک'' ولایتی میم'' کی طرف سے جو اپنے دیسی شوہر کے ساتھ ہندوستان آئی ہے۔۳۔اٹھارہ سے چھبیس ابواب میں مختلف موضوعات پیش کئے گئے ہیں۔

تاریخی اہمیت:''خیالات آزاد'' کے مطالعے کے ہندوسانی سماج کے معاشرتی رجحانات کی تاریخ کا سراغ ملتا ہے۔انگریزوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد یہاں مشرقی اور مغربی تہذیب کے درمیان جو تصادم ہوااس نے ملک میں اسلامی اقدار کو بہت زک پہنچایا۔اسلامی تہذیب کا شیرازہ بکھر جانے کا پورا پورا خطرہ تھا۔ہندوستان کی تاریخ کا یہ دور مختلف رجحانات کے تصادم کا دور تھا۔تاہم اس دور میں مغربی تہذیب کو اپنانے کی روش ہی سب سے زیادہ نمایاں تھی۔صدیوں کے منجمد معاشرے میں یکا یک ایسا اندرونی تموج پیدا ہوگیا تھا کہ ملک کا باشعور طبقہ اندھا دھند مغربی افکار کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کا مقلد ہونے لگا۔[3]

''خیالات آزاد'' کو یہ تاریخی اہمیت حاصل ہے کہ اس نے مغرب کی اندھا دھند تقلید کو ہدف طنز بنایا۔ وہ بھی اپنے دور کے لکھنے والوں کی طرح مشرق کے دلدادہ اور مغربیت کے مخالف ہیں۔ ان کے طنز کی تان بھی سیاست اور معاشرے پر ٹوٹتی ہے۔[4]

''خیالات آزاد'' میں کہیں ڈکشنری کا انداز اختیار کر کے نئی تہذیب اور نئی روشنی کے رنگا رنگ مظاہر کو الفاظ کے مطالب و مفاہیم کے انوکھے روپ میں یوں پیش کیا ہے کہ الفاظ کے مروجہ لغوی معنی تو پس منظر میں غائب ہو جاتے ہیں اور نئے نئے مطالب وتشریحات کے مرغزار لہلہاتے ہوئے نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔[5]

مثلاً سویلائزیشن (تہذیب) اپنے اہم وطن کو نیم وحشی جاننا۔ اپنے بزرگوں کو اولڈ گوس کہنا۔ جاکٹ پہننا۔ آلو کھانے کا شوق۔ شراب پینے کا ذوق۔ دم دار ٹوپے کا استعمال۔ گردن مروڑی مرغی حلال۔ البرٹ فیشن سے بالوں کو ترشوانا۔ تیل کے عوض ریچھ کی چربی سر میں لگانا۔ ولایت سے میم لانا۔ انگریزی جانیں یا نہ جانیں مگر اخبار پڑھنا۔ ہارمنیم کی گت پر برانڈی کی دھن میں پیروں سے تال دے دے کر ناچنا۔

فیمل ایجوکیشن: (تعلیم نسواں) عام جلسوں میں اپنی بہو بیٹیوں کو لے جانا اپنی میم کا ناچنے کے جلسے میں ایک وقت کے لئے دوسرے کی میم سے مبادلہ کرنا۔ کمزور لڑکیوں کو تھوڑا تھوڑا پوٹ پلانا۔ مس بابا لوگوں کو ہوا کھلانا۔ کالی میموں کو انگریزوں کی ملاقات کے لئے جبراً وقہراً لے جانا۔ اگر وہ وہاں جا کر شرمائیں تو جوش تہذیب سے گھونگھٹ کھول دینا۔

ڈکشنری کے بعد پندرہ خطوط ہیں۔ ان خطوط میں آزاد صاحب نے مغربی تہذیب و معاشرت پر لطیف انداز میں طنز کیا ہے۔ اور مغربی تہذیب کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔ جیسا کہ اس خط میں:

یہاں ہر شخص اپنی قوت بازو سے کما کر کھاتا ہے اور اپنی کمائی سے باپ تک کو ایک حبہ نہیں دیتا۔ باپ کو بیٹے اور بیٹے کو باپ سے کچھ کام نہیں۔ ہر کوئی اپنا سر و سامان مہیا کرنے اور کمانے میں خود مشغول ہے۔[6]

ایک اور خط میں یوں رقمطراز ہیں:۔

یہاں مردوں کو قواعد اخلاق کے مطابق اس کا کام اختیار نہیں کہ اپنی عورتوں کو کسی سیر گاہ یا نمائش گاہ یا تماشا خانے یا جلسے میں جانے سے کسی وقت جبراً روک لیں یا ان کو مرد دوستوں سے ملنے جلنے نہ دیں یا ان کے کسی خاص مقدمہ دوستی میں دست اندازی کریں یا ایسی باتوں کہ نہ ماننے پر ان سے ترش رو ہو کر بولیں یا ان کو ملامت کریں یا دھمکائیں۔[7]

آزاد نے ہندوستان میں رہ کر مغرب کی کھوکھلی معاشرت کا کامیاب خاکہ اتارا ہے۔ اور مغربی تہذیب کے دلدادہ نئی نسل کا ایک انتہائی دلچسپ خاکہ کھینچا ہے۔ جب مغربی تہذیب آہستہ آہستہ ہندوستان کے سماج پر اثر انداز ہو رہی تھی اور ملک کا ایک طبقہ اس کی طرف مرغوب نظر آرہا تھا انہوں نے خطوط میں اس تہذیب کے خلاف طنزیہ لہجہ اختیار کر کے عوام کو اس کے برے اثرات سے متنبہ کیا ہے۔

زبان و اسلوب بیان: سلاست روانی، بے ساختگی اور شگفتگی سید محمد آزاد کے اسلوب نگارش کے نمایاں اوصاف ہیں۔ جذبے اور احساس کی شدت بھی ہر جگہ موجود ہے لیکن انہوں نے تلخ ترین حقائق کو بھی شوخی وظرافت سے جو ان کا خلقی جو ہر معلوم ہوتا ہے، اس طرح پیش کیا ہے کہ نیش عقرب میں لطف و کیف کھول دیا ہے۔ ان کی ظرافت کی تہ میں نہایت عمیق ولطف

معنے پنہاں ہوتے ہیں اور کوئی نہ کوئی حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے۔ان کا قلم معاشرتی زندگی کے گونا گوں پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ان کے ہاں الفاظ اور معانی ایک دوسرے سے وابستہ نظر آتے ہیں۔آزاد دلکش اسلوب جن میں زبان و بیان کی گھلاوٹ اور خوشی مذاقی وزندہ دلی کی حلاوت شیر وشکر کی طرح ملی ہوئی ہیں۔اپنی ایک نرالی شان رکھتا ہے اور اس رنگ میں آزاد اپنے دور کے ادیبوں میں منفرد نظر آتے ہیں۔ان کی ظرافت رکاکت، کینہ اور ہجویات سے پاک ہے وہ سیدھے سادھے انداز میں طنز کے پھول کھلاتے جاتے ہیں۔ان کی تحریروں میں ظرافت اور شوخی اور ادب کے چٹخارے ملتے ہیں۔۔اور وہ ایک معیاری زبان لکھتے ہیں ان کے یہاں زور بیان کہیں کہیں ان حدوں میں بھی داخل ہو گیا ہے۔جہاں مسکرا کر انسان دانت میں انگلی دبالیتا ہے۔[8]

اشاعت: ''خیالات آزاد'' کا ایک نسخہ ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا تھا۔اس نسخے کو دوبارہ ۱۹۶۷ء میں حسین احمد ذوالفقار نے ترمیم واضافے کے ساتھ مکتبہ خیابان ادب، لاہور سے شائع کرایا۔

نوابی دربار

یہ سماجی ڈرامہ ہے۔جس کے مصنف سید محمد آزاد ہیں۔

مضامین: اس ڈرامہ کو مصنف نے حسب ذیل حصوں میں تقسیم کیا ہے۔:

پہلا حصہ: ایک افیونی میر صاحب کا خدمتگاروں کا حق کے لئے ناک میں دم کرنا۔

دوسرا حصہ: پیادے کا نواب صاحب کے ہاتھ میں سمن لا کر دینا۔مختار صاحب کا آنا اور ہزار روپے لے کر چنپت بننا۔

تیسرا حصہ: بڑی بیگم صاحبہ کا اضطراب۔

چوتھا حصہ: مختار صاحب کا بیوی کو نوٹ دکھانا۔بیوی کا پرانی شکایتیں دہرانا۔پھر دونوں کی لڑائی، رخصت کی تیاری، باہر مہمانوں کا آجانا، نوٹ کی تقسیم کا درمیان آنا، پھر چسکی لینا، کامیابی ک نشے میں نوروزی جان کا خیال آنا اور آخر ماہی بے تاب کی طرح تابانہ مچھوے بازار روانہ ہو جانا۔

پانچواں حصہ: کچہری میں غفور کو چپان کو ساتھ دے کر پینڈ چھڑانا جسمیں صاحب سے پینتیس دے کر پیروئی مقدمہ کرانا۔مقدمہ کا چٹکیوں میں خارج ہونا۔

چھٹا حصہ: بڑی بیگم صاحب سے پندرہ ہزار کا مال اینٹھ کر چار ہزار پر گروی رکھنا۔استخارے میں فتح آنا۔خان صاحب کا فتح کی خوشخبری سنانا خلعت وانعام پانا۔مقدمے کو کسی دشمن کا کھڑا کیا ہوا بتانا۔پالکی گاڑی میں بیٹھ کر لدے بھرے گھر تشریف لے جانا۔

ساتواں حصہ: خورد برد شدہ رقم کی تقسیم۔خان صاحب کا دو دن روپوش رہنا۔تیسرے دن کو چپان کے بلانے سے آنا ۔مرزا اور میرن مار پیٹ اور کھر کی بی بی سے لڑائی۔

آٹھواں حصہ: میر سعید کے ذریعے خان صاحب کا بھانڈا پھوٹنا اور کورداس کی امداد سے کان پکڑا کر نکالا جاتا۔مصاحبوں کا بال بال بچنا۔ان کی شامت سے گھر کا رفتہ رفتہ تباہ ہونا۔[9]

اہم کردار: مردوں میں جو اہم کردار ہیں۔ان میں خورشید نواب، لوٹ مار خان، میر صاحب اور میر خوشامد بیگ شامل ہیں اور نسوانی کرداروں میں خجستہ بیگم، خانم صاحب اور مجیدن کے کردار قابل ذکر ہیں۔

تاریخی اہمیت: یہ ڈرامہ اپنے اندر خاص تاریخی اہمیت لئے ہوئے ہے۔کیونکہ یہ ۱۸۵۷ کے

بعد مسلمان امراء کے سماج کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ عموماً ہندوستان کے مسلمان امیر گھرانوں کا ایک سچا فوٹو ہے۔[10]

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد نوابوں اور زمیں داری کی زندگی گزارنے کا زاویہ نگاہ ایک دم بدل گیا۔ روپیہ، پیسہ، زمین داری، جاگیرداری ہاتھ سے جاتی رہی۔ اندر سے کھوکھلے ہوگئے اور صرف ظاہری نام ونمود باقی رہ گیا۔ بیرونی شان کو بچا رکھنے کے لئے روپیہ قرض لینے اور زمیں وجائداد تک گردی رکھنے لگے۔ عقل وشعور سے بے بہرہ ہوگئے اور سمجھ بوجھ سے ایک دم عاری۔ ہوش وتمیز ندارد۔ خوشامدی درباریوں کی کمی نہیں تھی جوان کو الو بناتے رہے ان دھوکے بازیوں سے ان کی پانچوں انگلیاں گھی کی کڑاہی میں تھیں۔ وکیل اور مختار جھوٹے مقدمے بناتے اور رائی کا پہاڑ بنا کر پیسہ بٹورتے۔ اس زمانے میں مسلمان امیر گھرانوں کا یہی حال تھا۔ جس میں بدانتظامی اور حماقت کو عمومیت حاصل تھی۔[11]

یہ ڈرامہ اس سماج کی سچی تاریخ ہے

زبان و اسلوب کا بیان: ڈرامے کی زبان و بیان نہایت سادہ، شستہ اور عام فہم ہے۔ تمام کردار اپنے معیار اور موقع محل کے مطابق گفتگو کرتے ہیں۔ محاورے بالکل ایسے جو بڑی روانی سے بول چال میں استعمال ہو سکتے ہیں۔ انگریزی، فارسی، عربی الفاظ کا تلفظ بھی ویسا ہی جیسا اس زبان سے بے خبر کردار ادا کرسکتا ہے۔[12] نواب سید محمد آزاد نے لکھنو کی ٹھیٹ بیگماتی اور محلاتی زبان لکھی ہے۔[13]

اشاعت: یہ ڈرامہ اپنے وقت کے مقبول ترین اردو ہفتہ وار اخبار ''اودھ پنچ'' میں ۱۶ اپریل ۱۸۷۸ء سے ۱۶ جولائی ۱۸۷۸ تک قسط وار چھپتا تھا۔ پہلی مرتبہ کتابی شکل میں کب طبع ہوا

معلوم نہ ہو سکا۔ دوسری مرتبہ ۱۹۰۱ء میں سید عبدالغفور شہباز پروفیسر اورنگ آباد کالج، دکن نے دیباچے کے ساتھ شائع ہوا۔ تیسری مرتبہ ۱۹۶۶ء میں پروفیسر ممتاز منگلوری صاحب نے اسے مکتبہ خیابان ادب لاہور سے شائع کروایا۔ اس میں صفحات کی تعداد ۱۰۴ ہے۔

رویداد طوفان آفت نشان

دیوان سید محمود آزاد ۱۳۰۸ج/۱۸۸۹ع میں چھپا اس میں صفحات کی تداد ۱۲۱ ہے اس میں ایک مثنوی بعنوان ''رویداد طوفان آفت نشان'' شامل ہے۔
جو صفحہ ۷۶ سے ۷۹ تک مشتمل ہے۔

تاریخی اہمیت: مثنوی اس تاریخی واقعے پر مبنی ہے۔ جب ۷ اپریل ۱۸۸۸ء میں ڈھاکہ میں ایک ہلاکت خیز طوفان آیا۔ اس وقت ڈھاکہ میں نواب عبدالغنی کا زمانہ تھا، ہزاروں لوگ اس طوفان سے متاثر ہوئے۔ بے شمار افراد بے خاناں ہوگئے۔ ڈھاکہ قیامت خیز مصائب سے دوچار ہوگیا۔ یہ مثنوی اس سانحے کی یاددہانی کراتی ہے۔ بطور مثال چند اشعار:۔

جہانے بہ یک لحظہ شد پائمال ... ببین قدرت قادر ذوالجلال
بچرخ آور طاق چرخ بلند ... دو انندۂ ابر کحلے پرند
توانا کن پہلوان ہوا ... کہ کوہ ہے چوکا ہے ربا یدرز جا۔[14]

زبان و بیان: ''رویداد طوفان آفت نشان'' فارسی زبان میں لکھا گیا ہے۔ فارسی زبان پر انہیں خوب دخل حاصل تھا۔ فارسی گویا ان کی مادری زبان تھی۔ ان کی فارسی دانی کے بارے میں حکیم حبیب الرحمٰن صاحب ''ثلاثہ غسالہ'' میں لکھتے ہیں: ''فارسی پر اہل زبان رشک

کرتے''۔ مولوی رحمان علی طیش تواریخ ڈھاکہ میں لکھتے ہیں،''آپ کے اشعار گھر بار متانت وفصاحت وبلاغت سے مملو ہیں۔آپ کے فارسی قصائد سمجھنے کے لئے معمولی استعداد کافی نہیں''۔ ''رویداد طوفان آفت نشان'' بھی ان کی صفات کا حامل ہے۔اپنی فارسی دانی کا دعویٰ خود یوں کرتے ہیں:۔

آزاد نظم ریختہ کچھ میرا فن نہیں
واقف ہیں فارسی کے میرے شعرتر سے آپ [15]

اشاعت: دیوان آزاد ۱۳۰۷ھ/ ۱۸۸۹ء میں تکمیل تک پہنچا اور اسی سال پروفیسر محمد عبد الغفور شہباز کے مقدمے کے ساتھ عظیم آباد سے طبع ہوا۔

خدا کی شان

''خدا کی شان'' ایک ناول ہے۔جس کے مصنف خواجہ عتیق اللہ شیدا ہیں۔جن کا عرف شہزادہ میاں تھا۔یہ ناول قومی پریس لکھنو میں چھپا۔اس کا سن اشاعت جنوری ۱۸۸۹ء اس میں صفحات کی تعداد ۲۵۵ ہے۔

''خدا کی شان'' انیسویں صدی کی سماجی تاریخ ہے۔اس کے ساتھ اس میں خالص تاریخی واقعات بھی درج ہیں۔

ناول نگار کا اصل مقصد عورتوں کی تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرنا تھا۔عورت اگر تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو تو دنیا کی کوئی دیوار اس کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتی۔تعلیم نسواں کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے عتیق اللہ شیدا دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

''ہمارے گھر میں مستورات کو علم کا ازحد شوق ہے ہر کسی کو اس کا بدل ذوق ہے۔اور میرے دل میں بھی برابر خیال اس کا تھا کہ کوئی کتاب ایسی لکھی جائے جو کہ زمانے کا سچا رہبر ہو۔نشیب وفراز دنیوی دکھلائے، بھولے ہوئے کو راہ دکھلائے، کہانی کی کہانی ہو، طریق خانہ داری سکھلانے کے لئے ایک تجربہ کار استانی ہو''[16]

تاریخی اہمیت: ''خدا کی شان'' ناول انیسویں صدی کے سماج میں عورتوں کی بے بسی کی تاریخ ہے۔اس ناول میں اس بے بسی کی نمائندہ ناول کی ہیروین ملکہ ہے جو بعد کو دیبی چودھرائن کے نام سے مشہور ہوجاتی ہے۔اس عورت کا جرم اس کی غربت ہے۔اس لڑکی کو اس کی غریب کی پاداش میں اس کا سسر اس پر بے راہ روی کا الزام لگا کر گھر سے نکال دیتا ہے۔ سسر کے اس سنگ دلانہ فیصلہ پر اس کا شوہر اور اس کی ساس بھی احتجاج نہیں کرسکتے۔وہ بھی بے بس تھے کیونکہ اس زمانے کی یہی رسم تھی کہ صاحب ثروت وجاہ مردوں کے سامنے بیٹا ہو یا بیوی کسی کو چوں کرنے کی جرأت نہیں تھی۔

ناول کی ہیروئن ملکہ، شوہر کی ہمدردی رکھنے کے باوجود سسر کے مظالم اور سماج کے بدکردار لوگوں کے ہاتھوں اپنی عزت کی حفاظت کی جدوجہد میں بھوانی ٹھاکر ہاں پناہ لیتی ہے۔جو اس کی تعلیم وترتیب کے فرائض انجام دیتا ہے۔پانچ سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد اخلاقی طور پر اتنی مضبوط ہوجاتی ہے۔کہ ہندوستان کے طاقت ور انگریز حکمراں بھی اس کے نام سے کانپتے تھے۔گھر گھر اس کی بہادری کا چرچا تھا۔آخر میں اس بدکردار سسر کو اپنی زیادتیوں پر نادم ہونا پڑا اور انجام کار اپنے شوہر کے گھر آبرومندانہ زندگی بسر کرتی ہے۔

''دیبی چودھرائن'' کے ذکر سے مصنف کا مقصد بنگال کے فقیروں اور سنیاسیوں کی اس تحریک کا ذکر کرنا تھا جس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام کو بہت متاثر کیا یہ بنگال کے مختلف علاقوں میں منظّم حملے کرتے پھرتے تھے۔ سنیاسیوں اور فقیروں کا گروہ بنگال میں بہت عرصے سے موجود تھا۔ ابتداء میں یہ پر امن زندگی گزارتے تھے۔ لوٹ مار سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا یہ مختلف دیہاتوں میں جاتے اہل دیہ بخوشی ان کی خور پوش کا انتظام کرتے ایک جگہ کچھ روز قیام کرتے اور کسی دیگر بستی کا رخ اختیار کرتے۔

لیکن جب کمپنی نے مال گزاری کے نظام میں تبدیلی پیدا کر دی تو اس کا اثر گاؤں کی خوش حال معاشی زندگی پر بھی پڑا۔ غریب کاشتکاروں میں ایک بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ ٹیکسوں کی بھر مار نے دیہات کی معشیت کو تباہ کر دیا۔ دیہات کے لوگوں کو اپنا پیٹ بچانا ہی دشوار ہو گیا۔ تو ان سنیاسیوں اور فقیروں کو کہاں کھلاتے۔ مجبوراً انہوں نے لوٹ مار کا سلسلہ جاری کر دیا۔ جب لوگوں نے مزاحمت کی تو انہوں نے ہتھیار کا سہارا لیا۔ یہ ہزار بارہ سو کی تعداد میں مجتمع ہو کر مختلف اطراف کو نکل جاتے اور لوٹ مار مچاتے۔ آخر مجبوراً کمپنی کے افسران کو ان کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی۔ تقریباً چالیس برس تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج ان کے خلاف مصروف عمل رہی۔

بنگال کے ان فقیروں اور سنیاسیوں کی قیادت مجنوں شاہ کے ہاتھوں میں تھی ان کا جائے عمل رنگ پور تھا۔ اس کے ساتھیوں میں سے ایک سنیاسی بھوانی ٹھاکر تھا یہ لوگ دریا کے راستوں سے جاتے ہوئے تاجروں کی کشتیوں کو دن دھاڑے لوٹ لیتے۔ کسٹمز سپرنٹنڈنٹ مسٹر ولیم نے بھوانی ٹھاکر کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کئے۔ جس سپاہی اسے گرفتار کرنے گئے تو اس نے نہ صرف مال دینے سے انکار کیا بلکہ نقل مکان اختیار کر کے تجارتی کشتیوں کو لوٹ مار

کرنے کا سلسلہ اسی طرح جاری رکھا۔ جب کمپنی کے حکام کو اس کے خلاف مسلسل شکایتیں ملیں تو تحقیق سے پتہ چلا کہ سنیاسی کے پاس پچاس مسلح آدمیوں کا ایک جتھ موجود ہے۔ کمپنی کے حکام نے ایک کمانڈر اور دو درجن فوج آتشیں اسلحہ سے لیس اس کی سرکوبی کے لئے روانہ کئے۔

دریا کے کنارے زبردست معرکہ ہوا۔ بھوانی اور اس کا نائب جو پٹھان تھے ان کے ہاتھ زندہ نہ آسکے۔ دونوں گولی کھا کر وہیں ڈھیر ہو گئے اور دوسرے سیاسیوں کی گرفتاری عمل میں آئی۔ ۱۷

عتیق اللہ شید کے ناول خدا کی شان میں ایک اہم کردار بھوانی ٹھاکر کا ہے۔ بھوانی ٹھاکر کے حالات زندگی ناول یوں درج ہیں:

> ''اس فقیر کا باپ گوڑ کی سلطنت کا مالک تھا۔ جب سلطنت کو زوال آیا تو یہ اونکی ماں کی گود میں تھے۔ یہ ہندو کلین برہمن تھے ان کی ماں انکو لے کے بھاگیں تو سنارگاوں میں کسی درگاہ پر آ کر دم لیا۔ ایک عارف نے اس لڑکے کو ہونہار دیکھ کہ خود پرورش کیا۔ لکھایا پڑھایا علم باطنی کی بھی تعلیم کی جب اس طرح کی خرابیاں زمانے میں شروع ہوئیں اب روپوش ہو گئے اور پوشیدہ طرح پر بے بس و ناچار کی مدد کرنے لگے۔'' ۱۸

لوٹ مار اگرچہ اس کا پیشہ تھا مگر دل انسانی ہمدردی کے جذبات سے بھرپور تھا۔ اس نے ملکہ کو اپنی بیٹی کی طرح پرورش کیا اور اس کی تعلیم و تربیت کے فرائض انجام دیئے۔ اس عرصے میں

ٹھا کر نے ملکہ کی مال و دولت کو حفاظت سے نگاہ میں رکھا۔ تکمیل تعلیم کے بعد ملکہ کو آفریں کہتے ہوئے یہ نصیحتیں کیں:

''انسان کسی تکلیف میں نہ گھبرائے اور دل قوی رکھے، رنج پر صبر کرے راحت میں شکر۔ دوسرے بات یہ ہے کہ کسی بات میں غرور نکرے۔ گناہ کو اپنے نفس احتمال کرے اور نیکی کو خدا کی عنایت اور بخشش سمجھے یہ ہرگز ہرگز سمھنا نہ چاہئے کہ ہم ہزار روپیہ خیرات کیا ہے تو وہ ہم نے خود تو کیا نہیں بلکہ یہ محض اس کی عنایت اور شفقت وکرم ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ سب بات کا عوض اور بدلہ خدا کے اختیار میں ہے تم ہزار نیکی کرو اور وہ قبول نہ کرے تو اس پر تمہارا کچھ اختیار نہیں۔ بلکہ اس کے عذاب سے ڈرنا اور ہر حال میں اس کی رحمت کا امیدوار رہنا چاہئے۔''[۱۹]

بھوانی ٹھا کر اور اس کے ساتھی چوری۔ چوری کی خاطر نہیں کرتے بلکہ وہ انگریزوں کے ظلم وستم اور ان ک بے راہ روی کے خلاف برسر پیکار تھے۔ جہاں بھی موقع ملتا وہ انگریزوں کو زک پہنچانے کی کوشش کرتے اور ان کا مال لوٹ کر غریب عوام میں تقسیم کرتے کیونکہ وہ انگریزوں کے ناجائز اور بھاری ٹیکسوں کے تلے پسے جا رہے تھے۔ انہیں دو وقت پیٹ بھر کر روٹی نصیب نہیں ہوتی تھی اس صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے بھوانی ٹھا کر کہتا ہے:

اس ملک میں ابھی کوئی بادشاہ نہیں ہے مسلمانوں کی شکست ہوئی۔ انگریز اپنا بندوبست کرتے جاتے ہیں ابھی تک وہ لوگ پوری طرح عدالت کرتے بھی نہیں اور کر سکتے بھی نہیں۔ تب ہم غریب ناچار بے کس لوگوں کی پرورش کرتے ہیں اور بد ذات ظالم جفا شعار لوگوں کی بیخ بنیاد مٹاتے ہیں۔ سزا دیتے ہیں۔[۲۰]

اس وقت ملک کے جو عام سماجی اور سیاسی حالت تھے ان کا ذکر بھوانی ٹھا کر کی زبانی یوں ہے:۔

''کچہری کے عمال باقیداروں کے گھر بالکل لوٹ لیتے ہیں وہاں کے گولے کی تلاش میں گھر توڑ ڈالتے ہیں۔ زمین کھود کے دیکھتے ہیں اگر ملا تو ایک کے عوض سو گنا لیتے ہیں اور نہیں ملا تو مار پیٹ کرتے ہیں۔ گھر جلا دیتے ہیں۔ قید کرتے ہیں۔ جان سے مار ڈالتے ہیں۔ بچوں کا پاؤں پکڑ کے پٹکیں مارتے ہیں۔ جوانوں کے سینے پر ماش رکھ کر دلتے ہیں۔ آنکھ میں چونٹیاں ناف میں گھر گھری باندھ دیتے ہیں۔ عورتوں کو ہر طرح بے عزت کرتے ہیں۔''[۲۱]

انگریزیوں کی دھاندلیوں کا ذکر کرتے ہوئے مصنف اور ایک جگہ لکھتے ہیں: ''اس وقت نئی سلطنت آئین قانون کچھ بھی ایسا نہ تھا سب باتیں بے ائین ہوتی تھیں۔ اس وقت میں ادنیٰ پیادہ مجسٹریٹ سے زیادہ اختیار والا تھا۔''

مصنف اس عہد کے مظلوم عوام کی تصویر کشی کرتے ہوئے ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

''رانی صاحبہ نے تخت پر اجلاس فرمایا اور قریب لاکھ آدمی کے مظلوم

> جولوگ لوٹے گئے تھے اور زمین داروں کے ہاتھ تباہ ہوئے تھے وہ لوگ جمع ہوئے تھے۔

دیبی چودھرائن انگریزوں کے استحصال کے خلاف جدوجہد کرتی ہے تاکہ غریب ومظلوم عوام کو ان کے مظالم چھٹکارا دلا سکے۔ اس لئے انگریزی حکام اس کی سرکوبی کے لئے بے تاب رہتے ہیں اور ایک عورت کے خلاف لشکر کشی کا حکم دیتے ہیں۔

''دیبی چودھرائن کی سرکوبی کے لئے لفٹنٹ بری این صاحب دوسو آدمی لے کے کشتیوں پر سوار ہو کر آئے۔ تاکہ دیبی چودھرائن کا بجرا گھیر لیں۔ اور تین سو آدمی خشکی کی راہ جنگل میں چھپا کے رکھے کہ اگر دیبی چودھرائن کا خشکی سے بھاگ جانے کا ارادہ کرے تو وہاں اس طرح اسے پکڑیں گے مگر دیبی چودھرائن کی جان بچانے کے لئے دیڑھ ہزار جوان تیار تھے۔

غرض اس ناول کے مطالعے سے انیسویں صدی کی سماجی تاریخی اور اس کے ساتھ سیاسی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔

بیمارِ بلبل

تعارف: ''بیمار بلبل'' ایک اوپیرا ڈرامہ کے پردہ میں سماجی تاریخ ہے۔ اس میں صفحات کی تعداد ۴۱ ہے۔

شرح احوال مؤلف: سید احمد حسین وافر ڈھاکہ کے رہنے والے تھے اور مدرسہ محسنیہ میں معلّمی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ شعروشاعری سے بھی شغف رکھتے تھے۔ اردو اور فارسی میں عبدالغفور نساخ سے اصلاح لیتے تھے۔ اس کے علاوہ بنگلہ، انگریزی اور ہندی میں بھی کہتے تھے۔ شعروشاعری کے علاوہ ڈرامہ لکھنے کا بھی شوق تھا۔ ''بیمار بلبل'' ان کا مشہور ڈرامہ

ہے۔ جو ڈھاکہ اور اس کے نواح میں بہت مقبول ہوا۔ اس ڈرامے کے بارے میں حکیم حبیب الرحمٰن کہتے ہیں:

> ڈھاکہ میں کیا ہندو، کیا مسلمان دونوں میں ناٹک دیکھنے اور ناٹک کھیلنے کا شوق تھا ایک زمانے میں جنون کی حد تک پہونچا ہوا تھا۔ ہر ایک محلّہ میں اس کا چرچا تھا۔ خود روشاعری اس کی پشت پناہی کرتی تھی۔ وافر مرحوم کی جوانی ان کو اس طرف بھی لے گئی اور انہوں نے ایک اچھا ناٹک بہت کم زمانے میں لکھ کر اپنے محلوں والوں کو دیدیا۔ چنانچہ بیمار بلبل اس زمانہ میں بھی اسٹیج ہوا اور اس کے بعد بھی کئی بار کھیلا گیا بلکہ ابتک کبھی کبھی کھیلا جاتا ہے۔[۲۲]

ان کی سن پیدائش ووفات کا کسی نے ذکر نہیں کیا ہے۔

تاریخی اہمیت: یہ اوپرا ڈرامہ انیسویں صدی کی سماجی تاریخ مرتب دینے میں مدد دیتا ہے۔ جب تعلیم کا چرچا زیادہ نہ تھا۔ اور دولت کے بل بوتے پر مالدار بوڑھے گرچہ سن اسی (۸۰) سے تجاوز کر گیا ہو نوعمر لڑکیوں کو بیاہے کا شوق رکھتے تھے۔ ''بیمار بلبل'' کا پلاٹ بھی اس مسئلے کے گرد گھومتا ہے۔ اس ڈرامے کے ہیرو لال خان کا سن اگرچہ نوے ہے مگر سولہ برس کی مہ لقا کو گھر میں بیوی بنا کر لانے کے سپنے دیکھتا ہے۔ طنزاً اس کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

> یہ عجب احمق الذی ہے کہ اسی نوے برس کا سن ہوا ہے تو بھی شادی کی خواہش نہیں چھوڑتا ہے ایک سولہ برس کی لڑکی پر فدا ہے عجب بے وقوف ہے۔''[۲۳]

مگر آخر میں مہ لقا اپنے محبوب فرہاد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ تو لال خان کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔ جس کا اعتراف یوں کرتا ہے۔

''یہ میری غلطی اور حماقت ہے کہ میں نے اس نوے برس کا سن میں شادی کا قصد کیا۔ بے شک یہ مجھ سے حماقت ہوئی۔'' ۲۴

''بیمار بلبل'' میں احمد حسین نے ایک سماجی مسئلہ کو اوپیرا کا روپ دیا۔

زبان واسلوب بیان: ''بیمار بلبل'' ایک اوپیرا اردو ڈرامہ ہے۔ لہذا نثر میں شاعری کی آمیزش ہے۔ جس میں غزلیں اور مختلف راگ راگنیاں شامل ہیں۔ تمام مکالمے عام فہم اور سادے ہیں۔ تمام کردار اپنی سطح کے مطابق کرتے ہیں۔ کہیں کہیں مذکر مئونث اور تلفظ کی غلطیاں نظر آتی ہیں۔ مگر ایسا لکھنا لازم تھا کہ متعلقہ کردار ان الفاظ کو ایسے ہی تلفظ کے ساتھ ادا کر سکتا ہے۔ اس کا اقرار خود مصنف نے بھی مقدمے میں یوں کیا ہے۔

''اکثر الفاظ غلط نظر آویں گے اسے وہ یہ نہ سمجھیں کہ خود مصنف اردو کی اصلاح اور محاورے سے ناواقف اور ناآشنا ہے۔ بلکہ سمجھیں کہ اکثر جگہ اس کی قصداً غلط لکھی گئی ہیں۔ کیونکہ ناٹک اوسکو کہتے ہیں کہ جس کی جو زبان ہو ہو بہو ویسا ہی کام ہو۔ اس میں فصاحت اور بلاغت کو ذرا بھی دخل نہیں اس کتاب میں اکثر جگہ مذکر کو مئونث اور مئونث کو مذکر لکھا گیا ہے اور کہیں کہیں اشعار میں بھی زحاف ہے۔'' ۲۵

اشاعت: ''بیمار بلبل'' ۱۸۸۰ع میں مطبع محمدی ڈھاکہ سے چھپا۔

قصیدہ در تہنیت ملکۂ معظّمہ وکٹوریا

تعارف: یہ مختصر سا فارسی قصیدہ جو تیرہ صفحات پر مستمل ہے۔ عبیداللہ العبیدی نے لکھا۔ اشعار کی تعداد پچپن ہے۔ ہر شعر کے ساتھ اس کا انگریزی ترجمہ شامل ہے۔

تاریخی اہمیت: عبیدی نے یہ قصیدہ انگلستان کی ملکہ وکٹوریا کی ۱۸۹۶ء میں ہندوستان آمد کے موقع پر لکھا تھا۔ دلی میں ایک عظیم الشان دربار منعقد ہوا جس میں ملکہ کو 'قصیر ہند' کا خطاب دیا گیا۔ اس موقع پر عبیدی نے یہ قصیدہ لکھا تھا۔ قصیدہ کی روایتی شان کو بجا رکھتے ہوئے ابتدا میں عبیدی نے ملکہ کی تعریف وتوصیف کی ہے۔ اس کے بعد ہندوستان میں انگریزی عملداری کے دوران یہاں کی علمی، سائنسی اور صنعتی ترقیات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد واسرائے ہند کی دانش وفہم اور حسن انتظام کے گن گاہے ہیں۔ اس قصیدے سے عبیدی کی ترقی پسندی کے رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ عبیدی چاہتے تھے کہ ہندوستان علم وفن کے میدان میں ترقی کی راہ پر گامزن رہے۔

ملکہ وکٹوریا کی ہندوستان آمد کا ذکر کرتے ہوئے رحمان علی طیش تواریخ ڈھاکہ میں لکھتے ہیں:۔

۱۸۷۶ء میں لارڈ لیٹن گورنر جنرل ہو کر آئے اسی سن میں ملکہ معظّمہ کوین وکٹوریا نے امپرس یعنی ''قصیر ہند'' کا خطاب لیا اور ۱۸۷۷ء کی جنوری میں اس خطاب کی شہرت کے واسطے دلی میں دربار عظیم منعقد ہوا۔ جس میں سارے راجگان ملک اور امرائے ریاست حاضر ہوئے تھے۔ اور بڑے تجمل اور تزک کے ساتھ نائب سلطنت

گورنر جنرل کرسی نیابت پر ملکہ معظّمہ قصیر ہند کے جلوس کر کے
اشتہار خطاب قصیر ہند جناب ملکہ معظّمہ کا اہالیان مملکت کو سنایا اور
پلٹنوں کی پریڈ اور توپیں شلک ہوئیں اور خوشیاں اس جلوس کی ہر ہر
شہر میں ہند اور بنگالہ کے منائی گئیں ۔ اور چراغ روشن ہوئے
ڈھاکے میں بھی اس اس روز شب کو ہر گلی کوچہ میں اور سڑکوں پر
بازاروں میں روشنیاں ہوئیں تھیں اور اہالیان شہر اور صاحبان
انگریزی نے خوشیاں کی تھیں ۔ ۲۶

زبان اور اسلوب بیان: '' قصیدہ در تہنیت ملکہ معظّمہ وکٹوریا '' فارسی زبان میں ہے اور ہر شعر کا انگریزی ترجمہ بھی ہے۔ قصیدے کی زبان اگر چہ روایتی قصیدوں کی مانند اتنی زوردار نہیں مگر پھر بھی اچھے خاصے معیار کی حامل ہے۔ اور قصدیے کی شان پر برقرار رکھے ہوئے ہے۔ بطور مثال چند اشعار:۔

ندیدہ چنین بارگاہ فلک فر
سپھرے کہ او رراست دیدہ ہزاراں

نہ بودہ چنین بزم بافروشوکر
دریں کشور ہند در عہد شاہان

نہ در عہد بابر نہ در عہد اکبر
نہ در عہد شاہ جہان فلک شاہ

اشاعت: یہ قصیدہ اردو گائیڈ پریس کلکتہ سے ۱۸۷۷ء میں طبع ہوا۔

پندنامۂ کاظم

تعارف: ''پندنامۂ کاظم'' ایک شعری تصنیف ہے۔ شاعر ابوناظم کاظم سراج گنجی (پٹنہ) ہیں۔ اس شعری مجموعے میں صفحات کی تعداد ۵۲ ہے۔ جن میں تعلیمی مسائل اور انگریزی زبان کی ترغیب کے سراغ ملتے ہیں۔

احوال شاعر: ابوناظم محمد کاظم ضلع پٹنہ میں رانی پورہ متصل بیل کوچی کے رہنے والے تھے۔ بعد ازاں سراج گنج (پٹنہ) میں سکونت اختیار کر لی اسی وجہ سے سراج گنجی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ان کا تخلص کاظم تھا۔ ان کے والد کا نام منشی رجب علی اور دادا کا نام منشی محمد وزیر علی تھا۔ محمد کاظم بنیادی طور پر درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ پٹنہ ضلع میں واقع شہزاد پور میں مدرس اول کے عہدے پر فائز تھے۔ بعد ازاں ترقی پا کر بی۔ ایل ہائی انگلش اسکول واقع سراج گنج پٹنہ چلے گئے۔ ۲۷

تاریخ اہمیت: پندنامہ کاظم کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اگر چہ مسلمانوں کا ایک طبقہ انگریزی تعلیم کے حصول کے خلاف تھا مگر ایک بیدار ذہن طبقہ انگریزی تعلیم و دیگر علوم وفنون میں استعداد حاصل کرنے پر درپے تھا اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتا تھا۔ کیونکہ ان کی آنکھیں روشن اور دل کشادہ تھا۔ انہیں میں ایک محمد کاظم الدین سراج گنجی بھی تھے۔ ایک اسکول مدرس ہونے کی حیثیت سے ان کو اپنے طلباء کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کی اور نصیحت کرنے کی موقع بہت حاصل تھے۔ جب شہزاد پور اسکول سے ان کا تبادلہ سراج گنج بی۔ ایل ہائی انگلش میں ہوا تو بوقت الوداع انہوں نے طلباء و دیگر حاضرین کو دینی اور دنیوی تعلیم کی طرف دل سے رجوع کرنے کی تحریک کی۔ خصوصاً اس سماج میں انگریزی تعلیم حاصل

کرنے کی اہمیت کو اچھی طرح واضح کیا کہ سماج میں باعزت زندگی بسر کرنے کے لئے انگریزی تعلیم کی بے حد ضرورت تھی۔ خصوصاً اس وقت سماج میں جب کہ حکمران طبقہ انگریز تھا انگریزی سیکھے بغیر نوکری کا حصول ناممکن تھا۔ اور عزت کی روٹی انگریزی زبان سے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ فارسی جو صدیوں سے مسلمان سماج میں مروج رہی تھی اب اس کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ جدید علوم وفنون اور سائنس سے بہرہ ور ہونے کے لئے فارسی کی بجائے انگریزی زبان کا سیکھنا لازم تھا۔ اس لئے انگریز طبقہ فارسی کے حصول کی دل شکنی کر رہا تھا۔ کیونکہ اب یہ ایک بے کار کا مشغلہ بن گیا تھا۔ اگر فارسی سیکھ سکتے ہیں تو انگریزی سیکھنے میں کیا حرج ہے۔ جس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہونا چاہئے۔ اس حقیقت کو ان اشعار یوں واضح کرتے ہیں:۔

زانکہ آنست از وجوہ مہتری　　　گر بیاموزیش یابی چاکری
چونکہ انگریزند برما حکمران　　　لاجرم حاصل کنی انگلش زبان
گر بود منظور سرکاری عمل　　　ہیچ در دین زین زبان ناید خلل
گر نیاموزی زبان انگلشی　　　شغل سرکاری نیابی اے اخی
جز با انگریزی نیاشد ہیچ کار　　　مشکل افزاید تر در کار و بار
گر کنی حاصل تو انگریزی زبان　　　از تلاش رزق باشی در امان
سعی کن در کسب انگریزی بدل　　　اکتساب عزت دنیا مہمل
کسب علم دنیوی ممنوع نیست　　　ہر کہ ایں دعوی کند مسموع نیست
چیست فرق آخر در انگریزی و فرس　　　ایں ترا درس و آنرا نیست درس
ہست انگریزی پئے اہل صلیب　　　فارسی آتش پرستاں را نصیب

داخل انگریزند در اہل کتاب　　　واں ہمہ کبران بدیں ناصواب
علم شئی چوں بہترست از جہل شئی　　　پس چرا نفرت کنی از کسب وی۔ ۲۸

زبان و بیان اسلوب: ''پند نامۂ کاظم'' بزبان فارسی ہے۔ فارسی زبان میں ''پند نامہ'' لکھنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے مولانا شوکت علی میرٹھی اس کی تقریظ میں لکھتے ہیں:

''پند نامۂ در اردو نظم کردن آسان بود۔ لیکن مولوی کاظم کہ عرائش افکار خود را حلیہ فارسی پوشانیدند وجہ موجہ آں ہمیں است کہ در ملک بنگال ہم زبان فارسی تقریباً نسیاً منسیا شدہ است چنانکہ در ہندوستان سواد آن در طبائع طلبہ پیدا شود واز خواندنش بدانند کہ در گنج پارس چہ قدر گراں بہا جواہر پارہا موجود اند۔ ۲۹

اس کی زبان پر تبصرہ ہوئے مولانا شوکت میرٹھی نے یوں فرمایا ہے:۔

''ایں نظم کلامی پختہ، خم و پیچی واعوجاجی
ندارد بغیات شستہ وسریع الفہم'' ۳۰

اشاعت: ''پندنامہ شمس الانوار پریس میرٹھ سے ۱۳۳۰ھ/ ۱۹۱۵ء میں طبع ہوئی۔''

رویداد زلزلہ

تعارف: رویداد زلزلہ کے مصنف مولانا عبدالاول جونپوری ہیں۔ رویداد زلزلہ میں ۴۵ زلزلوں کا ترتیب وار بقید سنوات کیا گیا ہے۔

انیسویں صدی (تیرہ سو ہجری) میں بنگال اور ملک آسام کے اطراف میں پے در پے کئی ہیبت ناک زلزلے آئے۔ جس سے متاثر ہو کر مصنف نے اس زلزلے سے آگے آنے والے

زلزلوں کی تفصیل لکھی کیونکہ اکثر لوگوں کو اگلے واقعات زلزال کی مطابق خبر نہ ہونے سے یہ حال کا واقعہ ایک نیا حادثہ معلوم ہوتا تھا۔ اور ہر شخص کے زبان زد تھا کہ ایسے زور وشور کے متواتر زلزلے کبھی کسی زمانے میں سنے اور دیکھے نہیں۔ ۳۱

اس مختصر کتابچے میں صفحات کی تعداد سولہ ہے۔

تاریخی اہمیت: رویدادزلزلہ کے مطالعے سے دنیا میں برپا ہونے والے چند مشہور زلزلوں کی تاریخ معلوم ہوتی ہے۔ جیسے ہارون الرشید خلیفہ عباسی کے عہد حکومت میں ۱۸۰ء/ ۷۹۶ میں ایک سخت زلزلہ آیا بعہد خلیفہ متوکل علی اللہ بن معتصم باللہ ۲۴۲ھ/ ۸۳۷ء میں زلزلہ، ۲۳۴ھ/ ۸۴۸ میں دمشق کا زلزلہ، ۲۴۵ھ/ ۸۵۹ میں ساری دنیا میں زلزلے آئے، اندلس اور قرطیہ میں بعہد خلیفہ محمد بن عبدالرحمٰن ۲۶۸ھ/ ۸۸۰ء میں سخت زلزلہ، ۲۸۰ھ/ ۸۹۳ء میں شہر دبیل میں عظیم زلزلہ جس میں ایک لاکھ پچاس ہزار جانیں تلف ہوئیں، ۲۸۹ھ/ ۹۰۱ء میں بصرے میں آندھی وزلزلہ، ۳۴۴ھ/ ۹۵۵ء میں خلیفہ مطیع اللہ ابن مقتدر کے عہد میں مصر کا زلزلہ، ۳۳۱ھ/ ۹۴۲ء میں ضلع خراسان میں زلزلہ، ۳۶۳ھ/ ۹۷۳ء میں مفرالدین علوی کے عہد میں زلزلہ، ۳۶۷ھ/ ۹۷۷ء میں چالیس روز تک متواتر زلزلے، ۳۶۸ھ/ ۹۷۸ میں پے در پے زلزلے مگر عراق میں زوردار زلزلہ، ۳۷۶ھ/ ۹۸۶ء میں شہر موصل میں شدید زلزلہ، ۴۳۴ھ/ ۱۰۴۲ء میں شہر تبریز کا زلزلہ جس میں پچاس ہزار افراد جان بحق ہوئے، ۴۵۸ھ/ ۱۰۶۵ء میں خراسان کا زلزلہ، ۴۶۰ھ/ ۱۰۶۷ء میں فلسطین ومصر کا زلزلہ، ۴۷۸ھ/ ۱۰۸۵ء میں خورستان اور فارس کا زلزلہ، ۴۷۹ھ/ ۱۰۸۶ء میں عراق وشام میں متواتر زلزلوں کا آنا، ۴۸۴ھ/ ۱۰۹۱ء میں شام دمشق گرد ونواح میں متواتر زلزلوں اور شہر انطاکیہ کی مکمل تباہی، ۴۸۷ھ/ ۱۰۹۴ء میں شام میں زلزلہ، ۵۱۱ھ/ ۱۱۱۷ء میں عراق و بغداد میں زلزلہ، ۵۲۹ھ/

۱۱۳۴ میں عراق میں وموصل میں زلزلہ، ۵۳۲ھ/ ۱۱۳۷ء میں شام، بکر، موصل، عراق اور اردگرد کے دوسرے شہروں میں زلزلہ، ۵۳۴ھ/ ۱۱۳۹ء میں ضلع اذربیجان، قصبہ گنج میں ہولناک زلزلہ، قصبہ گنج جس میں دولاکھ تیس ہزار آدمیوں کی ہلاکت، بغداد میں ۵۴۴ھ/ ۱۱۴۹ء میں دس بار زلزلوں کا آنا، ۵۶۵ھ/ ۱۱۶۹ء میں شام، جزیرہ موصل، عراق میں تباہ کن زلزلے، ۵۷۳ھ/ ۱۱۷۷ء میں بغداد میں تند ہوا وزلزلے کے آنا، ۵۹۰ھ/ ۱۱۹۳ء میں جزیرہ اور عراق میں زلزلہ، ۵۹۷ھ/ ۱۲۰۰ء میں موصل، جزیرہ، شام، مصر میں زلزلہ جس کا اثر طرابلس وروم تک پہنچا، ۶۰۰ھ/ ۱۲۰۳ میں مصر، شام جزیرہ، روم، صقلیہ، قبرس، موصل، عراق، صور میں بڑا زلزلہ، ۶۰۴ھ/ ۱۲۰۷ء میں موصل میں ہلکا زلزلہ، ۶۰۵ھ/ ۱۲۰۸ء میں نیشاپور اور خراسان میں سخت زلزلہ، ۶۲۲ھ/ ۱۲۲۵ء میں موصل، جزیرہ اور عراق میں متوسط درجے کا زلزلہ، ۶۲۳ھ/ ۱۲۲۶ء میں بلاد عربیہ وعجمیہ میں زلزلہ، ۶۵۴ھ/ ۱۲۵۶ء میں مدینہ منورہ میں زلزلہ اور آگ کا ظاہر ہونا، ۷۰۲ھ/ ۱۳۰۲ع میں مصر وشام میں زلزلہ، ۸۰۶ھ/ ۱۴۰۳ء میں حلب اور دیگر شہروں میں زلزلہ، ۹۱۵ھ/ ۱۵۰۹ء میں قسطنطنیہ میں بیالیس روز متواتر زلزلہ، ۱۰۶۳ھ/ ۱۶۵۲ء میں روم میں چالیس روز تک برابر زلزلہ، ۱۰۷۷ھ/ ۱۶۶۶ء میں روم میں لگاتار زلزلہ، ۱۱۸۹ھ/ ۱۷۷۵ میں یورپ میں شدید زلزلہ، ۱۰ محرم بروز شنبہ عصر ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۲ جون ۱۸۹۷ء میں بنگال میں بڑا ہولناک زلزلہ آیا۔ یہ زلزلہ دس پندرہ روز تک خفیف ہوتا رہا جس کا اثر ڈھاکہ، کلکتہ، نواکھالی، باقر گنج، سلھٹ، تپرہ، چاٹگام، میمن سنگھ اور ان اضلاع کے دیہات میں بھی محسوس ہوا۔ کلکتہ اور ڈھاکہ میں کئی بڑی بڑی عمارات منہدم ہوگئیں۔

زبان وبیان اسلوب: ۔ یہ کتابچہ بزبان اردو لکھا گیا ہے۔ زبان نہایت عام فہم اور سادہ ہے۔

اشاعت۔ یہ کتابچہ مطبع اصح لکھنو سے ۱۳۱۹ھ/ ۱۸۹۷ء میں طبع ہوا۔

انجمن احباب اسلامیہ ڈھاکہ ۱۸۸۳ء

تعارف: ''انجمن احباب اسلامیہ ڈھاکہ'' فروری ۱۸۸۳ء میں ڈھاکہ میں قائم ہوئی۔اس کا مدعا یہ تھا کہ بنگال کے مسلمان جو دینی و دنیاوی دونوں اعتبار سے روبہ تنزل تھے ان کی اصلاح و بہبودی کی کوشش کی جائے اور اس غرض کے لئے مسلمانوں کی تعلیم خصوصاً تعلیم نسواں کی طرف خاص توجہ دی جائے۔ان ہی مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے'' انجمن احباب اسلامیہ ڈھاکہ'' وجود میں آئی۔

تاریخی اہمیت: ''انجمن احباب اسلامیہ ڈھاکہ'' اول سال کی کاروائیان ۱۸۸۳ء، ۲۰ صفحات پر مشتمل ایک چھوٹا سا کتابچہ ہے جو ڈھاکہ کی سماجی تاریخ میں نہایت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے انیسویں صدی کے اواخر میں ڈھاکہ کے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری کا احساس پیدا ہوتا جارہا تھا۔خصوصاً ان میں شعور پیدا ہو چکا تھا کہ قوم کی ترقی کا انحصار عورتوں کی تعلیم پر ہوتا ہے۔عورت اگر جاہل رہے تو قوم قعر مذلت کی گہرائیوں مٰیں جا پڑتی ہے۔لہذا ہماری مسلمان عورتیں جو زیادہ تر پردہ نشین ہیں ان کو اول قرآن مجید کی تعلیم ، خدا کی عبادت ، عصمت کی نگاہ داری ، امور خانہ داری ، شوہر ، عزیز و اقارب اور غیروں سے حسن سلوک جیسے امور کا سیکھنا لازم ہے۔اس کے بعد اپنی مادری زبان میں لکھنا ، پڑھنا ، سیکھنا نہایت ضروری ہے۔تاکہ تعلیم یافتہ ہو کر مردوں کی مددگار ، بچوں کی مناسب آموزگار اور اپنے ذاتی پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں صلاحیت پیدا کرسکیں۔اہل انجمن کو اس انجمن کی بنا سے فقط تشویق اور تحریص تعلیم اور تربیت کی غوض تھی۔

اغراض و مقاصد کے بیان کے بعد کتابچہ میں انجمن کا ممبر ہونے اور استعفادینے کے قواعد،

کارکن کمیٹی ، سکریٹری کی کارروائی ، خزانچی کی کارروائی ، قواعد جلسہ ، ضوابط امتحان اور سال گذشتہ کی متفرق کیفیت کا بیان ہے۔اس میں خصوصاً ۲۴ نومبر ۱۸۸۳ کو منعقد اس جلسے کا بیان ہے جس میں غرض بنائے انجمن احباب اسلامیہ ، ابتدا بنائے انجمن سے اس دن تک کل انتظام اور کامیابی ، تعلیم نسواں کی اہمیت اور پردہ نشین خواتین کی امتحان میں کامیابی وسند دینے کا بیان ہے۔اس کے بعد فہرست اسمائے نسواں کامیاب شدہ ، ۱۸۸۳ء کے درس میں شامل شدہ کتب ، ۱۸۸۳۔۱۸۸۵ کا نصاب ، ۱۸۸۴ کے ضوابط امتحان ان خیر خواہاں کا ذکر جنہوں نے انجمن کے لئے چندے عطا کئے۔

اشاعت: یہ کتابچہ مطبع اخبار دار السلطنت سے چھپا مگر سن اشاعت کا کہیں تذکرہ نہیں۔

انجمن احباب اسلامیہ ۱۸۸۵ء

تعارف: ''انجمن احباب اسلامیہ ڈھاکہ'' ۱۸۸۳ میں ڈھاکہ میں قائم ہوئی۔اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان بنگالہ جو دینی و دنیاوی اعتبار سے روبہ تنزل ہیں ان کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔لیکن یہ صرف چند لوگوں کا کام نہ تھا جب تک تمام قوم جسمانی علمی اور مالی امداد سے معین اور مددگار نہ ہو ایسا کرنا ناممکن تھا۔ ان ہی مقاصد کے زیر اثر انجمن احباب اسلامیہ ، ڈھاکہ ۱۸۸۲ میں قائم ہوئی۔ ''انجمن احباب اسلامیہ ۱۸۸۵ء'' گذشتہ دو سالوں کی ترقی و بہبودی جو انجمن کی بدولت وجود سے آئیں اس کا ایک جائزہ ہے۔

تاریخی اہمیت: اس کتاب کے مطالعے سے مسلمانان بنگالہ کی تعلیمی پستی کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے۔تعلیمی ترقی کی اہمیت واضح کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں۔

تعلیم کے نہ ہونے کی وجہ سے ہم مسلمان دریائے تباہی و بربادی
میں غوطہ کھا رہے ہیں۔ جس تعلیم کی بدولت صوبہ بنگلہ کے ہندو ترقی
وعروج کی حالت میں ہیں۔ اور جس تعلیم کی وجہ سے قوم انگریز
حکمرانی کرتی ہے۔ اور جس تعلیم کے سبب سے مسلمانوں کی قوم
ایک زمانہ میں ممتاز تھی اسی تعلیم کو پھر اسی قوم میں پھیلانے کے لئے
یہ انجمن کوشش کرتی ہے۔

اس انجمن نے اپنے ابتدائی دو سالوں میں تعلیم نسوان کی طرف خاص توجہ دی۔ سال اول کی نسبت سال دوم میں کچھ ترقی ہوئی۔ مگر پھر بھی ترقی قابل تشفی نہ ہوئی۔ یہاں صرف مستورات ہی جاہل نہیں بلکہ مردوں کی تعلیمی حالت بھی خواہ نہ تھی۔ انجمن نے ان تمام احتیاجوں کو دور کرنے کی سعی بلیغ کرنے کا وعدہ کیا۔

اس کے بعد ۱۸۸۵-۱۸۸۴ء کی رویداد پیش ہے۔ ۱۸۸۴ میں چار مجالس منعقد ہوئیں اول جلسہ ۹ مارچ ۱۸۸۴ کو ڈھاکہ کے زمیں دار و رئیس مولوی ضیاء احمد صاحب کی زیر صدارت ہوا۔ ۱۸ مارچ ۱۸۸۳ کے جلسے میں کارگزاراں انجمن اور انتظامی کمیٹی کے ممبران کا تقرر، ۶ دسمبر ۱۸۸۵ء میں بابو منورنجن کوہوکی زیر صدارت جلسہ ہوا جس میں ڈھاکہ کے غریب و بے وسیلہ طلباء کی با حالت بیماری مدد کرنے کا اقرار ہوا، ۱۳؍ دسمبر ۱۸۸۴ میں وہ انعامات جو کامیاب لڑکیوں میں تقسیم ہونے والے تھے انہیں دکھانے کے لئے ایک سلسے انعقاد ہوا۔ اس مجلس میں زمیندار ڈھاکہ مولوی غلام مصطفیٰ صاحب نے تحصیل علم کی ضرورت، مولوی ابوالخیر صدیق نے انجمن کے اغراض وفوائد اور پنڈت پرشنو چندر بدیارتن نے ہندو مسلمان اتفاق پر ایک فصیح مضمون بیان فرمایا۔

اغراض انجمن کو عمل میں لانے کے لئے اس انجمن کے کارگزاروں اور ہر ضلع کے نائب ممبراں پر مشتمل یہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس رسالے میں ان تمام ممبران اور نائب ممبران کے نام بھی درج ہیں۔ اس مجلس میں انجمن کے قواعد میں چند ترامیم کی گئیں ان ترامیم شدہ قواعد کا ذکر بھی ہے۔ ان ہی قواعد کے آخر میں ۹ فروری ۱۸۸۵ء کو مولانا عبید اللہ العبیدی اور جناب کفیل احمد حاصب کے انتقال پر اظہار افسوس کیا گیا ہے۔

۱۸۸۵ء کے دسمبر مہینہ میں منشی ریاض الدین انجمن کی طرف نائب ہو کر گھوڑا سال تشریف لے گئے۔ جہاں انہوں نے منشی فضل الرحمٰن صاحب کی تائید سے انجمن احباب اسلامیہ کی ایک شاخ کھولی دوسری طرف مولوی عبدالکریم انجمن کی طرف سے کلکتہ ایجنٹ مقرر ہوئے۔

اس کے بعد مختلف امتحانات دینے والی اور کامیاب ہونے والی خواتین کے لئے خاص انعامات، ممتحن و مہتمم حضرات اور بعض تائید، چندہ دینے والوں کا بیان ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ کلکتہ میں بھی انجمن احباب اسلامیہ کی ایک شاخ کھولی گئی تھی اس کے صدر خان بہادر مولوی سراج الاسلام، نائب صدر معراج الدین احمد صاحب، سکریٹری مولوی عبدالکریم صاحب، ایسسٹنٹ سکریٹری سوغات علی صاحب اور محمد حسن صاحب، خزانچی کے فرائض امداد علی صاحب ادا کرتے تھے۔ اس انجمن کے ۸۹ ممبر ہو چکے تھے۔

اس کے بعد انجمن احباب اسلامیہ کے قواعد مذکور ہیں جن میں مقاصد انجمن، ممبر ہونے کے قواعد، ممبر ہونے کا فارم، ممبری سے استعفا دینے کے قواعد، عطیہ اور چندہ لینے کے قوائد، کارکن کمیٹی کے ممبر اور اہلکار کی تعداد، کارکن کمیٹی کا کام، صدر انجمن کا کام، سکریٹری کی کارروائی، خزانچی کا کام، انجمن کے قوانین، انجمن کا فنڈ، ایجنٹ مقرر کرنا اوران کا کام، لڑکوں

کی تعلیم اوران کی مدد، تعلیم نسوان کے امتحان کے قواعد، نصاب امتحان، ممتحن کے خطا فارم اس کے بعد امتحان دینے والوں کی غرض کا ایک نمونہ پیش ہے۔

اس رسالے میں ۸۷۔۱۸۸۶ء میں انجمن احباب اسلامیہ ڈھاکہ کی بہرہ تعلیم نسواں کی سال اول سے لیکر سال ششم تک اردو و بنگلہ کتابوں کا نصاب بھی ررج ہے۔جس سے اس زمانے میں تعلیم و تدریس کے معیار کو جانچنے میں مدد ملتی ہے۔ پھر پاس شدہ لڑکیوں کے نام کی فہرست بھی درج ہے۔

اس رپورٹ کا اہم حصہ ان ممبران کا ذکر ہے۔ جو انجمن احباب اسلامیہ ڈھاکہ سے وابستہ تھے۔ جو ڈھاکہ، کلکتہ، نواکھالی، فرید پور، بریسال، سلہٹ، تپرا، چٹاگانگ، میمنسنگھ، پبنہ ہوگلی اور جسر علاقوں کے رہنے والے تھے۔

پھر ممبران انجمن احباب اسلامیہ کلکتہ کی ایک طویل فہرست ہے۔اس کے بعد انجمن احباب اسلامیہ گھوڑا سال کے نام درج ہیں۔آخر میں جن حضرات نے انجمن کی کارروائی سے خوش ہوکر ۸۷۔۱۸۸۶ء کے لئے یک مشت چندہ سے انجمن کی مدد فرمائی ان کے نام درج ہیں۔

انجمن نے مفید اور عام تعلیم نسوان کے لئے تصنیف و تالیف کا فریضہ ادا کرنے کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا جس کے تحت بنگلہ زبان میں جناب مولوی معراج الدین اور جناب منشی ریاض الدین احمد نے ” تحفۃ المسلمین “ لکھی تھی اس کتاب میں ضروری دینی مسائل بہت ہی آسان اور مختصر عبارت میں بیان کئے گئے ہیں۔

آ کر ۸۷۔۱۸۸۶ کی تعلیم نسواں کی حوصلہ افزائی کے لئے خاص اور زوائد انعامات کا اعلان درج ہے تا کہ لڑکیاں لکھنے پڑھنے میں ہمہ تن مصروف ہوں۔

زبان واسلوب بیان: زبان عام فہم اور سہل وروزمرہ کے مطابق ہے۔

اشاعت: سن اشاعت اور مقام اشاعت کچھ بیان نہیں۔

حوالہ جات

۱۔مقدمہ خیالات آزاد ص۲۰۔۲۱

۲۔مشرقی بنگال میں اردو ص ۸۳

۳۔وزیر آغا۔اردو ادب میں طنز و مزاح (لاہور، اکاڈمی پنجاب ۱۹۸۷ء) ص ۱۲۴

۴۔اردو ادب میں طنز و مزاح، غلام احمد ص ۱۸۳

۵۔مقدمہ خیالات آزاد ص ۲۱

۶۔خیالات آزاد ص ۸۹

۷۔مشرقی بنگال میں اردو ص ۱۰۲

۸۔ غلام احمد فرقت کاکوری، اردو ادب میں طنز و مزاح (لکھنو، سرفراز پریس، ۱۹۸۷م) ص۱۷۴

۹۔نوابی دربار از محمد آزاد ۷۔۸

۱۰۔مقدمہ نوابی دربار ص ۴

۱۱۔ماہ نو جنوری ۱۹۸۸ ص ۳۳

۱۲۔ مقدمہ نوابی دربار ص ل

۱۳۔ ایضاً ص ج

۱۴۔دیوان آزاد ص ۷۹

۱۵۔ایضاً ص ۱۰۸

۱۶۔ خدا کی شان ص ۴

۱۷۔ عبداللہ ملک، بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی (لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۷) ص

۱۸۔خدا کی شان ص ۱۵۷

۱۹۔ایضا ص ۹۸۔۹۷

۲۰۔ایضاً، ۱۰۱

۲۱۔ایضاً ص ۲۰۱

۲۲۔ ثلاثہ غسالہ ص ۱۶۷

۲۳۔ بیمار بلبل ص ۱۹

۲۴۔ بیمار بلبل ص ۳۱

۲۵۔ بیمار بلبل: (مقدمہ) ص۴

۲۶۔ تواریخ ڈھاکہ، ص ۱۴۶۔ ۱۴۵

۲۷۔ پندنامہ کاظم ، ص ۳

۲۸۔ پندنامہ کاظم ابوناظم محمد کاظم سراج گنجی، صفحہ ۲۴۔۲۳

۲۹۔ پندنامہ کاظم،ص ۴۸

۳۰۔ ایضاً، ص ۴۷

۳۱۔رویداد زلزلہ ص ۲

باب ششم

بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں

مذہبی تاریخ کے مأخذ

سہیل یمن

تعارف: ''سہیل یمن'' تاریخ جلالی کے نام سے بھی مشہور ہے۔ کیونکہ اس میں حضرت شاہ جلال کی سلہٹ آمد، اشاعت اسلام کی سرگرمیاں اور ان کی کرامات کی تاریخ ہے مصنف نصیر الدین حیدر ساؔمی ہیں۔

حالات مصنف: مولوی نصیر الدین حیدر تخلص ساؔمی بریسال میں بطور منصف فرائض انجام دیتے تھے۔ ان کے والد مولوی معز الدین صفدر خان بہادر چوبیس پرگنہ کے صدر الصدور تھے۔ اور ضلع سودارام کے باشندے تھے۔ مولوی نصیر الدین حیدر نے علوم متداولہ کی تحصیل مدرسہ عالیہ کلکتہ سے کی۔[1]

آپ مولانا وجیہ کے نامور شاگرد تھے۔ اور مشہور انشاپرداز تھے۔ سہیل یمن عرف تاریخ جلالی ان کی بے حد مقبول اور مشہور تصنیف ہے۔ جس میں شاہ جلال تبریزی کے حالات زندگی ہیں۔[2] ساؔمی عربی اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ حافظ اکرام اللہ ضیغمؔ کے شاگرد تھے۔

انہوں نے ۱۲۸۲ھ میں انتقال کیا۔[۳]

تاریخی اہمیت:۔ ''سہیل یمن'' کے مطالعے سے چودھویں صدی میں بنگلہ دیش کے علاقہ سلہٹ کی مذہبی حالت کا پتہ ہے کہ شاہ جلال مجرد کی آمد سے پہلے یہ علاقہ ہندو راجاؤں کے زیر اثر تھا اور ہندو مذہب کو یہاں برتری حاصل تھی۔ اس علاقے میں مسلمان جوا کا دکا تھے انہیں چوں کرنے کی جرات نہ تھی۔ لیکن حضرت شاہ جلال نے ہندو راجہ گوڑ گوبند کو شکست دے کر اس علاقے کو اسلام کی روشنی سے منور کیا۔ ۱۳۰۳ میں سلہٹ فتح کیا۔ اور یہاں اپنے ساتھی پیڑوں کو بسایا اور ان سے ارشاد وہدایت کا کام لیا۔ اور خود قیام سلہٹ کے سنتیس (۳۷) سال کچھ وقت تو شاہ صاحب نے ظاہری انتظامات میں گزارا اور باقی عبادت اور ارشاد وہدایت میں صرف کیا۔

بنگلہ دیش کی مذہبی تاریخ میں حضرت شاہ جلال کو بہت اہمیت حاصل ہے اسلئے ''سہیل یمن'' کا مختصر خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت شاہ جلال یمن کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام محمد تھا۔ کم سنی میں ہی شاہ جلال کے والدین نے انہیں داغ مفارقت دیا اور اپنے ماموں سید احمد کبیر سرہندی کے زیر سایہ چلے آئے۔ کبیر صاحب خوب درویش منش انسان تھے۔ وہ شاہ جلال کی باطنی کفیت سے آگاہ تھے۔ لہذا تعلیم کی تکمیل کے بعد انہوں نے شاہ جلال کو ایک مٹھی مٹی عطا کی اور فرمایا کہ وہ اس علاقے چلے جائیں جہاں کی مٹی رنگ اور خوشبو میں اس مٹی سے مشابہت رکھتی ہو۔ شاہ جلال نے تعمیل حکم کرتے ہوئے آغاز سفر کیا۔ راستے میں شاہزادہ یمن بھی ان کے ہمراہ ہولیا۔ دہلی میں ان کی ملاقات شیخ نظام الدین اولیاء سے ہوئی جنہوں نے بطور تبرک انہیں ایک جوڑا

کبوتر کا عطا فرمایا۔ آخر کار سفر کرتے ہوئے شاہ کلام اپنے تین سو ساٹھ ہمراہیوں کے ساتھ بنگال میں سلہٹ کے مقام پر پہنچے۔

ان دنوں سلہٹ میں ایک مسلمان بنام برہان الدین رہتا تھا۔ اس کے گھر بیٹا پیدا ہوا تو اس نے خوشی کی تقریب میں ایک گائے ذبح کی۔ راجا گوڑ گوبند کو جب اس حرکت کا پتہ چلا تو اس نے نوزائیدہ بچے کو قتل اور باپ کے ایک ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ چنانچہ برہان الدین اس ظلم کے خلاف داد لینے کو بنگال کے بادشاہ وقت (سلطان شمس الدین فیروز شاہ) کے پاس گوڑ پہنچا۔ بادشاہ نے اپنے بھتیجے سلطان سکندر کی زیر قیادت ایک فوج روانہ کی تاکہ اس ظالم کا بدلہ لیا جاسکے۔ لیکن گوڑ گوبند کے جادو اور اس جنوں بھوتوں کے لشکر کا مقابلہ مسلمان فوج نہ کر سکی۔ بادشاہ نے ایک اور فوج نصیر الدین سپہ سالار کی زیر سرکردگی روانہ کی۔ لیکن یہ فوج بھی تاب مقاومت نہ لاسکی۔ اس موقع پر شاہ جلال اپنے تین سو ساٹھ ہمرائیوں کے ساتھ مسلمان سپاہ کے ساتھ شامل ہو گئے۔ جنہوں نے آخر گوڑ گوبند کو شکست دی اور وہ پہاڑی علاقوں میں روپوش ہو گیا۔ بعدازاں شاہ جلال نے سلہٹ میں قیام اختیار کرلیا۔ جہاں ۵۹۱ ھ/۱۱۹۴ء میں ان کی وفات ہوئی۔ لیکن شیخ محمد اکرام نے آب کوثر میں لکھا ہے کہ ۲۰ ذی قعدہ ۷۴۰ یعنی ۱۸ مئی ۱۳۴۰ء کو حضرت شاہ جلال نے وفات پائی۔

آپ کی تاریخ وصال ''شاہ جلال مجرد قطب بود'' کے جملہ سے نکلتی ہے۔[۴]

''سہیل یمن'' کو نصیر الدین حیدر سامی نے دو کتابوں کی مدد سے مرتب کیا تھا۔ ایک ''روضۃ الصالحین''، جس کے مصنف کا نام معلوم نہیں اور دوسری درگاہ خادم معین کی لکھی ''حضرت شاہ جلال'' سے۔

''سہیل یمن'' کے کئی اندر راجات ٹھیک نہیں ہیں جیسے سہیل یمن کے مطابق شاہ جلال یمن کے رہنے والے تھے۔ لیکن اس عہد کے برآمد سکوں اور شیخ علی شیر کی لکھی'' شرح نزہت الارواح'' سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ جلال یمن نہیں بلکہ ترکستان کے علاقے قونیہ کے رہنے والے تھے۔ ان کا نام شیخ جلال مجرد تھا۔ محکمۂ آثار قدیمہ پتھر کا ایک پرانا کتبہ دستیاب ہوا ہے۔
اس کتبے پر بھی یوں تحریر ہے۔

''یہ عزت شیخ المشائخ مخدوم شیخ جلال الدین مجرد بن محمد، اور فتح اسلام عرصہ سری ہٹ (سلہٹ) بہ دست سکندر خان غازی بعہد سلطان فیروز شاہ دہلوی۔[5]

غوثی مالوی کے ''گلزابرار'' کا اردو ترجمہ ''موسومہ افکار الابرار'' دستیاب ہوا ہے۔ یہ کتاب ۱۶۱۳ء میں لکھی گئی تھی اس میں شیخ جلال کے متعلق ذیل کا اندراج ہے۔

یاد شیخ جلال الدین مجرد ''سہیل یمن'' میں شاہ جلال کی تاریخ وفات ۵۹۱ھ/۱۱۹۴ء درج ہے۔ لیکن شاہ جلال کی ملاقات ۱۳۴۶ء میں ابن بطوطہ کے ساتھ ہوئی تھی اس ملاقات کا ذکر ابن بطوطہ اپنے سفرنامہ میں یوں کرتے ہیں:۔

> ''یہ شیخ (جلال الدین) اپنے وقت کے قطب تھے۔ ان کی کرامتیں مشہور ہیں، عمر بھی ان کی زیادہ ہے وہ فرماتے تھے کہ میں خلیفہ مستعصم باللہ کو بغداد میں دیکھا ہے اور جس وقت وہ قتل کیا گیا وہ وہاں موجود تھے وہ ایک سو پچاس برس کی عمر پانے کے بعد انتقال ہوئے۔''[6]

ابن بطوطہ کے مندرجہ بالا بیان سے واضح ہوتا ہے کہ سہیل یمن میں شاہ جلال کی جو تاریخ وفات درج ہے درست نہیں۔

اگرچہ سہیل یمن کے بعض اندراجات غلط اور ناقابل تسلیم ہیں، لیکن اس سے حضرت شاہ جلال کی تاریخی اہمیت اور روحانی عظمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ سہیل یمن کے علاوہ نہایت قدیم کتبے اس امر کے شاہد ہیں کہ سلہٹ کی فتح ''یہ عزمت شیخ المشائخ مخدوم جلال الدین مجرد بن محمد'' وقوع پذیر ہوئی۔[7]

زبان و اسلوب بیان: سہیل یمن فارسی زبان میں لکھی گئی ہے۔ زبان میں نہایت تکلف و تصنع کا اہتمام برتا گیا ہے۔ فارسی زبان میں عربی الفاظ کی آمیزی ہے۔ ساؔمی چونکہ خود شاعر تھے اس لئے جگہ جگہ اشعار کا استعمال بھی گیا ہے۔ ساؔمی کو زبان و بیان پر اچھی قدرت حاصل تھی۔

اشاعت: سہیل یمن دوبارہ طبع ہوئی لیکن پھر بھی آج نایاب ہے۔ بار دیگر مطبع غوثیہ کلکتہ میں ۱۹۱۱ع میں چھپی۔[8]

''سہیل یمن'' کے قلمی نسخے کی مائیکروفلم کاپی ڈھاکہ یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔
''سہیل یمن'' با ہتمام و اضافات بہ زبان اردو از شاہ ساجد علی سلہٹی، مطبع غوثیہ کلکتہ (۱۳۱۲ھ) سے شائع ہوئی۔ اور اس کا اردو ترجمہ حاجی مبشر علی دبیر، ۱۲۷۷ھ میں ''تاریخ جلالی'' کے نام سے ہوا اور مطبع قیومی کانپور سے ۱۳۲۲ھ میں چھپا۔[9]

گلزار نعت

''گلزار نعت'' کے مصنف منشی رحمان علی طیش ہیں۔ اس میں مختصر کتاب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ثنا پر مبنی چند منظوم قصائد ہیں۔ اس طرح گلزار نعت کا شمار بنگلہ دیش میں

لکھی مذہبی تاریخ کے درجے میں آجاتا ہے۔اس میں صفحات کی تعداد ۷۹ ہے۔
احوال شاعر: منشی رحمان علی طیش کا شمار ڈھاکہ کے شرفا میں کیا جاتا ہے۔نہایت باخلاق اور وسیع المعلومات بزرگ تھے۔تاریخ سے خاص انس رکھتے تھے۔ بزرگان قدیم کے یادگار تھے۔ان کی صحبت قدیم معلومات کے لئے درس گاہ تھی۔لال باغ ڈھاکہ میں رہا کرتے تھے۔
طیش نے عطش کی صحبت سے شعروسخن کا شوق پیدا کیا۔اوراس فن میں عطش کے بعداُن کے جانشین قرار پائے۔انہوں نے ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں انتقال فرمایا۔[۱۰]

تاریخی اہمیت: جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے۔''گلزار نعت'' میں نعتیہ قصائد،غزلیں،مخمس اورمسدس ہیں۔شروع میں ایک قصیدہ درحمد باری تعالی ہے۔تین قصائد فارسی زبان میں بھی ہیں۔آخر میں انہوں نے ایک عربی نعتیہ قصیدہ مولانا حافظ مولوی محمد حسن سنبھلی متخلص بہ محمد بھی شامل کرلیا ہے۔

زبان واسلوب بیان: گلزار نعمت میں تین فارسی قصائد ہیں اور حافظ مولوی محمد حسن محمد کے ایک عربی قصیدے کے علاوہ تمام قصائداردو زبان میں ہیں۔کتاب کی زبان منظوم سادہ وآسان ہے۔یہ اپنے وقت میں نہایت مقبول ہوئی اس لئے شائقوں نے قدردانی سے بازوی جان وتعویذ گلوی دین وایمانی بنائی۔[۱۱] نمونہ کلام ملاحظہ کیجئے۔

قافلے جب کہ مدینے کی طرف جاتے ہیں
اپنی محرومی پہ ہم روتے ہیں شرماتے ہیں ۔
گر چہ سامان نہیں ظاہر میں مہیا لیکن
عاجزونکی وہ مدح غیب سے فرماتے ہیں ۔[۱۲]

اشاعت: گلزارنعت مطبع نظامی کانپور سے ۱۸۶۷ء/۱۲۸۴ھ میں طبع ہوئی۔

احسن العقائد

تعارف: ''احسن العقائد'' ایک مذہبی کتاب ہے۔اس کے مصنف مولانا عبدالرحمٰن رئیس سلہٹ تھے۔اس میں مختلف مذہبی مسائل پر بحث آئے ہیں تاکہ انیسویں صدی کے مسلمانوں کا ایمانی جذبہ مزید پختہ ہو۔اس چیز کا اعتراف مصنف خود یوں کرتے ہیں:۔

''میں سالکان راہ سنت اور ہروان طریق ہدایت کے غرض کرتا ہوں کہ مدت دراز سے یہ مسودہ دل پر نقش پذیر تھا۔اور یہ آرزو جاگزیں خاطر فاتر تھی کہ کوئی رسالہ مختصر مفید عام عقائد میں لکھوں کہ جس کے مطالعہ سے ظلمت جہل وگمراہی جوعوام کے دل میں ہے دور ہوجائے۔''[۱۳]

تایخی اہمیت: ''احسن العقائد'' کی تاریخی اہمیت اس قدر ہے کہ یہ کتاب انیسویں صدی کے بنگلہ دیش میں رہنے والے اہم سنت وجماعت کے عقیدت مندوں کے لئےلکھی گئی تھی۔تاکہ قواعد ایمان اور حقیقت ایمان میں اگر کوئی کوتاہی پیدا ہوگئی ہوتو اس کی اصلاح کر لی جائے۔چنانچہ کتاب میں خدا تعالی کی توحید ویکتائی،فرشتوں کے فرائض،قرآن مجید کی دیگر آسمانی کتابوں پر فضیلت،انسانوں کی رہنمائی کے لئے پیغمبروں کا آنا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم الانبیاء ہونا،عذاب قبر کا بیان،ارکان ایمان،احکام ایمان،شرائط ایمان،حقیقت ایمان،گناہ کبیرہ وگناہ صغیرہ کی حقیقت،کلمہ طیبہ کی فضیلت،صحابہ کرام کی تعظیم وتکریم کرنے کی ہدایت اور اہم سنت وجماعت سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کے فرائض اور نشانیاں بیان کی ہیں۔

زبان و اسلوب بیان: کتاب کی زبان اردو ہے۔ بقول مصنف مسائل عقائد اہل سنت و جماعت بدلائل عقلیہ ونقلیہ نہایت وضاحت کے ساتھ زبان سلیس، عام فہم اردو میں مذکور ہیں۔[۱۴]

اگرچہ زبان سلیس وعام فہم ہی ہے۔مگر عربی امثال کی بھرمار ہے۔جو قرآن شریف کی آیات، احادیث نبوی ودیگر عربی فقہا کی کتابوں پر مبنی ہیں۔مصنف نے شرح فقہ اکبر، عقائد نسفی، عقائد تمہید، شرح مقاصد، تکمیل الایمان، بدور المسافرۃ، تفسیر مدارک، تفسیر معالم، تفسیر بیضاوی، تفسیر کواشی، تفسیر فتح العزیز، صحیح بخاری، صحیح مسلم، ترمذی، مشکوۃ المصابیح، حصن حصین، ترجمہ مشکوۃ، احیاء العلوم، شرح الصدور، جذب القلوب الی دیار المحبوب کے علاوہ بھی دیگر صحائف معتبرہ سے استخراج کیا ہے۔[۱۵]

اشاعت: یہ کتاب ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۲ء میں مطبع نظامی واقع کانپور سے چھپی۔

براہین جیادفی سدباب الالحاد

تعارف: ''براہین جیادفی صدباب الالحاد'' کا تعلق بنگلہ دیش کی مذہبی تاریخ سے ہے۔جس کے مصنف محمد عبدالحئ اختر نصیرآبادی میمن سنگھ ہیں۔

احوال مصنف: ۔محمد عبدالحئ اختر میمن سنگھ میں فی الحال کشور گنج ضلع کے بولائی گاؤں میں ۱۸۴۱ء/ ۱۲۵۷ھ میں پیدا ہوئے۔اور ۱۹۳۰ء/ ۱۳۳۱ھ میں انتقال فرمایا۔[۱۶]

عبدالحئ اختر بڑے پایہ کے عالم اور صاحب تصنیف تھے۔عبدالحئ اختر نے عربی اور فارسی کی ۵۵ کتابیں اپنی زندگی میں لکھی تھیں۔[۱۷] مگران میں تقریباً سب ہی ناپید ہیں۔

تاریخی اہمیت: اس کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انیسویں صدی کے بنگلہ دیش میں ایک ایسا لا مذہب فرقہ پیدا ہو گیا تھا جو سیدھے سادھے مسلمانوں کو راہ راست سے ہٹانے کے درپے ہو گیا۔

اوران کو مذہب اسلام سے بھٹکانے لگا۔بقول مصنف ''ان دنوں ایک فرقہ نکلا ہے نہ ہندو نہ مسلمان اس فرقہ کے اکثر بیچارے ان پڑھ سیدھے مسلمانوں سے اصول مذہب کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور چرب زبان سے ان کو بہکاتے ہیں چنانچہ ان دنوں سلہٹ کے اطراف میں بھی اس فرقہ ضالہ نے کچھ زور باندھا اور بعض جوفروش گندم نما مسلمان ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے اور طرح طرح کے فساد امور اسلام میں پیدا کرنے لگے۔'' [۱۸]

اور مفسد لوگوں نے چند سوالات اس علاقے کے رئیس نامی جناب شاہ احمد کے پاس بھیجے وہ سوالات یہ تھے:۔

''قرآن شریف جو آسمانی ہے اس کی کیا دلیل ہے؟

قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق علاوہ مسلمانوں کے یہود، نصاریٰ وہنود وغیرہ قومیں جہنمی ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اللہ تعالی سب کا مالک وخالق ہے۔مگر وہ تمام بندوں کو نار جہنم میں جھونک دے گا اور مسلمانوں کو نعمت بہشت سے سرفراز کرے گا۔یہ خدا کی کون سی بندہ نوازی ہے؟

روپیہ چوری کرنے کے جرم میں ہاتھ کاٹنا اور زنا کے سبب سے سنگسار کرنا یہ کیا انصاف ہے؟

خداوندہ کریم کو اختیار تھا کہ وہ سب کو ایک دین میں پیدا کرتا تو علیحدہ علیحدہ دین پیدا کرنے کے کیا اسباب ہیں؟

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی یہ تہمت تھی کہ چونکہ وہ نہایت عاقل و دانا انسان تھے اس واسطے انتظام امور دنیا کے یہ کلام اللہ اپنی زبان میں بنا ڈالا۔

ان لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ آدمی جو کچھ دنیا میں نیکی کرتا ہے اس کے عوض مالدار اور صاحب اولاد ہوتا ہے۔ صحیح اور تندرست اور بیمار رہتا ہے۔ اور اولاد بھی اس کی مرتی ہے۔

سید شاہ احمد نے ان سولوں کو جناب سید عزیز الحق کے پاس بھیجا جنہوں نے ان کی نقل محمد عبد الحئی اختر صاحب کے پاس بھیجی انہوں نے قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کے خاطر خواہ جواب دیئے تاکہ اس علاقے کے مسلمانوں کی ایمانی جڑ مضبوط اور حمیت دینی برقرار رہے۔

زبان و اسلوب بیان: رسالہ اردو زبان میں تحریر کیا گیا ہے۔ انداز بیان کچھ پیچیدہ اور گنجلک ہے۔ بوقت ضرورت قرآن شریف کی آیات اور احادیث سے امثال پیش کی گئی ہیں۔

اشاعت: یہ کتابچہ جس میں صفحات کی تعداد صرف ۲۰ ہے۔ مطبع احمدی واقع کانپور سے ۱۳۰۲ھ /۱۸۸۴ء میں طبع ہوا۔

رسالہ چراغ ایمان

تعارف: ''رسالہ چراغ ایمان'' کے مصنف مولوی عبدالکریم متخلص بہ خاکی ہیں۔ اس کتاب کا موضوع ''سود لینا جائز ہے کہ نہیں'' اس سے متعلق ہے۔ سود ایک مذہبی مسئلہ ہے۔ رسالہ ''چراغ ایمان'' کا موضوع یہی مسئلہ ہے۔

احوال مئولف: مولوی عبدالکریم متخلص بہ خاکی کے والد کا نام منشی عبدالعظیم عرف گرانی میاں تھا ان کا شمار الاچی پور کے شرفا میں ہوتا تھا۔ اس شہر کی فوجداری عدالت کی محرری میں مامور تھے۔[19]

مولوی عبدالکریم بڑے فاضل اور مولوی عدالت تھے۔ جب عہدہ مولوی عدالت کا زائل ہوا تو ڈپٹی مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔ اور اسی عہدے سے پینشن لے کر حج کو گئے اور زیارت حرم شریف سے واپس آ کر ذکر الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ ان کی سن وفات کا پتہ نہ چل سکا۔

تاریخی اہمیت: آج کل اسلام میں گوناگوں فرقے پیدا ہو گئے ہیں۔ جن میں کچھ سود لینے کو برا نہیں سمجھتے ہیں۔ ''حقیقت میں سود لینا'' اس زمانے میں مروج ہو گیا ہے۔ اور اس کی حرمت پر کسی کو کچھ باک اور پرواہ نہیں ہے۔ یہ لوگ احکام شرعی کو یک قلم بھول گئے ہیں۔ لیکن مصنف نے مختلف قرآنی آیات اور احادیث کی روشنی میں ثابت کر دکھایا ہے کہ سود لینا حرام ہے۔ اور سود لینے والے قیامت کے دن ہمیشہ معذب رہیں گے۔ اور حدیث نبوی سے بھی سود لینے والے پر لعنت کرنا ثابت ہے۔ کچھ کچھ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ چونکہ ہندوستان دارالحرب ہے۔ لہذا یہاں سود لینا جائز ہے۔ عبدالکریم نے اس خیال کی قطعی تردید کی ہے۔ اور مختلف دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ ملک دارالحرب نہیں ہوسکتا۔ اس ملک میں کسی قسم کا سود لینا اور دلوانا حرام ہے اور حلال جاننا کفر ہے۔[20]

زبان و اسلوب بیان: اس رسالے کی زبان اردو ہے۔ اس رسالے کا تعلق چونکہ مذہبی اور شرعی مسئلے سے ہے اسی لئے اس کی زبان بھی آسان ہے تا کہ عوام اسے پڑھ سکیں اور عمل پیرا ہو سکیں۔ اپنے دلائل کو قرآن کی آیات اور احادیث کی مدد سے پر زور بنانے کی کوشش ہے۔[21]

اشاعت: یہ رسالہ رپن پریس کلکتہ سے ۱۳۰۶ھ/ ۱۸۸۸ء میں چھپا۔

کلمۃ الحق

تعارف: ''کلمۃ الحق'' کے مصنف عبدالحی اختر نصیر آبادی (میمن سنگھ) ہیں۔ مصنف کا موضوع سخن ''بدعت'' کی تقسیم واقسام ہے۔ کتابچے میں صفحات کی تعداد ۲۴ ہے۔

تاریخی اہمیت: اس کتابچہ کی تاریخی اہمیت اس قدر ہے کہ اس میں مذہبی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ انیسویں صدی کے بنگلہ دیش میں سماج میں مختلف مذہبی مسائل درپیش آئے تھے۔ جس کی عکاس یہ مختصر سا کتابچہ ہے۔ ان میں ''بدعت'' بھی ایک مسئلہ تھا۔ جس کی دو اقسام ہیں۔ بدعت حسنہ وبدعت سیئہ ۔ مگر عبدالحیٔ اختر کو یہ مسلک پسند نہیں۔

بدعت کے عمل میں آنے سے حدیث میں ردو بدل پیدا ہوسکتا ہے۔ بدعت اگرچہ فعل عصیان وضلال نہیں مگر اس کا ترک کرنا اولی ہے۔ مصنف نے مختلف امثال واقوال سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بدعت کا عمل میں نہ لانا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ بعض بدعت حسنہ و بدعت سیئہ کے درمیان فرق پیدا نہیں کرسکتے۔

زبان واسلوب بیان: کتابچے کی زبان اردو ہے لیکن بے حد پیچدار اور پرتکلف ہے کہ قاری کو ایک سطر بھی سمجھنا دشوار ہے عربی کی بھرمار ہے۔ جس کی وجہ سے یہ کتاب ناقابل فہم معلوم ہوتی ہے۔

اشاعت: کتابچہ میں سال اشاعت اور مقام اشاعت کا کہیں بھی ذکر نہیں۔

فتاوی شوکت محبوب سبحانی

تعارف: ''فتاوی شوکت محبوب سبحانی'' کا تعلق بنگلہ دیش کی مختلف مذہبی تحریکوں اور معاملات سے ہے۔ یعنی ذکر جلی یا جہراور ذکر خفی میں سے کون سا ذکر مذہبی رو سے جائز و درست ہے؟ شاہ خلیل الرحمٰن نے قرآن و حدیث کے دلائل سے یہ ثابت کیا کہ موقع ومحل اور وقت کی مناسب کے مدنظر ہر قسم کا ذکر ہی درست ہے۔

''فتاوی شوکت محبوب سبحانی'' کے مصنف شاہ خلیل الرحمٰن صاحب نندن پوری ہیں، کتابچے میں صفحات کی تعداد ۶۴ ہے۔

احوال مصنف: شاہ خلیل کا وطن نواکھالی میں لکھی پور تھانہ کے تحت نندن پور گاؤں میں تھا۔ اسی لئے وہ نندن پوری کے نام سے مشہور تھے۔ یہیں پر ان کی خانقاہ بھی تھی۔ ان کے والد کا نام حاجی ثمرالدین ملاخوندکار تھا۔ ان کے آبا واجداد تبریز سے فیروز شاہ کے عہد میں دہلی سے آئے۔ اس خاندان کے ایک فرد علاء الدین ملا ۱۰۷۶ھ/ ۱۶۶۸ء میں دہلی سے آج کے بنگلہ دیش میں آئے۔ اور نواکھالی میں زبورا اور اس کے بعد دیگولی میں سکونت اختیار کرلی۔ بعدازاں شاہ خلیل الرحمٰن کے والد ثمرالدین جامیر تلی میں چلے آئے مگر پھر اپنے پیر امام الدین صاحب کے حکم پر نندن پور چلے آئے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ بعدازاں شاہ خلیل الرحمٰن نے کان پور میں قیومی پریس میں خدمات انجام دیں۔ اور یہاں قیام کے دوران انہوں نے مختلف اولیاء کرام کی قبر زیارت کی۔ ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء میں وہ اجمیر، دہلی اور کربلا شریف گئے اور حضرت عبدالقادر جیلانی اور دیگر بزرگان دین کے مزار شریف قدم بوسی کو گئے۔ ان کی تاریخ وفات کا پتہ نہیں چل سکا۔ [۲۲]

تاریخی اہمیت: ''فتاوی شوکت محبوب سبحانی'' لکھنے کا مقصد مصنف کے تحت یہ تھا کہ اس فساد وعناد کو جو ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء سے ملک بنگال میں ذکر جہر پر لوگوں نے اٹھا رکھا تھا اور جس سے عوام لوگ گمراہ ہو رہے تھے۔ یک قلم مٹا دیا جائے۔ مولانا کرامت علی کا حوالہ دیتے ہوئے اس متنازعہ مسئلہ کا ذکر یوں کرتے ہیں:۔

> ان دنوں ملک بنگالہ کے بعض مقام میں جو ذکر جلی اور ذکر خفی کے باب میں جہالت کے سبب اکثر خلاف کر کے سوال کرتے ہیں کہ ذکر جہر یعنی بلند آواز سے ذکر کرنا اور ذکر خفی پست آواز سے ذکر کرنا دونوں درست یا ایک۔ اگر دونوں درست ہیں تو افضل کون سا ذکر ہے؟ اور اس سوال کرنے کا سبب یہ ہے کہ بعض لوگوں نے ایسا کیا ہے کہ پہلے وہ لوگ ایسے مرشد سے بیعت تھے جو نقشبندیہ طریقہ کے موافق ذکر خفی تعلیم کرتا ہے۔ بعد اس کے دوسرے طریقہ کے کسی مرشد سے ان لوگوں نے بیعت کر کے ذکر جہر سیکھ کے ذکر جہر کرنا شروع کیا۔ اور ذکر خفی کرنے والوں پر اعتراض کرنا شروع کیا۔ اور دونوں گروہوں میں پھوٹ اور نفاق ہوا۔[۲۳]

مگر خلیل الرحمٰن صاحب نے مختلف احادیث وقرآن کی آیت سے ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان کے لئے دونوں قسم کا ذکر ہی درست اور افضل ہے۔ ''ذکر خفی'' اس جگہ بہتر ہے۔ جہاں خوف ریا، اذیت مصلی اور لوگوں کی نیند میں حرج پیدا کرنے کا موجب ہو ورنہ ذکر جلی ہی بہتر ہے کیونکہ اس کا فائدہ دوسرے سامعین کو پہنچتا ہے ذاکر کے قلب کو بیدار کرتا ہے۔ اس کے قصد مراقبہ کی طرف رجوع کرتا ہے اس کے کان کو ذکر کی طرف مشغول کر دیتا ہے۔ نیند کو دور

کرتا ہے۔ اور قلب میں محبت الہی زیادہ پیدا کرتا ہے۔ خلیل الرحمٰن نے اس طرح دلائل کی روشنی سے مسلمانوں میں ذکر کے بارے میں جو فتنہ ہو گیا اسے فرو کرنے کی پوری کوشش کی۔

زبان واسلوب بیان:۔ رسالے کی زبان اردو۔ مصنف نے اپنے دلائل کو قرآن وحدیث شریف، اقوال مولانا کرامت علی، غوث اعظم حضرت عبدالقادر جیلانی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا سید احمد صاحب، مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی، حضرت امام غزالی صاحب کے اقوال سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس سے کتاب کی زبان بوجھل ہوگئی ہے۔ کیونکہ عربی دانی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

اشاعت: یہ رسالہ ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۷ء میں کان پور قیومی پریس سے طبع ہوا۔

مقامات محبوب سبحانی

تعارف: ''مقامات محبوب سبحانی'' کے مصنف جناب خلیل الرحمٰن نندن پوری ہیں۔ اس کتاب کا تعلق مذہبی ذکر اذکار سے ہے۔ صفحات کی تعداد ۶۱ ہے۔

تاریخی اہمیت: کتاب میں اول حمد ونعت اور حضرت عبدالقادر جیلانی کی مدح وستائش ہے۔ اس کے بعد طریق بیعت غوث الاعظم، ذکر اذکار اور مختلف وظائف، نفس وقلب کی پاکیزگی کے لئے مختلف دعائیں وطریقے اور آخر میں پھر حضرت عبدالقادر جیلانی کی مدح میں ایک قصیدہ ہے۔

زبان واسلوب بیان: '' مقامات محبوب سبحانی'' چونکہ مذہبی عقیدے کی کتاب ہے۔ اس لئے حسب معمول اس کی زبان میں بھی قرآنی آیات، احادیث اور اقوال عبدالقادر کی فراوانی

ہے۔کتاب کی زبان اردو ہے۔مگر عربی زبان کی آمیزش نے کتاب کی زبان کو بوجھل بنا دیا اور اردو زبان بھی اتنی رواں نہیں۔ بلکہ قدرے پیچ دار ہے۔

اشاعت: ''مقامات محبوب سبحانی'' قیومی پریس کانپور سے چھپی مگر سن اشاعت کا پتہ نہیں چلتا۔

صحیح شمس العارفین

تعارف: ''صحیح شمس العارفین'' کے مصنف خلیل الرحمٰن نندن پوری ہیں۔کتاب میں صفحات کی تعداد ۱۴۵ ہے۔اس کا موضوع سخن شریعت اور طریقت وحقیقت ومعرفت ہے۔

تاریخی اہمیت: اس کتاب کی تاریخی اہمیت اس قدر ہے کہ اس مطالعے سے اس عہد کے بنگلہ دیش میں لکھنے والوں کی مذہبی معاملات سے عقیدت کا پتہ چلتا ہے جس کی ترجمان یہ کتاب ہے۔اس میں عارفانہ مسائل،تصوف کی باتیں،قادریہ، چشتیہ،نقشبندیہ اور مجددیہ طریقے میں مرشد کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کے طریقے، عاشقان خدا پر تصوف کی منازل طے کرتے وقت مشکلات ومصائب کا کا جھیلنا، مرشد کس کو کہتے ہیں اور ان کی علامات، جد وجذبہ کی حالت میں آہ وزاری،شور وفریاد اور ناچنا درست ہے کہ نہیں۔وجد کی حالت ابتدا میں طاری ہوتی ہے یا ذکر کے انتہا میں، ایک پیر کے ہوئے دوسرے پیر سے بیعت کرنا درست ہے یا نہیں؟ کیا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنی باطنی کفیت وتاثیر دوسروں کو بخش سکتے تھے؟ معرفت سے کیا حاصل اور معرفت نہ حاصل کرنے میں کیا نقصان ہو سکتے ہیں؟ ذکر الٰہی کے فوائد، ذکر الٰہی کے وقت کی آداب کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ان ہی تصوفانہ باتوں کے بیان پر یہ کتاب مبنی ہے۔

زبان وبیان: کتاب بزبان اردو لکھی گئی ہے۔

اشاعت: یہ کتاب ۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۹ء میں کانپور رزاقی پریس سے طبع ہوئی۔

دافع الشبہات فی جواز الاستیجار علی الطاعات

تعارف: کتاب کے مصنف مولانا امین الحق صاحب اسلام آبادی ہیں۔اس کتاب کا تعلق چٹاگانگ کے علاقے کے مذہبی مسائل سے ہے۔ کتاب میں صفحات کی تعداد ۹۴ ہے۔

احوال مصنف: مولانا امین الحق صاحب اسلام آبادی تھانہ ہاٹ ہزاری چاٹگام کے رہنے والے تھے۔

تاریخی اہمیت: اس کتاب کی تاریخی اہمیت اس قدر ہے کہ اس کے مطالعے سے بنگلہ دیش میں انیسویں صدی کے مذہبی معاملات میں وقوع پذیر ایک اختلافی مسئلے کی تاریخ کا پتہ چلتا ہے۔بہت سے علماء کے نزدیک اس بات پر تضاد تھا کہ میت کو ثواب پہنچانے کے واسطے قبر کے نزدیک قرآن شریف کی تلاوت کرنا ٹھیک ہے کہ نہیں؟ قاریوں کو قبر پر پڑھنے کے لئے مقرر کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اور قرآن خوانی کے عوض اجرت لینا اور وصیت کرنا کسی شخص کو اپنی قبر پر تلاوت قرآن کے واسطے اور اپنے مال متروکہ سے عوضانہ مقرر کر دینا شرعا جائز ہوگا یا نہیں؟ مردے کو صدقوں اور دعاؤں سے ایصال ثواب پہنچتا ہے کہ نہیں؟ مردے کی ثواب رسانی کے لئے ضیافت کرنا اور ایام تعزیت میں وہ کھانا جو کہ ثواب مردہ کے لئے تیار کیا گیا ہے فقراء کے علاوہ اغنیاء کو کھانا درست ہے کہ نہیں؟

اس مسائل پر فقہاء مقدمین ومتاخرین میں بہت اختلاف ہے۔

مصنف نے فقہا کی رائے پیش کرنے کے بعد نتیجہ اخذ کیا ہے قبر کے نزدیک قرآن شریف تلاوت کرنا اور دعا کرنا تخفیف عذاب کا باعث ہوتا ہے۔ اور اجرت لے کر تلاوت کلام اللہ جائز ہے تاکہ میت اس ثواب عظیم سے محروم نہ رہے۔ زندوں کا صدقہ و دعا کرنا مردے کے عذاب کو ہلکا کرنے اور بلندی درجات اور حصول ثواب کا باعث ہوتا ہے اور مردے کی وفات کے تین دن اندر جیسے ایام مصیبت بھی کہا جاتا ہے وہ کھانا جو غرباء و مساکین کو کھلانے کی نیت سے پکایا جاتا ہے۔ مالداروں کو کھانا جائز نہیں۔ ''ایام مصیبت'' میں اہل میت سے ضیافت لینا ٹھیک نہیں کیونکہ دعوت تو خوشی میں مشروع ہے کہ غمی میں۔ قبروں کی زیارت کرنا اور مردے کے واسطے تہلیل پڑھنا مذہبی نکتہ نظر سے قابل استحسان ہے۔ لیکن قبروں پر شمع لاٹیں اور جھاڑ کا روشن کرنا اور طبلہ بجانا اور گانا بطور موسیقی خلاف شرع امور ہیں۔

زبان و بیان: ''دافع الشبہات فی جواز الاستیجار علی الطاعات'' اردو زبان میں لکھی گئی ہے۔

نظم العقائد

تعارف: ''نظم العقائد'' کے مصنف مولوی محمد سیف اللہ متخلص بہ جوہر ہیں۔ جن کا تعلق اسلام آباد یعنی چٹاگانگ سے ہے۔ اس کتاب میں اسلامی عقائد اور رموز دین بیان کئے گئے ہیں۔

تاریخی اہمیت: ''نظم العقائد'' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے بصورت نظم ہے۔ ابتداء میں حمد و نعت ہے۔ اس کے بعد آغاز کتاب ''المستطاب'' میں خدا تعالی کی ثنا، اس کی توحید، کلام پاک کا لاریب ہونا، جنت و دوزخ کی حقیقت، رسول کریم کا خاتم المرسلین و امام رسل ہونا،

ان کا معراج شریف، انسانوں کی ہدایت کے لئے انبیاء کا اس دنیا میں آنا، اولیاء کرام کی صفات ، اس کے بعد خلفائے راشدین کی تعریف و توصیف آخر میں خدا تعالی کی بخشش و بخشائش اس کا بندوں پر رحیم و کریم ہونا اور موت کا برحق ہونا ان حقائق کا ذکر ہے۔ کتاب کا خاتمہ ''مناجات'' سے ہوتا ہے۔

زبان و بیان: کتاب کی زبان فارسی جو بصورت نظم ہے۔ انداز بیان دلکش و دلنشین ہے۔

نمونہ کلام :۔

حسن عنوان نامۂ ایمان　　حرف حمد و ستائش رحمان
آنکہ صورت نگار انسان ست　　آفرینندۂ بنی جان ست

اشاعت: ''نظم العقائد'' ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء میں مطبع خفیہ پٹنہ سے مطبوع ہوئی۔

مصدر فیض محمدی

تعارف: ''مصدر فیض محمدی'' کے مصنف عبدالعلی دری ہیں۔ کتاب کا موضوع مذہبی مسائل ہیں اور سماج میں مذہب کے نام پر جو غلط کاریاں داخل ہوگئی تھیں ان کا ازالہ کرنا مصنف کا مقصود تھا۔ کتاب میں صفحات کی تعداد ۱۱۲ ہیں۔

تاریخی اہمیت: اس کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بنگلہ دیش کے مذہبی حلقوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل میلاد منعقد ہونے وقت قیام کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں بھی بہت اختلاف رائے تھی۔ مصنف نے مختلف احادیث، اقوال صحابہ اور دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ محفل میلاد میں ذکر ولادت کے وقت چونکہ آنحضرت بجسد اور

روح تشریف لاتے ہیں تو ان کی تعظیم کے لئے قیام کرنا جمیع خلائق پر واجب ہے۔ اور موجب ثواب ہے۔ اس کے بعد انہوں نے بتانے کی کوشش کی ہے کہ دین میں چار چیزیں ہی اصل ہیں ایک قرآن دوسرا حدیث تیسرا اجماع و اتفاق امت اور چوتھا قیاس، ان کے علاوہ دین میں کوئی نئی بات نکالنا بدعت ہے۔ آج کل سماج میں بہت سے غیر پسندیدہ رواج مروج ہو گئے ہیں جیسا کہ قبر پر کج کرنا، گنبد بنانا، قبروں پر چراغ روشن کرنا، تعزیہ بنانا، بزرگوں کا میلہ، اولیاء کی منت ماننا، جھنڈے نشان کھڑے کرنا یہ باتیں سراسر دین کے خلاف ہیں، ہمارے ملک میں اکثر مسلمان محرم کے وقت امام حسین کے نام پر بناوٹی درگاہ بناتے ہیں۔ اس میں سر مبارک کا مدفن بناتے ہیں۔ چراغان کرتے ہیں۔ درگاہ کے چاروں اطراف گھومتے ہیں۔ سینہ کوبھی کرتے ہیں۔ زاری گیت اور غزلیں گاتے ہیں۔ مبالغہ آمیزی کے ساتھ کربلا کے واقعات پڑھتے ہیں۔ خنجر بازی اور لاٹھی زنی کرتے ہیں۔ حالانکہ محرم کی دسویں تاریخ کو خیرات کرنا، صدقہ دینا، روزہ رکھنا اور ذکر پڑھنا مستحب ہے۔ چاٹگام میں چند اہل جاہل مسلمانوں نے حضرت بایزید بسطامی کی جعلی قبر بنا کر اسے ان کی درگاہ کی شہرت دے ڈالی ہے اور جاہل اور کمزور ایمان والے مسلمان دور دراز سے اپنی حاجت اور منت کے لئے آتے ہیں۔ حالانکہ حضرت بایزید بسطامی کی قبر بسطام میں ہے۔ اس کے بعد مصنف نے چٹا گانگ کا نام رکھنے کی وجہ تسمیہ اور اسی کی تعریف میں ایک ایک مختصر قصیدہ بھی لکھ ڈالا ہے۔ ہندوستان کے سماج میں قبر پرستی قبروں پر جھنڈے نشان چڑھانا، چراغان کرنا، ان کا بہت رواج چلا تھا۔ مصنف نے اس کی کڑی مذمت کی ہے اور شادی بیاہ کے موقوں پر ڈھول باجے بجانا، ناچنا، لہولعب کرنا ایکدم حرام قرار دیا، ہمارے مسلم سماج میں سماع

اور غنا دونوں سے اجتناب کرنا لازم ہے۔ کیونکہ انیسویں صدی میں ہمارے ملک خصوصاً چٹا گانگ میں سماع کا خوب رواج ہو چلا تھا۔ مصنف نے اس پر کڑی تنقید کی ہے۔

زبان واسلوب بیان: کتاب کی زبان اردو ہے۔ اور فقہ ومسائل کی عام کتابوں کے برعکس اس کتاب کی زبان میں ابہام وگنجلک نہیں۔ بلکہ سیدھی سادھی اور عام فہم ہے۔

اشاعت: مصدر فیض محمدی ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء میں صفحہ سے لے کر ۲۷ تک مطبع سلیمی ڈھاکہ اور باقی ماندہ مطبع انوار محمدی کلکتہ سے چھپی۔

رکن الاعظم

تعارف: ''رکن الاعظم'' کے مصنف رحیم اللہ عرف پیارے صاحب متوطن جہانگیر نگر (ڈھاکہ) ہیں۔ رسالے کا موضوع مذہبی مسائل ہیں۔ رسالے میں صفحات ۶۸ ہیں۔ یہ رسالہ لکھنے کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

چونکہ اس زمانے میں اکثر مسلمان بھائی عربی فارسی سے بے بہرا ہیں۔ اس لئے نواب احسن اللہ رئیس جہانگیر نگر ڈھاکہ کے ایما سے سلیس اردو زبان میں ضروری مسائل فقہیہ پر مبنی یہ رسالہ بنظر رفا عام لکھا۔[۲۴]

حالت مصنف: رسالہ کے مطالعے سے مصنف کے حالات زندگی کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ سوائے اس قدر کہ مرزا رحیم اللہ عرف پیارے صاحب، مرزا عبدالحق وزیر جان کے بیٹے تھے۔ اور مذہب میں حنفی مسلک پر عقیدت رکھتے تھے۔ اور ان کے نواب احسن اللہ سے اچھے تعلقات تھے۔ جن کے ایما پر انہوں نے یہ رسالہ تصنیف کیا۔[۲۵]

تاریخی اہمیت: اس رسالے کی تاریخی اہمیت اس قدر ہے کہ اس کے مطالعے سے انیسویں میں مذہبی مسائل جو زیر بحث آئے تھے۔ ان کا پتہ چلتا ہے۔ اس کتاب میں روزمرہ زندگی میں درپیش فقہی مسائل کا بیان ہے۔ مثلاً وضو کہ اس میں کیا فرض، سنت اور مستحب ہیں؟ کس پانی سے وضو جائز اور ناجائز ہے؟ کنویں کا نجس پانی کس طرح پاک کیا کا سکتا ہے؟ خوردہ (جھوٹا) کھانا، تیمّم، حیض، نفاس، نجاست، استنجا، کے اصول وقوانین جن کا تعلق ہماری روزمرہ زندگی سے ہے۔

پھر نماز کا بیان ہے اس کا مسلمان کی مذہبی زندگی سے گہرا تعلق ہے، اوقات نماز، اوقات جن میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ اذان کی شرائط وفرائض نماز، امامت کے اصول، حدث نماز، نماز ٹوٹنے کی وجوہات، نماز وتر، نفل نماز، قرات، قضا نماز کی ادائیگی، سجدہ سہو، مریض کی نماز، سجدہ تلاوت قرآن، نماز مسافر، نماز عیدین، نماز کسوف، نماز جنازہ، غسل میت، تکفین، جنازہ اٹھانا، دفن، ترکیب نماز جنازہ، پھر زکوۃ کے بیان میں سونے چاندنی کی زکوۃ کا بیان ہے۔

زبان واسلوب بیان: ''رکن الاعظم'' اردو زبان میں لکھی گئی ہے۔ اور مذہبی موضوعات پر لکھی جانے والی کتابیں جن کی زبان بے حد پیچ دار اور عربی آمیز ہوتی ہے۔ یہ کتاب ان کے برخلاف بہت سہل اردو میں لکھی گئی ہے۔ کتاب کا تعلق چونکہ روزمرہ کے مسئلے ومسائل سے ہے اسی لئے زبان عام فہم ہے تاکہ عوام کو ان کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ اور ان مسائل کی اہمیت کو سمجھ کر روزمرہ زندگی میں ان کا استعمال کیا جا سکے۔

اشاعت: یہ رسالہ منشی نولکشور لکھنو سے ۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۰ء میں طبع ہوا۔

دیوان ویسی

تعارف: ''دیوان ویسی'' کے شاعر فتح علی ویلسی چاٹگامی ہیں۔ یہ نعتیہ غزلوں کا دیوان ہے۔ دیوان ویلسی میں صفحات کی تعداد ۲۰۷ ہے۔

احوال شاعر: صوفی فتح علی ویسی کی پیدائش ۱۲۴۱ھ/ ۱۸۲۵ء میں ہوئی۔ [۲۶]

بچپن سے نہایت فہیم اور ذکی الطبع تھے کم سنی میں انہوں نے قرآن پاک اور دوسری ضروری کتابوں سے فراغت حاصل کر لی۔ پھر تفسیر فرقانی، حدیث نبوی، فقہ اور اصول فقہ، عقائد، منطق اور فلسفہ، بلاغت اور خصوصاً عربی اور فارسی ادب میں مہارت کاملہ حاصل کی۔ [۲۷]

فتح علی ویسی نے اپنی تعلیم ضلع ہوڑہ کے جگت ملیہ پور تھانہ میں شیر ہاٹ کے قریب دہسہ نامی مدرسے سے حاصل کی۔ [۲۸] حصول تعلیم کے بعد چاٹگام سے کلکتہ آ کر مٹیا برج میں نواب واجد علی شاہ کے پرائیوٹ سکریٹری مقرر ہوئے اور بعد ترقی کر کے حکومت ہند کے قائم کردہ پولیٹیکل منشن آفس جہاں سے معزول والی اودھ اور ان کے اعزا کو پنشن ملتی تھی اس میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ [۲۹] قیاس غالب ہے کہ ۱۸۶۷ء کے کچھ ہی دنوں بعد وہ اپنی سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو گئے اور زندگی کے باقی ماندہ اٹھارہ انیس سال مسلمانوں کے اصلاح عقائد اور خلق کی رشد وہدایت میں صرف کیا۔ [۳۰] انہوں نے ربیع الاول ۱۳۰۴ھ (۶ دسمبر ۱۸۸۶ء) کو اتوار کے دن چار بجے شام میں کلکتہ میں انتقال فرمایا۔ [۳۱]

تاریخی اہمیت: ''دیوان ویسی'' میں کل ۱۷۵ غزلیں ہیں۔ ان میں ۱۷۲ نعتیہ غزلیں ہیں، ۲۳ نعتیہ قصیدے اور ۶ متفرقات ہیں۔ اشعار متفرقات کے بعد چھ صفحات میں حضرت صوفی سید فتح علی ویسی کا شجرہ طریقہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ، شجرۂ مبارکہ طریقہ عالیہ قادریہ اور شجرۂ طیبہ مشائخ

چشتیہ پیش کیا گیا ہے۔ پھر دو صفحات میں حضرت ویسی کے خلفاء اور مریدین کی فہرست ہے۔ صفحہ ۲۰۹ پر حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی کی اولاد کا ذکر ہے۔ صفحہ ۲۳۱ پر حضرات پیران پیر دستگیر کی منقبت ہے۔

زبان واسلوب بیان: ''دیوان ویسی'' زیادہ تر نعتیہ غزلیں بزبان فارسی ہیں اس محدود موضوع پر انہوں نے تین ہزار سے زیادہ اشعار بڑی سادگی، جوش، کامیابی اور خوبصورتی کے ساتھ لکھے ہیں۔ اشعار میں بڑی تازگی، رعنائی اور دلکش پائی جاتی ہے۔ شاعر کے تجربہ میں خلوص اور گہرائی ہے۔ زبان و بیان پر بڑی قدرت ہے۔ شعر کو پسندیدہ اور خوب سے خوب تر بنانے کے لئے جن خارجی محاسن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا احساس ہے اور اس کے استعمال کی پوری صلاحیت تھی۔ حضرت ویسی کے ہاں عشق کا تصور بہت ہی اعلی وارفع، پاکیزہ، نفیس اور لطیف ہے۔ کیونکہ اس کا محبوب تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

نمونہ اشعار:۔

مشرق حب محمدؐ مطلع دیوان ما
مطلع خورشید عشقش سوزان ما
در تہہ ہر لفظ پنہاں نالۂ دل سوز ما
وزیں ہر حرف پیدا آتش پنہاں ما ۳۲

اشاعت: ''دیوان ویسی'' پہلی بار ۱۸۹۸ء میں مطبع غوثیہ کلکتہ سے شائع ہوا۔ یہ ۲۰۸ صفحات پر مشتمل تھا۔ دوسری بار ۱۹۲۲ء میں مطبع قیومی کان پور سے شائع ہوا۔ جو ۲۳۲ صفحات پر مشتمل تھا۔ تیسری بار دوبارہ ۱۹۳۵ء میں قیومی پریس کان پور سے شائع ہوا۔ صفحات کی تعدا ۲۳۲ ہے۔

طریق الرشاد فی تحقیق جواز اقامۃ الجمعہ والاعیاد فی ہذہ البلاد

تعارف: ''طریق الرشاد فی تحقیق جواز اقامۃ الجمعۃ والاعیاد فی ہذہ البلاد'' ساٹھ صفحات پر مشتمل مختصر ایک رسالہ ہے۔ مصنف مولانا عبیداللہ عبیدی ہیں۔ اس کتاب کا موضوع یہ ہے کہ ہندوستان میں جمعہ اور عید کی نماز پڑھنا جائز ہے کہ نہیں؟ انیسویں صدی میں حاجی شریعت اللہ اور ان کے تابعین کا یہ کہنا تھا کہ جب تک ہندوستان میں انگریزی کی عملداری ہے اس وقت تک یہ ملک دار الحرب ہے۔ ایسے ملک اور ان حالات کے تحت جمعہ اور عید کی نماز پڑھنا جائز نہیں لیکن مولانا کرامت علی کا خیال تھا کہ جمعہ اور عید کی نماز پڑھنا ہر حال میں ہر مسلمان کے لئے فرض ہے۔ ان دونوں کے عقائد کے لوگوں میں اس مسئلہ پر بہت بحث وتنازعہ ہوا کرتا تھا۔

تاریخی اہمیت: اس رسالہ کے مطالعے سے ہندوستان میں وقوع مذہبی تنازعات کے بارے میں آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ مولانا عبیدی جب ہوگلی سے ڈھاکہ مدرسہ کے سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے آئے تو یہاں کے مذہبی حالات کو دیکھتے ہوئے انہوں نے یہ رسالہ تحریر کیا تھا۔ کہتے ہیں:۔

''جب خاکسار مدرسہ محسنیہ شہر ڈھاکہ کا مقرر ہو کر آیا یہاں کے مسلمانوں میں خصوصاً ساکنان دیہات و اطراف شہر ڈھاکہ و بریسال و اضلاع مابین مریدان جناب مولوی کرامت علی جونپوری مرحوم اور درمیان اتباع حاجی شریعت اللہ و حاجی محسن عرف دودو میاں کے در خصوص جواز نماز جمعہ کی اس مسلک میں اور در خصوص شرائط صحت ادائے جمعہ کے بڑا جھگڑا دیکھا۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہیں۔ ایسے زمانہ پر آشوب میں کہ مسلمانوں کی ہر طرح کی ذلت وتنزل ہے مسلمان یہاں اس مسئلہ جھگڑے ہوئے ہیں اور اس قدر باہم جھگڑتے ہیں کہ نوبت خون ریزی کی اور مرافعہ عدالت کی ہوتی ہے۔

مگر غور سے تو یہ دونوں فرقے راہ افراط وتفریط کی چلتے ہیں۔ کیونکہ ایک فرقہ مطلقا اس ملک میں نماز جمعہ جو شعائر اسلام میں سے ہے جائز نہیں رکھتے اور دوسرے فرقے والے صحت ادائے جمعہ کی شرائط کی طرف جو مطابق مذہب حنفی کے ضروری ہے بالکل خیال نہیں کرتے اور کشتی پر نماز جمعہ پڑھنا جائز رکھتے ہیں۔ چونکہ اس مسئلہ خاص میں اکثر دونوں طرف کے لوگ فتوی اپنے مطلب کے موافق لایا کرتے ہیں۔ اور فقیر سے ان کی تصحیح وتسجیل کی کیا کرتے ہیں۔ اس لئے میں مناسب سمجھا کہ قطع منازعت طرفین ایک رسالہ اس مسئلے کی تحقیق میں لکھوں جس سے یہ جھگڑا چک جائے۔''

اس رسالے کے مطالعے سے عبید اللہ کی سماجی محبت خصوصا مسلمانوں کے لئے ان کے دل میں جو ہمدردی وفلاح کے جذبات تھے ان کی عکاسی ہوئی ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی کسی حرکت سے ان میں پھوٹ اور تفرقہ پیدا ہو اور وہ آپس میں خون ریزی کریں بلکہ وہ چاہتے تھے کہ ان میں بھائی چارہ اور یگانگت کے جذبات برقرار رہیں۔

زبان و اسلوب بیان: طریق الرشاد فی تحقیق جواز اقامۃ الجمعۃ و الاعیاد فی ہذہ البلاد، میڈیکل پریس آگرہ سے ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں چھپا۔

نصرۃ المسلمین فی الرد علی غیر المقلدین

تعارف: ''نصرۃ المسلمین فی الرد علی غیر المقلدین'' معروف بہ قرع الضالین۔ ۴۰ صفحات پر مشتمل ایک رسالہ ہے۔ لکھنے والے عبد الغفور نساخ ہیں۔ رسالے کا موضوع سخن مذہبی مسائل ہیں۔

تاریخی اہمیت: اس رسالے کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انیسویں صدی میں مسائل فقہ

میں ''تقلید'' کی مخالفت اور موافقت کرنے والے بنگلہ دیش میں موجود تھے۔ اور اجتہاد اور تقلید کا سوال یہاں کے عوام میں متنازع فیہ مسئلہ تھا۔ نساخ نے اہل سنت کے عقیدہ اجتہاد کو بر حق ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔

نساخ مذہب اسلام میں حنفی مسلک پر پورا اعتقاد رکھتے تھے اور تقلید وقیاس کی مخالفت کرنے والے وہابیوں پر کڑی نکتہ چینی کرتے تھے۔ اس نکتہ چینی کے لئے انہوں نے رباعیات کا سہارا لیا۔ جن کی تعداد ۷۶ ہے۔ یہ سب باعتبار حروف تہجی ہیں۔ یہ رباعیات انہوں نے مومن خان مومن کی ان رباعیوں کے جواب میں لکھیں جن میں انہوں نے تقلید وقیاس پر کڑی تنقید کی ہے۔

در اصل نصرۃ المسلمین صرف مومن کے مسلک اور عقیدہ ہی کی تردید میں نہیں بلکہ اس عقیدے کی تحریک کی رد میں بھی ہے۔ جو نساخ نے عہد میں زوروں پر تھی۔ سید احمد بریلوی اور تحریک ولی الہی کو ہی وہابیت سے تعبیر کیا جانے لگا تھا۔ کیونکہ اس تحریک نے مسلمانوں سے شرک و بدعت کو دور کرنے کی جدوجہد کی تھی۔ لیکن ہندوستان کے طول وعرض میں اکثریت حنفی مسلک کے افراد کی تھی۔ نتیجہ کے طور پر عقائد کے اعتبار سے مسلمانوں کے دو گروہ ہو گئے اور دونوں گروہوں کے افراد اپنے اپنے مسلک کو درست اور صحیح سمجھنے لگے۔ اس طرح عقائد میں شدت اور غلو پیدا ہو گیا۔ سیاسی طور پر انگریز بھی سید احمد بریلوی کی تحریک کو کچلنے کے بعد اس کے مکمل استیصال کے لئے ہوا دینے لگے بالخصوص نواب عبد اللطیف نے تو اس تحریک کے خلاف فتاوی بھی حاصل کر کے جاری کرائے تھے۔ عبد الغفور نساخ انہیں کے بھائی تھے اور یہ بھی انگریزوں کے غم خوار تھے۔ پھر انہیں اپنے مسلک سے محبت بھی تھی اور تحریک ولی الہی جسے عرف عام وہابی تحریک کہتے تھے سخت عداوت تھی۔ چنانچہ ان کی رباعیات یا یہ رسالہ نصرۃ المسلمین اسی عداوت کا انعکاس ہے۔[۳۳]

زبان واسلوب بیان: ''نصرۃ المسلمیں'' اردو زبان میں تحریر کردہ رسالہ ہے لیکن رباعیوں میں قرآن وحدیث کا جگہ جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ پھر رباعیوں کی توضیح بھی قرآن وحدیث کی مدد کی گئی ہے۔ رباعیات کی زبان سخت ہے اور لہجہ بھی شدید ہے۔ اکثر اوقات نساخ متانت وسنجیدگی کا دامن چھوڑ بیٹھتے ہیں اور سخت سست کہنے سے بھی نہیں چوکتے۔[۳۴]

اشاعت: ''نصرۃ المسلمیں'' ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء میں مطبوعہ حامی الاسلام دہلی میں طبع ہوا۔

تحفۃ المحسنین

''تحفۃ المحسنین'' کے شاعر الہ بخش مجموعہ دار سلہٹی ہیں۔ اس مختصر سے شعری مجموعہ میں صفحات کی تعداد ۴۸ ہے جن میں مذہبی مائل زیر بحث ہیں۔

تاریخی اہمیت: اس شعری مجموعہ سے انیسویں صدی بنگلہ دیش کے ان مسائل کا پتہ چلتا ہے جن کا تعلق ہمارے مذہب اور سماج سے خوب گہرا تھا۔ جن سے واقفیت حاصل کرنا بھی لازم تھا اور جن کا حصول بھی لازمی تھا۔ جن کے بغیر ایک انسان اچھا مسلمان اور کامل شخص نہیں بن سکتا۔

کتابچے کی ابتداء خدا تعالی کی حمد وتوصیف اور نعت سید کائنات علیہ السلوۃ سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد سبب تالیف رسالہ کا بیان ہے۔ بعد ازاں مذہبی عقائد کا ذکر کرتے ہوئے عقائد ایمان اور دل وزبان سے ان کا اقرار، توحید، تاکید نماز پنجگانہ بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد پند ونصیحت کرتے ہوئے نفاق ودیگر بدعات سے اجتناب کی تاکید ہے۔ پھر کبائر وصغائر

گناہ اور شرک وکفر سے بچنا اور ترغیب توبہ ہے۔ پھر دل وعقل اور دیگر اعضاء جسمانی جو نعمت عظمہ ہیں کا بیان ہے۔ پھر فرق درمیان انسان وحیوان اور حقیقت فطرت انسان، نسل ونسب کی بڑائی سے امتناع، ترغیب پر اعمال خیر، خدمت والدین، حقوق خویش وہمسایہ ودوستان، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، طلب علوم نافعہ، سہ وصیت آنحضرت (ص) بوقت وفات کا ذکر ہے۔ پھر مذمت ظلم، حسد، ریا، فخر بر علم وجاہ ومال، غیبت وغیب جوئی، بخل، طمع اس کے بعد ترغیب سخاوت، قناعت وشکر، تواضع، اختیار کرنا خصائل حمیدہ کا اور صحبت بدان ومکاران وغافلان سے حذر کرنا، پھر بیان ترک حب دنیا واختیار صحبت عالمان وصاحب دلان، ومطالعہ کتب، اس کے بعد ترغیب ذکر حق تعالی وحلال کھانا اور فضول خرچی سے اجتناب، پھر بسیار خواری، ہنسی تماشا، زیادہ نیند کی ممانعت پر ترغیب اطاعت خدا وعبادت شب، ذکر خدا کے فضائل، دنیا کی بے ثباتی، پھر سلاطین وبادشاہوں کے قرب وسلام سے ممانعت کرتے ہیں۔ آخری صفحہ یعنی ۴۸ پر شجرۂ خاندان مصنف معروف بہ ''شجرہ مجموعہ داریہ سلہٹ'' رقم ہے۔

زبان واسلوب بیان: ''تحفۃ المسلمیں'' کی زبان فارسی ہے۔ جو نظمیہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ طرز بیان سہل وعام فہم ہے۔ کہ نفس مضمون تک پہنچنے میں کوئی دقت ودشواری پیش نہیں آئی۔ بطور مثال چند اشعار:

طمع عالمان را کند جو وقار — طمع مقبلا نرا کند زشت وخوار
طمع میکند مرغ را پای بند — طمع وحشیان را رساند گزند
طمع شیر دل را چو روبہ کند — طمع گردن جاہ را بشکند

اشاعت: کتابچے میں کہیں بھی مقام اشاعت وسن اشاعت کا ذکر نہیں۔

جام توحید

تعارف: ''جام توحید'' ۸ صفحات پر مشتمل ایک مختصر قصیدہ درمنقبت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی ہے۔شاعر مولانا عبدالرشید شہزادپوری پٹنوی ہیں۔

احوال شاعر: مولانا عبدالرشید شہزادپوری پٹنہ ضلع میں شہزادپور کے رہنے والے تھے۔انہوں نے راجشاہی مدرسہ سے تعلیم حاصل کی۔ وہ ڈھاکہ کالج میں فارسی وعربی کے استاد تھے۔ انہوں نے راجشاہی مدرسہ میں بھی درس وتدریس کے فراءانجام دیئے۔اور کلکتہ مدرسہ میں بھی یہ فرض انجام دیتے تھے۔عبدالرشید عربی وفارسی واردو تینوں زبانوں میں اچھا دخل رکھتے تھے۔شعروشاعری میں ان کا پسندیدہ موضوع قصیدہ نگاری تھا۔[۳۵]

تاریخی اہمیت: یہ ایک مختصر سا مدحیہ قصیدہ ہے۔جس میں شیخ محی الدین عبدالقادر کی صفات کا بیان ہے۔

زبان واسلوب بیان: قصیدہ فارسی زبان میں لکھا گیا ہے۔جس میں انہوں نے قصیدے کی شان کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔انداز بیان شاندار اور پرزور ہے۔اس قصیدے کو کسی بھی معیاری قصیدے کے سامنے پیش کیا سکتا ہے۔بطور مثال یہ چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں:

سپیدہ دم کہ دریں خاکدان ظلمانی   دمید صبح سعادت کشادہ پیشانی
وزید برسر گلشن نسیم نوروزی   رسید برسرسوسن کلام نعمانی
بہار عام جہاں راز اعتدال مزاج   بہار خاص مزاج اہتزاز روحانی۔ [۳۶]

اشاعت: یہ قصیدہ ستارہ ہند پریس لمیٹڈ کلکتہ سے چھپا۔مگر سن اشاعت کا پتہ نہیں چلتا۔

تحفۂ مجددیہ

تعارف: ''تحفۂ مجددیہ'' سات صفحات پر مشتمل ایک قصیدہ ہے۔شاعر مولانا سید الرشید شہزادپوری پٹنوی المتخلص بہ رشیدیؔ ہیں۔

تاریخی اہمیت: ''تحفۂ مجددیہ'' کی تاریخی اہمیت اس قدر ہے کہ اس میں حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندی ملقب بہ امام ربانی مجدالف ثانی رح کی تعریف وتوصیف ہے۔

زبان واسلوب بیان: قصیدہ فارسی زبان میں ہے۔یہ قصیدہ نگاری کی پوری شان برقرار رکھے ہوئے ہے۔زبان پرشکوہ وشاندار ہے۔اور پڑھتے ہوئے خوب لطف محسوس ہوتا ہے۔ جیسے

سحرگا ہاں کہ گشتم مست جام قدس رضوانی
شنیدم آیت تطہیر ازمزعان روحانی۔
پرطاوس شدگیتی کہ بودھ ظلمت آبادی
یدید آمد بجائے زاغ طائس گلستانی ۔[۳۷]

اشاعت: یہ قصیدہ ستارۂ ہند واقع کلکتہ سے ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء میں شائع ہوا۔

مکاشفات رحمت

تعارف: '' مکاشفات رحمت'' میں موضوع زیر بحث مذہبی اور سماجی مسائل ہیں۔مصنف مولانا کرامت علی جونپوری ہیں۔ ''مکاشفات رحمت'' دس نصیحتوں پر مشتمل ایک کتابچہ ہے۔جس میں صفحات کی تعداد ۳۲ ہے۔

حالاتِ مصنف: مولانا کرامت علی جونپوری کا اصل نام علی تھا۔مگر بہ کثرت کرامتوں کے صدور ہونے کی وجہ سے لفظ ''کرامت'' آپ کے نام کا جزو بن گیا۔آپ کی ولادت ۱۲۱۵ ھ/ ۱۸۰۰ء میں محلّہ ملاٹولہ شہر جونپور میں ہوئی۔

قرآن وحدیث کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۸ برس کی عمر میں سید احمد شہید سے ملاقات کی عرض سے رائے بریلی پہنچے۔تیسرے ہفتہ وطن واپس آنے کے بعد آپ نے اپنے سماج میں تبلیغ وہدایت خلق کا سلسلہ اور تیز کردیا۔آپ نے پانچوں وقت اذان وجماعت کا انتظام کیا۔ اس کے بعد سید احمد شہید کے حکم پر بنگال کی جانب روانہ ہوئے کیونکہ اس وقت بنگال کی دینی حالت بے حد ابتر ہو چکی تھی۔آپ نے یہاں کے مسلمانوں کو اسلام کی صحیح روح سے روشناس کرایا اور اکاون (۵۱) برس سے زائد صرف بنگال کے دورہ میں مصروف رہے۔اس بارے میں مولانا یوں فرماتے ہیں:۔

> ''فقیر کا تو یہ حال ہے کہ ہندوستان سے کلکتہ اور چاٹگام اور سندیب تک اور ڈھاکہ سے سلہٹ تک سارے شہر اور گاؤں میں جو دیار شرقی میں ہیں ہمیشہ سیر کرتا اور دین کی محافظت کرتا پھرتا ہے۔اس کام میں پچاس برس سے زیادہ مدت گزرگئی۔''[۳۸]

مولانا کی تصانیف کی تعداد بیالیس ہیں۔جن کا موضوع اسلامی عقائد اور ردشرک وبدعت ہیں۔آپ نے زندگی کا زیادہ حصہ بنگلہ دیش میں گزرا اور آپ یہیں کے ہوکر رہ گئے۔آپ کا انتقال ۱۸۷۳ء میں بنگلہ دیش میں شہر رنگپور میں ہوا۔اور رنگپور جامع مسجد میں آپ کا مزار ہے۔

تاریخی اہمیت: انیسویں صدی میں بنگال کی دینی حالت انتہا درجہ تک بگڑ گئی تھی۔صوم وصلوۃ

کی پابندی سے لوگ آزاد ہو چکے تھے۔ دین سے لگاؤ مفقود تھا۔علوم دین سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا خلاف شرع بیرون کی حکومت کے عوام کے دلوں پر تھی۔وہی ان کے حاجت روا سمجھے جاتے تھے۔تقریب وتہوار میں ہندوانہ رسم بجالاتے تھے۔بے پردگی عام تھی۔محرمات اور غیر محرمات میں کوئی امتیاز باقی نہ تھا۔ستر عورت کا ڈھانکنا اور لباس کی کوئی پابندی نہ تھی۔ مولانا کرامت علی نے معاشرے کی ان برائیوں کو قطع کرنے کی ٹھانی اور صحیح معنوں میں ایک مسلم معاشرہ تشکیل کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔اس مقصد کے پیش نظر انہوں عوام کے سامنے دس نصیحتیں پیش کیں۔ان نصیحتوں کے ضمن میں اس معاشرے کی تصویر کشی ہو جاتی ہے۔ جب بنگال کے مسلمان بدعت واور کفر کی رسموں اور بتوں کے بنانے اور پوجنے اور ناچ باجی، ڈھولک تنبورے وغیرہ خلاف شرع کام میں گرفتار ہوئے اور مسلمان ہوکر ہندوؤں کے تہوار ہولی دیوالی بسنت وغیرہ میں خوشیاں کرتے۔[۳۹]

اور بعض نادانوں ، گمراہوں نے راہبوں اور جوگیوں اور گوشائیوں کی چال کو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی چال اور حکم سے زیادہ پسند کرکے اور اس کو درویشی سمجھ کے نکاح کرنے کو ترک کیا۔[۴۰]

نماز، روزے، حج، زکوۃ، قربانی، صدقہ، فطر کی ادائیگی، جمعہ، جماعت اور عیدین کے نماز کو مطلق چھوڑ دیا۔مسلمان ہوکر داڑھی منڈواتے تھے۔بیوہ عورت کا نکاح ثانی کرنا عیب تھا۔ عورتوں کو پردے کا لحاظ نہ تھا۔

انیسویں صدی میں بنگال میں فرائضی تحریک کے زیر اثر مسلمان میں پیر ومرشد ماننے کا رواج مفقود ہو گیا۔مگر مولانا کرامت علی جونپوری نے تزکیہ نفس کے لئے مرشد کی اہمیت کو دلائل کی

روشنی میں واضح کیا۔ اور سید احمد صاحب کو انیسویں صدی کا مرشد قرار دیا۔ کیونکہ سید احمد صاحب نے مذہبی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور منکرات کے رد کے واسطے حدیث، قرآن، فقہ، عقائد اور تصوف کی دلیلیں ظاہر کیں اور شرک، بدعت اور منکرات مٹنے لگے۔ سید احمد صاحب کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ وہابی تھے ان کے بارے میں اس نظریے کی تردید کی۔ کہتے ہیں:۔

> ''یہ ان کی نری جہالت تھی۔ کیونکہ سید صاحب کے گروہ کے علماء میں صحاح ستہ اور تفسیر اور حنفی مذہب کے عقائد اور فقہ اور اصول فقہ کا درس وتدریس دن رات جاری ہے۔ ان ہی علماء نے صحاح ستہ اور اہل سنت کے مذہب کی تفسیروں اور عقائد اور فقہ کی کتابوں کا متن اور ترجمہ چھپوایا اور قرآن مجید اور حدیث شریف کی کتابوں اور فقہ کی کتابوں اور تصوف کی کتابوں کا ترجمہ بھی ان ہی علماء نے کیا ..... سو یہ سب نشانی تو اہل اللہ اور محمدی اور صوفی اور حنفی کی معلوم ہوتی ہے۔ معلوم نہیں کہ ان باتوں میں وہابی ہونے کی کون سی نشانی ہے۔ [۴۱]

زبان واسلوب بیان: کتاب کی زبان اردو بے حد سہل اور عام فہم ہے۔ جو نہایت سریع الفہم و سہل ہے۔ عربی الفاظ کی بھرمار نہیں۔

اشاعت: مولانا کرامت علی نے اپنی چند کتابوں کو ذخیرہ کرامت اول کے نام سے یکجا کر کے شائع کرایا۔ مکاشفات رحمت بھی ذخیرہ کرامت اول میں شامل ہے۔ جو مطبع محمدی کان پور سے ۱۸۴۴ھ/ ۱۹۲۴ء میں طبع ہوئی ۔

تزکیۃ العقائد

تعارف: ''تزکیۃ العقائد'' کا موضوع مذہبی مسائل ہیں۔ ان مذہبی مسائل کے ضمن میں انیسویں صدی کے سماجی مسائل بھی موضوع سخن ہو گئے ہیں۔

تاریخی اہمیت: اس کتاب کے مطالعے سے انیسویں صدی میں مختلف مذہبی فرقوں اور مذہبی تحریکوں کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا کرامت علی طریقۂ محمدیہ پر یقین رکھتے تھے ان کے خیال میں خارجی فرقہ اور لا مذہب لوگ مسلمانوں کے مذہبی خیالات میں وسوسے پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مثلاً تارک الصلوۃ کے جنازے کی نماز کو منع کرنا، جنگل اور گاؤں میں اپنی عقل کے موافق قرآن شریف کے معنے کہنا۔ جمعہ اور عیدین کی نماز کا منع کرنا، مکہ معظّمہ میں جا کے اپنے مذہب وعقیدے سے توبہ کرنا اور پھر اپنے ملک آ کے اس توبہ سے پھر جانا، مکہ معظّمہ میں جو توبہ کیا سینکڑوں حاجی جس کے گواہ تھے۔ اس توبہ کرنے کا لوگوں سے انکار کرنا اور عوام سے قسم کھا کے کہنا کہ تم لوگ جمعہ کی نماز نہ پڑھو اگر جمعہ کی نماز ترک کرنے میں کچھ گناہ ہوگا تو ہمارے کندھے پر ہے۔ اس طرح کے باطل خیالات بنگال کے عوام میں شائع کر رہے تھے۔ مولانا کرامت نے ان نظریات پر کڑی تنقید کی اور عوام کو سنی اور حنفی عقائد سے روشناش کرایا۔

زبان واسلوب بیان: تزکیہ العقائد بزبان اردو لکھی گئی ہے۔ انداز بیان سیدھا سادہ ہے۔ پڑھنے والے کو اصل موضوع سمجھنے میں دشوار پیش نہیں آتی۔

اشاعت: ''تزکیۃ العقائد'' ذخیرہ کرامت اول کے مجموعے میں داخل ہے۔ جو ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۴ء میں مطبع محمدی کان پور سے شائع ہوئی تھی۔

حجت قاطعہ

تعارف:'' حجت قاطعہ'' میں چند شرعی اور اسلامی مسائل زیر بحث ہیں۔ جو مولانا کرامت علی اور فرائضی لیڈر حاجی شریعت اللہ، ان کے بیٹے دودو میاں اور بریسال میں فرائضی خلیفہ مولوی عبدالجبار کے درمیان تنازعہ اور بحث کا موضوع تھا۔

تاریخی اہمیت:'' حجت قاطعہ'' کے مطالعے سے بنگال میں مولانا کرامت علی کی فرائضیوں کے خلاف طویل جدوجہد کا پتہ چلتا ہے۔ ۱۲۵۲ھ/ ۱۸۳۷ء میں کلکتہ میں فرائضیوں جنہیں مولانا کرامت علی نے خارجی کہا ہے ان کے رہنما حاجی شریعت اللہ سے محلّہ ملنگ میں گول پتے کی مسند میں مولانا کرامت کے ساتھ مذہبی مسائل پر مباحثہ ہوا۔ پھر بریسال میں حاجی شریعت کے بیٹے دودو میاں کے ساتھ قاضی شفیع الدین کے مکان میں ہندوستان میں جمعہ کی نماز پڑھنا جائز یا ناجائز کے مسئلے پر مباحثہ ہوا۔ اس کے بعد فرائضی رہنما عبدالجبار کے ساتھ جھالوکاٹی ، مداری پور اس کے بعد بایزید پور میں نمازی کو کافر کہنا جیسے مسائل پر گفتگو کرنا طے پایا لیکن عبدالجبار نے ہر موقع پر راہ فرار اختیار کی۔

اساڑھ کی انیسویں تاریخ روز یکشنبہ ۱۲۷۲ بنگلہ (ماہ صفر روز یکشنبہ ۱۲۸۲ ہجری) میں بریسال کے مقام پر مولانا کرامت علی اور مولوی عبدالجبار کے درمیان شاہ صاحبوں کی مسجد میں گفت و شنید ہوئی۔

جن مسئلوں پر آپس میں اختلاف تھا وہ چھ تھے۔ مثلاً (۱) جو شخص کلمہ گو ہے اور نماز و دیگر اعمال ادا نہیں کرتا اس پر جنازے کی نماز پڑھی جائے یا نہیں ۔(۲) پیر کے ہاتھ بیعت کرنا درست ہے کہ نہیں ۔(۳) بچہ پیدا ہونے پر اس کی ناڑ کاٹنا ماں باپ پر واجب ہے یا دائی اس فرض کو ادا کر سکتی ہے۔ (۴)۔ اس ملک میں جب کہ صاحبان انگریز کی عمل داری اور

حکومت ہے جمعہ اور عیدین کی نماز پڑھنا واجب کہ ہے نہیں۔ (۵)۔ ٹڈی اور بھنگا کھانا جائز ہے یا ناجائز (۶)۔ جمعہ ہونے کی شرط جو مصر میں ہے وہ کہاں تک صحیح ہے۔

مولوی عبدالجبار نے مناظرے میں مولوی کرامت علی کے ساتھ سب باتیں میں حاجی بہری ۔مگر بعد میں ان باتوں پر قرار نہ رہ سکے۔ مولانا کرامت علی کا فرائضوں کے ساتھ ان مذکورہ باتوں پر حاجی شریعت اللہ، دودو میاں اور عبدالجبار کے ساتھ مناظرہ کے متعلق مولانا کرامت علی فرماتے ہیں:

> '' اس فقیر نے خارجیوں کے سردار حاجی شریعت اللہ اور اس کے بیٹے دودو میاں کو ان سب مذکورہ باتوں کو کسی دینی کتاب سے دکھانے کے واسطے سخت پکڑا سو کبھی دکھا نہ سکے۔ آخر کو اس گروہ کے ایک خلیفہ مولوی عبدالجبار نام کو بھی اس خاکسار نے جھالوکاٹھی میں ان ہی سب مذکورہ باتوں کو کسی دینی کتاب سے دکھانے کے واسطے سخت پکڑا تھا۔ سو وہ بھی دکھا نہ سکا۔ اور چند روز کے واسطے اپنی جان بچانے کو یہ کید اور مکر نکالا کہ تم بھی ان مذکورہ باتوں کے رد کا فتوی لکھو اور ہم بھی ان مذکورہ باتوں کے اثبات کا فتوی لکھیں اور مکہ معظّمہ میں دونوں فتوی بھیجے جائیں۔ لیکن ان دونوں فرقوں میں ان مسائل کے بارے میں اتفاق رائے نہ ہوسکا۔ اور یہ تنازعہ یوں چلتا رہا۔[۴۴]

زبان و بیان: حجت قاطعہ اردو زبان میں تحریر کردہ ہے، انداز بیان سلیس اور عام فہم ہے۔

اشاعت: ''حجت قاطعہ'' ذخیرہ کرامت اول میں شامل ہے۔ اور مطبع محمدی کانپور سے ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۴ء میں طبع ہوائی۔

مقامع المبتدعین

تعارف: ''مقامع المبتدعین'' کا موضوع مذہبی مسائل ہیں۔ چٹا گانگ کے مولانا مخلص الرحمٰن نے سات سوالنامے جن کا تعلق حنفی مذہب کے مذہبی عقائد سے تھا۔ لکھ کر مولانا کرامت علی کی خدمت میں روانہ کئے۔ سوالات کی زبان فارسی تھی جن کا جواب مولانا کرامت علی اردو میں دیا۔ ''مقامع المبتدعین'' میں ان ہی سوالات اوران کے جوابات ہیں اس رسالے میں صفحات کی تعداد ۲۵ ہیں۔

تاریخی اہمیت: رسالے کے مطالعے سے مذہبی مسائل جو بنگال میں باعث تنازعہ ہوا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں آگاہی ہوتی ہے۔ اوران کی تاریخ مرتب کرنے میں مدد ملتی ہے۔

پہلا سوال: بارہ سو برس سے زیادہ عرصہ گذارا ہے کہ قرآن نازل ہوا اور حدیث وارد ہوئی اور مسلمانی ظہور میں آئی پس اس اخیر صدی میں باوجودیکہ امامت واجتہاد کا زمانہ موقوف ہوگیا اور مذہب سنت و جماعت کے حق ہونے پر اجماع منعقد ہوا اور چار اماموں سے ایک امام کی تقلید واجب ہوئی پھر شرک وتوحید کے عقیدوں میں اختلاف ہونے کی اور عملوں کے حلال و حرام ہونے کی کیا وجہ ہے؟ مگر کوئی ٹکڑا قرآن کا آسمان پر باقی رہ گیا تھا جو اخیر صدی میں نازل ہوا مگر معلوم نہیں کہ وہ پارہ قرآن کس شخص پر اترا؟

اس کے جواب میں مولانا کرامت علی نے فرمایا کہ موقوف ہوجانا دور امامت مجتہدین اربعہ کا ہوسکتا ہے۔ مگر دور مجتہد کے ختم ہونے کا جمہور اہل سنت و جماعت کا اعتقاد نہیں۔ باقی یہ بات کہ ایک ٹکڑے کا آسمان پر باقی رہنا اوراس صدی میں نزول کرنا تو اس کا جواب مولانا کرامت علی نے دیا کہ سوال کرنے والے نے قرآن شریف کو ناتمام سمجھا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبی نہ اعتقاد کیا اسی سبب سے انہون نے مزید نبی کی تلاش کی اگر از رہ مذاق سوال کیا تو تب بھی ان کے مسلمان ہونے پر شبہ ہے۔

دوسرا سوال: دوسرے سوال کے تعلق رسمی فاتحہ سے ہے کہ وہ حرام ہے یا حلال؟ اس سوال کے جواب میں مولانا کرامت علی نے فرمایا کہ اس بات پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ مردوں کے واسطے زندوں کے دعا کرنے میں اوران کے صدقہ کرنے میں مردوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اگر چہ حدیث سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی مگر جو رسم عوام میں مروج ہے وہ اللہ کے نزدیک بھی قابل قبول ہوتی ہے۔

تیسرا سوال: طریقہ احمدیہ جو سید احمد، مولوی اسمٰعیل اور مولوی عبدالحی ہے کیا وہ حق ہے یا باطل۔ اگر حق ہے تو اس فرقہ کو مکہ معظّمہ سے نکال دینے کا کیا سبب تھا ان کو قید وسزا کیوں دی گئی۔ اگر ان کا طریقہ باطل ہے تو ان کا اقتدا کرنا صحیح ہوگا یا نہیں؟

اس کے جواب میں مولانا کرامت علی نے فرمایا اسلام میں طریقہ نکالنا قیامت تک جاری رہے گا۔ اس لئے سید احمد کا طریقہ احمدیہ حق اور درست ہے۔ مکہ معظّمہ سے وہابی فرقے کے لوگ نکالے گئے تھے۔ مولوی اسمٰعیل کو مکہ معظّمہ سے نکالنے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔

چوتھا سوال: مکہ معظّمہ کے بادشاہ اور وہاں کے عالموں نے اس نئے فرقے کا نام وہابیہ رکھا ہے نہیں؟

اس جواب مولانا کرامت علی نے یوں دیا کہ لا مذہبوں کو مکہ معظّمہ کے لوگ وہابی کہتے ہیں ان لوگوں کو مذہب سے انکار کی وجہ نکال دیا۔ لیکن بہت سے عربوں نے سید احمد کے ہاتھ بیعت کی۔

پانچواں سوال: مولوی اسمٰعیل اوران کے گروہ کی تمام تصنیفی کتابیں مثلاً تقویۃ الایمان، تنویر العینین، صراط مستقیم، مسائل الاربعین، مائۃ مسائل جو کہ اہل سنت و جماعت کے علم کلام وفقہ و تصوف کے باطل کرنے کو تصنیف ہوئی ہیں۔

وہ سب حق ہیں یا باطل؟ اس صورت میں کہ وہ حق ہیں تو امت محمدی زمانۂ نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اس فرقہ کے ظاہر ہونے تک کافر ہی ہوگی کیونکہ تمام اہل سنت و جماعت کو انبیاء اوراولیاء کے علم غیب تصرف کا اعتقاد تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس باب میں

اپنے مذہب کے موافق بہت سی کتابیں تصنیف کیں اور وہ کتابیں ان کے یہاں ہاتھوں ہاتھ مروج ہوئی آئیں۔

اس سوال کے جواب میں مولانا کرامت علی نے فرمایا کہ اہل سنت و جماعت کے لوگوں کا ہمیشہ سے یہ اعتقاد رہا ہے کہ علم غیب صرف خدا تعالیٰ کی ذات کے واسطے ہے۔ نہ فرشتوں، نبیوں اور ولیوں کے واسطے۔ بعض اولیاء لوگ جو غیب کی خبر دیتے ہیں اسے کشف یا الہام کہتے ہیں۔ اس کا نام غیب دانی نہیں۔

چھٹا سوال: مولوی اسمٰعیل، مولوی عبدالحی اور ان کے تابعین حق پر تھے یا باطل؟

جواب: مولانا اسمٰعیل اور مولانا عبدالحی صاحب بڑے دین دار اور تابع سنت تھے۔ ظاہر و باطن کے علوم میں پکے کامل تھے۔ لوگوں کو توحید اور سنت کی راہ بتلاتے تھے۔ شرک اور بدعت کی برائی سناتے تھے۔ سارے ہندوستان اور بنگال میں اسلام جو ضعیف ہو گیا تھا ان ہی بزرگوں کی کوشش سے قوی و تازہ ہو گیا۔ گھر گھر لوگ نمازی بن گئے۔ لوگ شرک و بدعت کو چھوڑ کر دین دار متقی ہو گئے۔ ان بزرگوں کے قول و افعال سے کوئی امر خلاف شرع کا ثابت نہیں ہوا اگر بلفرض ثابت بھی ہو تو وہ بھول چوک سے ہوگا اور بھول چوک سے سوائے پیغمبروں کے کوئی محفوظ نہیں۔

ساتواں سوال: جبکہ تعظیم کرنا اور بزرگ جاننا انبیاء اور اولیاء کا اس فرقہ کے مذہب میں شرک ٹھہرا تو کیوں سید احمد کے قتل ہونے کے بعد اس فرقہ کے لوگوں نے بکری کی کھال میں بھس بھر کر ان کی صورت بنائی تھی۔ اس صورت پرستی میں لوگوں نے بہت روپے کمائے پس یہ صورت پرستی ان کی شرع میں درست ہے یا نہیں؟

اس جواب میں مولانا کرامت علی نے فرمایا کہ اس سوال کا جواب صورت پرستی کرنے والوں سے پوچھنا چاہئے نہ کہ ان سے۔

مندرجہ بالا سے چلتا ہے کہ انیسویں صدی میں بنگال میں مذہبی معاملات میں کافی اختلاف

رائے تھا۔ اور مذہبی مسئلوں پر تنازعات وقوع پذیر ہوتے رہتے تھے۔

زبان و اسلوب بیان: ''مقامع المبتدعین''، مخلص الرحمٰن نے مولانا کرامت سے جو سوال کئے تھے وہ سب فارسی زبان میں ہیں۔ اس کتاب میں مولانا کرامت علی نے سولات کا اردو میں ترجمہ کر کے جواب بھی اردو میں تحریر کئے۔ کتاب کی زبان سہل، آسان اور عام فہم ہے۔

اشاعت: ''مقامع المبتدعین'' ذخیرہ کرامت اول کے تحت مطبع محمدی کانپور سے ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۴ء میں چھپی۔

قول الامین

''قول الامین'' کے مصنف بھی مولانا کرامت علی ہیں۔ اس مختصر رسالے میں صفحات کی تعداد ۵ ہے۔ اور موضوع سخن مذہبی مسائل ہیں۔

تاریخی اہمیت: اس رسالے کے مطالعے سے دودو میاں کے گروہ یعنی فرائضی فرقے پر مولانا کرامت علی کی کڑی تنقید کا پتہ چلتا ہے یہاں تک کہ انہوں نے فرائضیوں کے بارے میں لکھا ہے۔: '' ان لوگوں کا حال مرغی کے گندے بیضے کا ایسا کہ جیسے جس بیضہ کو جب ایک مرغی نے گندہ کیا تب پھر اس کو اگر تمام جہان کے مرغی سیویے تو اس سے بچہ نہیں نکلتا ویسے ہی یہ لوگ جو بگڑے سو بگڑے ہی رہتے ہیں۔''

فرائضی فرقہ کا فقہ کے ماننے سے انکار کرنا اور چاروں اماموں کا بیک وقت پیروی کرنا اور اس سلسلہ میں یہ کہنا '' کہ جب چاروں امام برحق ہیں تو ایک ہی امام کے مذہب پر جانا اللہ تعالیٰ کی کشادہ رحمت کو تنگ کرنا ہے۔''[۴۳]

اور ہندوستان کو دارالامان کی جگہ دارالحرب قرار دینا جیسے خیالات پر نکتہ چینی کی ہے۔

زبان و اسلوب بیان: ''قول الامین'' بھی اردو زبان کا رسالہ ہے۔ حسب معمول یہ بھی آسان اور سہل زبان میں لکھا گیا ہے۔

اشاعت: ''قول الامین'' مولانا کرامت علی کی چند دوسری کتابوں کے دوسرے مجموعے ذخیرہ ''کرامت دوم'' میں شامل ہیں۔ اور یہ رسالہ مطبع مجیدی کانپور سے ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۹ء میں چھپا۔

مرأة الحق

تعارف: ''مرأة الحق'' کے مصنف مولانا کرامت علی ہیں۔ یہ مختصر سا رسالہ جس میں صفحات کی تعداد ۲۱ ہے۔ موضوع سماجی و مذہبی مسائل ہیں۔

احوال مصنف: گذشتہ صفحات میں بیان ہو چکے ہیں۔

تاریخی اہمیت: رسالہ ''مرأة الحق'' سے انیسویں صدی کے بنگلہ دیش کی سماجی و مذہبی کیفیات کی عکاسی ہوتی ہے۔ جب یہاں کے مسلمانوں نے بدعتی لوگوں کی راہ پکڑی اور قبروں پر چراغ روشن کرنا رسمی فاتحہ کرنا، محرم میں سبز یا سیاہ کپڑا پہنا اور کفار کے تہوار میں شریک ہونا اور ان کے میلوں میں کا کر خوشیاں منانا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا میلاد شریف پڑھاتے ہوئے یہ عقیدہ کہ ان کی روح پاک بھی ان محفلوں میں آ کر شریک ہوتی ہے۔ جیسے خیالات مسلم سماج میں آ کر داخل ہو گئے تھے۔ مولانا کرامت نے ان بدعتوں کے خلاف آواز اٹھائی اور مسلمانوں کو اسلام کی سچی روح سے روشناس کرانے کی کوشش کی۔

زبان واسلوب بیان: ''مرأة الحق'' کی زبان بھی مولانا کرامت علی دیگر کتابوں کی مانند اردو زبان میں لکھی گئی۔ اور انداز بیان بھی حسب معمول سریع الفہم ہے۔ عالمانہ اور عربی آمیز نہیں تا کہ عوام پڑھ کر بآسانی سمجھ سکیں اور عمل پیرا ہو سکیں۔

اشاعت ؛ ''مرأة الحق'' ذخیرہ کرامت حصہ سوم میں شامل ہے۔ جو ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء میں امدادیہ پریس ڈھاکہ سے شائع ہوئی۔

اطمینان القلوب

تعارف: ''اطمینان القلوب'' تیس صفحات پر مشتمل ایک رسالہ ہے، رسالے کے مصنف مولانا کرات علی ہیں۔ اس رسالے میں سیاسی، سماجی و مذہبی مسائل درپیش ہیں۔

تاریخی اہمیت: کتاب کی ابتدا میں ہی بنگال کی مذہبی حالت کی طرف اشارہ ملتے ہیں جب کہ سماج لادینیت کا دور دورہ تھا۔ نماز و روزے کا احساس نہ تھا ان حالات میں سید احمد شہید نے مسلمانوں کی ہدایت کا بیڑا اٹھایا اور ان کی دینی احیاء کے فرائض انجام دیئے۔

انیسویں صدی کے بنگال میں حاجی شریعت اللہ وہابی جسے بعد میں فرائضی تحریک سے موسوم کیا جاتا ہے اس تحریک کے پرچار کرنے میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا اس فرقے کے پیروکار ایک معین امام کی تقلید اور فقہ پر عمل کرنے کی حاجت سے انکار، مولوی خوانی کی محفل کے انعقاد سے اجتناب، پیری و مریدی کو سختی سے ممنوع ٹھرانا۔ جیسے خیالات پر عمل پیرا تھے۔ مولانا کرامت نے فرائضیوں کو ان خیالات کی بنا پر کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔

حاجی شریعت اللہ انیسویں صدی کے ہندوستان کو دارالحرب کہتے تھے کیونکہ یہاں مسلمانوں کی حکومت نہیں بلکہ ایسی حکومت قائم تھی جو بقول ان کے یہاں لوگوں پر شدید مظالم کر رہی تھی اس لیے ایسے ملک میں مسلمانوں کے لئے عیدین اور جمعہ پڑھنا جائز نہیں اس فرض کے ترک کرنے سے مخالفت کی شدر میں اور اضافہ ہو گیا۔[۴۴] ان میں مولوی کرامت علی پیش پیش تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حاجی شریعت اللہ اور ان کے پیروکار دین میں فتنہ اور تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا تھا یہ ملک بلاشبہ دارالاسلام ہے۔[۴۵]

زبان و بیان: ۔ یہ اردو زبان کا رسالہ ہے زبان بھی سادہ اور آسان ہے۔

اشاعت: اطمینان القلوب ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ع میں امدادیہ پریس ڈھاکہ سے چھپا۔

مرادالمریدین

تعارف:''مرادالمریدین'' کے مصنف مولانا کرامت علی ہیں۔اس میں صفحات کی تعداد۱۰۲ ہے۔''مرادالمریدین'' کا موضوع مذہبی،سیاسی اورسماجی مسائل ہیں۔

تاریخی اہمیت:''مرادالمریدین'' میں مولانا کرامت علی نے حاجی شریت اللہ ان کے بیٹے دودومیاں اوران کے تابعین کے مذہبی،سیاسی اورسماجی مسائل کو ہدف تنقید بنایا ہے۔انہوں نے ان لوگوں کو وہابی،خارجی اور لامذہبی کے ناموں سے موسوم کیا ہے۔فرائضیوں پران کی کڑی تنقید کی ایک وجہ یہ تھی کہ انہوں نے پیری ومریدی کو سختی سے ممنوع ٹھرایا اور کسی کو پیر پکارنا بھی معیوب قرار دیے دیا گیا تھا جس شخص سے تعلیم حاصل کی جاتی اسے پیر کی بجائے استاد کے لقب سے یاد کیا جاتا۔تعلیم حاصل کرنے والا مرید نہیں بلکہ شاگرد کہلاتا۔[۴۶]

جبکہ مولانا کرامت علی نے مختلف احادیث وآیات قرآنی کی روشنی میں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ پیری ومریدی کی ضرورت ہے۔اوراللہ والوں کی صحبت اور وعظ اور تعلیم میں بڑی تاثیر ہے۔اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم کسی ایک شخص کو اپنا مرشد نہ مان لیں۔

فرائضیوں کے فرقے کے اہم اصولوں میں ایک اصول یہ تھا کہ وہ بے نمازی کو کافر اور اس کا جنازہ نہیں پڑھتے تھے۔کیونکہ وہ عمل کو ایمان میں داخل سمجھتے تھے۔اس لئے وہ تحریک 'فرائضی تحریک' کے نام سے موسوم ہوئی کیوں کہ اس پوری تحریک کا سارا زور فرض کی ادائیگی پر تھا۔

لیکن مولانا کرامت علی کا یہ کہنا تھا کہ اس بات کو ماننے سے اسلام میں تفرقہ پیدا ہو جانے کا خوف ہے۔اور ہمارے دین میں کہیں سے ثابت نہیں کہ فاسق کو اسلام کی جماعت سے یک بارگی خارج کر دیں۔بلکہ بے نمازی کو آہستہ آہستہ نماز کی طرف ترغیب دلانے کی ضرورت ہے۔

فرائضی فرقے مولانا کرامت علی ایک اور الزام عائد کیا ہے کہ وہ اپنے گروہ میں کسی جرم کا

مقدمہ اپنی عقل سے خلاف کتاب کرتے ہیں اور سزا کے طور پر لوگوں کو جوتا مارتے ہیں۔اور انہیں جرمانہ کرتے ہیں،لیکن کرامت علی کا کہنا ہے کہ بادشاہ اور محتسب کے حکم کے سوائے اگر کوئی شخص کسی کی تعزیر کرے گا تو بادشاہ اور محتسب پر واجب ہے کہ اس تعزیر کرنے والے کی تعزیر کرے۔[۴۷]

اور جب تک ہر مومن شخص اپنے سارے مقدمہ اور معاملہ کو شریعت محمدی کی طرف رجوع نہ کرے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے سارے مقدمہ اور معاملہ میں حاکم نہ مقرر کرے گا اور اس مقدمہ اور معاملہ کا فیصلہ جو شریعت میں نکلے گا اس کو دل کی خوشی سے نہ کرے گا تب تک وہ شخص مومن نہ ہوگا۔[۴۸]

اس کے بعد نماز کی پابندی،زنا سے بچنا،علم کی فضیلت،واعظ کو ہدیہ،مرشد کا رتبہ جیسے مسائل زیر بحث آئے ہیں۔

زبان واسلوب بیان: ''مرادالمریدین'' کی زبان اردو ہے۔مولانا کرامت علی کے پیش نظر چونکہ عوام کی ہدایت تھی اس لئے انہوں نے اپنی تمام تصنیفات میں سادہ نگاری کو پسند کیا۔حسب معمول اس کتاب میں بھی یہی طرز کارفرما ہے۔

اشاعت:''مرادالمریدین'' ذخیرہ کرامت حصۂ دوم کے تحت امدادیہ پریس ڈھاکہ سے ۱۳۸۲ھ...... ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی۔

حوالہ جات

۱۔تذکرۃ المعاصرین ص ۱۲۶
۲۔مشرقی بنگال میں اردو۔ص ۱۳۱
۳۔کتاب شناسی۔ص ۵۱

۴۔آب کوثر ص ۳۱۹

۵۔آب کوثر،ص ۳۱۴

۶۔سفرنامہ ابن بطوطہ (مترجمہ رئیس احمد جعفری) (کراچی،نفیس اکیڈمی ۱۹۶۱ء) ص۔۷۵۱

۷۔آب کراچی، ص ۳۱۹

۸۔کتاب شناسی۔ص ۵۳

۹۔ایضاً، ص ۱۱۵

۱۰۔ثلاثہ غسالہ، ص۳۱۳

۱۱۔ثلاثہ غسالہ، ص ۳۱۳

۱۲۔ گلزار نعت از رحمان علی طیش،ص ۵۸

۱۳۔احسن العقائد، ص ۱

۱۴۔احسن العقائد،ص ۶۴

۱۵۔احسن العقائد،ص ۶۴

۱۶۔ محمد خالد یوسف،اردو کی ترقی میں مشرقی پاکستان کا حصہ (غیر مطبوعہ) ص ۹۲

۱۷۔ مشرقی بنگال میں اردو ص ۹۷

۱۸۔ براہین جیاد ،ص ۱

۱۹۔تواریخ ڈھاکہ،ص ۲۱۱

۲۰۔ چراغ ایمان، ص ۲

۲۱۔چراغ ایمان،ص ۱۳

۲۲۔شاہ خلیل الرحمٰن،فتاوی،شوکت محبوب سبحانی (کان پور، قیومی پریس،۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۵ء) ص۴۴

۲۳۔فتاوی شوکت محبوب سبحانی، ص ۱

۲۴۔رحیم اللہ،رکن الاعظم (لکھنو مطبع منشی نولکشور ۱۳۱۸/۱۹۰۰ء) ص ۶۸

۲۵۔ایضاً، ص ۱

۲۶۔ محمد مطیع الرحمٰن آئینۂ ویسی (مقدمہ) (پٹنہ لیبسل لیتھو پریس ۱۹۷۶) ص ۱۴۶

۲۷۔ زین العابدین،حیات ویسی (کلکتہ،۱۹۲۵ء)ص ۸

۲۸۔ آئینہ ویسی، س ۱۴۷

۲۹۔ حیات ویسی،ص ۱۱

۳۰۔ آئینہ ویسی ص ۱۵۳

۳۱۔ ایضاً ص ۱۷۶

۳۲۔ آئینۂ ویسی ص ۴۳۱

۳۳۔ نساخ، ص ۲۲۱

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۲۱

۳۵۔ ثلاثہ غسالہ،ص ۴۲۳

۳۶۔ عبدالرشید شاہزاد پوری، جام توحید،ص ۲

۳۷۔ تحفۂ مجددیہ، ص ۲

۳۸۔ کرامت علی جونپوری،مرادالمریدین، ص ۸۴

۳۹۔ کرامت علی جونپوری،مکاشفات رحمت،ص ۵

۴۰۔ ایضاً، ص ۵

۴۱۔ مکاشفات رحمت ،ص ۱۷

۴۲۔ ایضاً، ص ۱۰۹

۴۳۔ کرامت علی جونپوری، قول الامین،ص ۲۴۰۔۲۴۱

۴۴۔ بنگالی مسلمان کی صدسالہ جدوجہد وآزادی از عبداللہ ملک،ص ۱۴۵

۴۵۔ اطمینان القلوب،ص ۱۵۵

۴۶۔ بنگالی مسلمانوں کی صدسالہ جدوجہد وآزادی ، ص ۱۴۶

۴۷۔ مرادالمریدین ، ص ۳۴

۴۸۔ ایضاً، ص ۳۷

باب ہفتم

بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں

ادبی تاریخ کے مأخذ

سخن شعراء

’’سخن شعراء‘‘ شعرائے اردو کا تذکرہ ہے۔اس لحاظ سے ایک ادبی تاریخ ہے۔مصنف عبد الغفور نساخ ہیں۔ ’’سخن شعراء‘‘ اس تذکرے کا تاریخی نام ہے۔جس سے تاریخ ۱۲۸۱ھ نکلتی ہے۔اس میں صفحات کی تعداد ۵۸۲ ہے۔اسی طرح گارساں دتاسی کے تذکرے ’’تاریخ ادب ہندوستان‘‘ کے بعد یہ سب سے ضخیم تذکرہ ہے۔

تاریخی اہمیت: ’’سخن شعراء‘‘ میں قدماء سے لے کر نساخ کے عہد تک معاصر شعراء کا ذکر ہے۔ڈاکٹر صدر الحق نے ’’ سخن شعراء‘‘ میں شاعر و شاعرات کی مجموعی تعداد ۲۴۸۵ بتائی ہے۔مولانا وحشت نے یہ تعداد ۲۴۸۳ ،لطف الرحمٰن نے ۲۴۸۴ ،فرمان فتح پوری نے ۲۴۰۹ بتائی ہے۔[۱] تذکرے کے آخر میں دس صفحات شاعرات کے لئے مخصوص ہیں۔

’’ سخن شعراء‘‘ میں معروف وغیر معروف ہر قسم کے شاعر موجود ہیں لیکن کلام پر رائے نہایت

مختصر ہے۔اکثر کسی قسم کا اظہار خیال نہیں کیا گیا۔یعنی تنقیدی رائیں بہت کم ہیں۔سلیس اور عام فہم زبان میں سرسری سا تبصرہ کر دیا ہے۔بہت شعراء ایسے ہیں جن کے متعلق نساخ کو خود بھی علم نہیں۔اس لئے بیشتر کے حالات زندگی بہت کم بیان ہوئے ہیں۔کہیں صرف نام اور تخلص لکھ کر چھوڑ دیا ہے۔شعراء کی پیدائش اور وفات کا ذکر نہیں۔البتہ شعراء کے وطن کا ذکر کیا گیا ہے۔اس تذکرے میں انہوں نے اتنا اختصار برتا ہے کہ خود اپنے متعلق بھی صرف اسی پر اکتفا کیا ہے۔’’نساخ تخلص، راقم اوراق ہیچ نیر عبدالغفور‘‘ لیکن اس اختصار نویسی کا اعتراف مقدمہ میں نساخ نے یوں کر لیا ہے:۔

> ’’اس طرح کا تذکرہ لکھوں جن میں اشعار آبدار میں اطناب وایجاد ہو اور احوال شعراء میں اختصار و ایجاد اور حالات ابنائے زبان کو بقدر طاقت بشری جامع اور حشو و زوائد کو مانع ہو‘‘۔[۲]

لیکن اپنے کلام کا خوب طویل نمونہ پیش کیا ہے۔دیگر نامور شعراء کے سلسلے میں بھی کلام کا نمونہ طویل ہے۔چنانچہ سوانح اور تنقید کے لحاظ سے یہ تذکرہ زیادہ اہم نہیں۔مگر شعراء کے کلام میں لفظی خوبیوں پر انہوں نے خوب نظر رکھی ہے کلام میں علم عروض، بدیع کا بیان اور صنائع لفظی کے استعمال کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔جیسے حافظ اکرام احمد ضیغم کے کلام میں عروض وقوافی صنائع وبدائع شعری کی نشان دہی بڑی وضاحت سے کی ہے۔[۳]

لیکن اس خامیوں کے باوجود ادبی تاریخ میں ’’ سخن شعراء‘‘ کا مرتبہ اس لحاظ منفرد ہے کہ اس میں سرزمین بنگال سے تعلق رکھنے والے بہت سے شعراء کا تذکرہ ملتا ہے۔اگر چہ یہ تذکرہ نہ لکھا جاتا تو ہم بنگال کے ان شعراء سے متعلق کچھ واقفیت نہ رکھتے اور ان کی ادبی سرگرمیوں

سے ہم روشناس ہوتے اس طرح وہ اپنی موت آپ مرجاتے۔اس تذکرے کے مطالعے سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دہلی اور لکھنو سے دور افتادہ بنگال اور بہار ایسی سرزمین کے ہر خطے میں اردو شعراء وادباء داد سخن دے رہے تھے۔حد تو یہ ہے کہ '' سخن شعراء'' کے بعد جتنے بھی تذکرے لکھے گئے ان میں ان علاقوں کے شعراء کا ذکر خال خال ہی نظر آتا ہے۔یہ '' سخن شعراء'' ہی کی کرشمہ سازی ہے کہ ہمیں بنگال و بہار کے سینکڑوں گم نام شاعروں کا حال آج معلوم ہو رہا ہے اور اس تذکرے میں جو کلام کے نمونے ہیں ان کی یادگاریں بھی اس تذکرے میں محفوظ ہیں۔کلکتہ، فرید پور، ڈھاکہ، چٹاگانگ، سلہٹ اور میمن سینگھ وغیرہ کے علاقوں کے تقریباً بہت سے شعراء سے ہماری واقفیت بھی محض اس تذکرے کی بدولت ہے۔ علاوہ ازیں اس علاقے کے چند شاعروں کا حال ہمیں جو دوسرے تذکروں سے ملتا ہے وہ بھی محض سخن شعراء کی وجہ سے ہے۔ورنہ عام طور پر تذکرہ نگاروں نے اس خطۂ مردم خیز کو کبھی قابل اعتنا ہی نہیں سمجھا۔یہی نہیں بہترے ایسے چھوٹے موٹے شاعروں کا بھی جو دوسرے تزکروں میں جگہ نہیں پا سکے یہیں ذکر ملتا ہے۔[4]

اقبال عظیم'' سخن شعراء'' کی اس اہمیت کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:۔

''ان شعراء میں خاص طور پر بنگال کے متعدد غیر معروف شعراء کا مختصر حال اور ان کے کلام کے نمونے بہت مفید ہیں اس لئے کہ یہ مواد اس کتاب کے علاوہ کہیں نہیں ملتا۔اس تصنیف سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آج سے سو برس پہلے بھی مشرقی بنگال میں اردو شعر گوئی کو قبول عام حاصل تھا اور یہاں اردو میں شعر کہنے والوں کی تعداد کم نہ تھی۔[5]

اس طرح ''سخن شعراء'' بہت لسانی اہمیت حامل ہے۔جس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بنگال میں جہاں کے لوگوں کی زبان بنگالی ہے۔وہاں اردو شعر و شاعری کا کتنا چرچا تھا۔

''سخن شعراء'' میں شعراء کے علاوہ شاعرات کا بھی تزکرہ ہے۔اس کے ساتھ ان کے مختصر حالات زندگی بھی ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کی انیسویں صدی میں عورتوں میں بھی شعر و سخن کا اچھا ذوق تھا۔

علامہ وحشت اس تذکرہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

'' راقم السطور کے خیال میں یہ تذکرہ بلحاظ جامعیت کل اردو تذکروں پر سبقت لے گیا ہے۔کلام کا انتخاب نہایت عمدہ اور رائے بے باکانہ ظاہر کی گئی ہے۔''[6]

زبان و بیان: ''سخن شعراء'' بزبان اردو لکھا گیا ہے۔انداز بیان اردو قدیم تذکروں کی مانند فارسی آمیز الفاظ سے بھرپور نہیں۔بلکہ نہایت سادہ و سہل اردو کا استعمال کیا گیا ہے۔

اشاعت: ''سخن شعراء'' کا سال ترتیب ماہ رمضان ۱۲۸۱ھ/۱۸۷۴ء ہے۔ یہ تذکرہ منشی نولکشور پریس لکھنو میں طبع ہوا تھا۔

قطعہ منتخب

تعارف: ''قطعہ منتخب'' بھی عبدالغفور نساخ کی تصنیف ہے۔

''قطعہ منتخب'' تاریخی نام ہے۔جس کے حروف سے ۱۲۷۶ھ تاریخ نکلتی ہے۔سرورق اس کا نام '' تذکرہ شعرائے زبان اردوئے معلیٰ'' لکھا ہے۔ قطعہ منتخب میں ایک سو چھ صفحات ہیں۔

تاریخی اہمیت: اس کتاب میں نساخ نے اردوشعراء کے عمدہ عمدہ قطعات اکٹھا کر کے ایک کتابی شکل دی اوراس کا نام ''قطعہ منتخب'' رکھا۔ یہ ایک انوکھی چیز ہےاس کی وجہ تصنیف کے بارے میں نساخ یوں فرماتے ہیں:۔

> '' ایک دن مجمع احباب میں ہرقسم کے شعر پڑھے جاتے تھے اس میں خیال آیا کہ اگر شعرائے مقدمین ومتاخرین زبان ریختہ کے قطعات عمدہ جہاں تک دستیاب ہوں بقید حروف تہجی ہر ردیف میں تحریر پائیں تو ایک معقول یادگار رہ جائے گی۔ کہ کسی نے آج تک ایک ایسا تذکرہ جمع کیا نہیں،اس پر راقم نے کمر ہمت چست باندھی اورتھوڑے عرصے میں بہت سے دیوان اور تذکروں سے چن کر ساڑھے پانسو قطعوں کو جمع کیااور نام تاریخی اس قطعوں کو جمع کیااور نام تاریخی اس کا''قطعہ منتخب'' رکھا۔[۷]

نساخ نے ہرقطعہ گو کا نام،تخلص اوراس کی زندگی پر ہلکی سی روشنی بھی ڈالی ہے۔''قطعہ منتخب'' کے بارے میں حکیم اشرف علی مستؔ کا کہنا ہے۔''قطعہ منتخب'' مجموعہ مقطعات ہے ہرقطعہ میں نیا مضمون نئی بات ہے۔نئی طرز کا تذکرہ ہے۔[۸]

نساخ کے ایک اورمعاصر عبداللہ آشفتہ کاخیال ہے۔

''قطعہ منتخب'' بمقطعات دلاویز گلدستہ بہجت انگیز۔[۹]

علامہ رضاعلی وحشت ''قطعہ منتخب'' کے بارے میں فرماتے ہیں:''قطعہ منتخب'' ۱۲۷۶ھ شعراء

ریختہ گو کے بامزہ قطعات کا مجموعہ ہے۔ ہرشاعر کے کلام کے ساتھ اس کا مختصر سا تذکرہ بھی ہے۔''[۱۰]

ڈاکٹر عندلیب شادانی نے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے:۔''اس میں اردوشعراء کے قطعات جمع کئے ہیں۔''[۱۱]

مولانا عبدالسلام ندوی کے خیال میں یہ ایک ''مستقل تذکرہ'' ہے۔جس کے بارے میں انہوں نے یوں اظہار خیال کیا ہے:۔

> ''مولوی عبدالغفور نساخ نے ایک مستقل تذکرہ قطعۂ منتخب کے نام سے اس شعراء حالات میں لکھا جنہوں نے اخلاقی صوفیانہ اور عاشقانہ قطعے لکھے ہیں۔[۱۲]

''قطعہ منتخب'' کے بارے میں صدرالحق کا کہنا ہے:

> ''اسے نساخ کی جدت کہی جائے یا اردوشاعری سے ان کی والہانہ محبت یا کچھ اور لیکن یہ بہرحال تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو تذکروں میں ایک نئے تذکرے اور نئے طرز تذکرہ کا قطعۂ منتخب ایک اضافہ ہے۔[۱۳]

زبان وبیان :''قطعہ منتخب'' اردوزبان میں تحریر کی گئی ہےاورزبان بھی حسب معمول سہل و رواں ہے۔جونساخ کی دوسری کتابوں کا خاصہ ہے۔

اشاعت:''قطعہ منتخب'' جمادی الاولی ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں طبع نولکشور لکھنو میں شائع ہوا۔

قند پارسی

'' قند پارسی'' عبدالغفور نساخ کی کوششوں کا نتیجہ۔ جو ۱۱۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

اہمیت: یہ رسالہ ایک بیاض ہے۔ جس میں فارسی گو شعراء بزرگان دین، صوفیائے کرام وغیرہ کے فارسی کلام کے انتخاب کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ تقریباً دس فارسی گو شعراء کا انتخاب درج ہے۔ اس رسالے میں بعض ایسی چیزوں کا انکشاف کیا گیا ہے۔ جس سے موجودہ دور میں بعض گوشے جو تاریکی میں تھے یا جسے دنیائے شاعری فراموش کرتی جارہی تھی پھر منصۂ شہود پر آجائیں گے۔ مثلاً شیخ ابوعلی سینا بلخی کی فارسی شاعری کے دو اشعار نمونتاً '' قند پارسی'' میں پیش کئے گئے ہیں، مفتی محمد صدرالدین خان آزردہ دہلوی کے آٹھ فارسی اشعار اس رسالے میں موجود ہیں۔ [۱۴]

آزردہ بقول رام بابو سکسینہ تینوں زبانوں میں یعنی عربی، فارسی اردو میں شعر کہتے تھے۔ مگر کبھی دیوان کی صورت میں مرتب نہیں کئے گئے۔ [۱۵]

دیگر تذکروں میں بھی اسکا ذکر موجود ہے پھر بھی چونکہ '' قند پارسی'' ایک بیاض ہے اس لئے اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بہرحال اس بیاض میں ہندی کے نامور اور گمنام شعراء دونوں ہی کے کلام کا کچھ نہ کچھ انتخاب موجود ہے۔ یہ شعراء ایرانی بھی ہیں، ہندی بھی ۔دہلوی بھی ہیں انتخاب موجود ہے۔ شیرازی بھی ہیں۔ کابلی بھی ہیں، اکبرآبادی بھی ہیں اور دکنی بھی ہیں، الہ آبادی بھی ہیں اور کاکوری بھی ہیں۔ اور لاہوری بھی۔ عظیم آبادی ہیں اور پنجابی بھی الہ آبادی، لکھنوی اور بنگالی بھی نیز صوفیائے کرام کے اشعار کا انتخاب بھی اور پیشہ وار شعرا کا بھی۔ غرض کہ نساخ نے ہر شعبہ حیات کے فارسی گو شعراء کا انتخاب اس بیاض میں یکجا کرلیا ہے۔ [۱۶]

قند پارسی کے متعلق ڈاکٹر عندلیب شادانی یوں لکھتے ہیں۔

'' فارسی شعراء کے کلام کا انتخاب ہے۔'' [۱۷]

رضا علی وحشت کا کہنا ہے۔

'' شعرائے فارسی گو کے کلام کا نہایت پاکیزہ انتخاب ہے''۔ [۱۸]

حکیم اشرف علی مست کہتے ہیں:۔

'' قند پارسی'' بیاض پارسی ہے۔ جس میں مولف نے سخن فہمی اور سخن شناسی کی داد دی ہے''۔ [۹]

اقبال عظیم لکھتے ہیں:۔

'' قند پارسی'' مختلف شعرائے فارسی کا تذکرہ ہے''۔ [۲۰]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا بھی خیال ہے کہ:

> '' یہ بیاض تذکرہ نگاری کا نقش اول ہے جب یہی نام یا تخلص بلحاظ حروف تہجی ابجدی ترتیب دیئے گئے اور کسی خاص قرینے سے مرتب کر دیئے گئے تو اس کا نام تذکرہ ہوگیا''۔ [۲۱]

لیکن '' قند پارسی'' تذکرہ نہیں کیونکہ اس میں کسی کے حالات زندگی نہیں ملتے۔ انہوں نے مگر غزلوں کا انتخاب پیش کیا ہے کوئی بھی غزل مکمل نہیں بلکہ بطور مثال چند اشعار کو حاضر کیا ہے۔ کہیں کہیں قطعات بھی ہیں البتہ قطعے پورے پیش کئے گئے ہیں:

زبان: قند پارسی کی زبان اردو ہے۔ انداز بیان عام فہم اور سیدھا سادہ ہے۔

اشاعت: قند پارسی ۱۸۷۲ء میں مطبع نولکشور سے طبع ہوا۔

زبان ریختہ

''زبان ریختہ'' اردو زبان کی ایک مختصر تاریخ ہے۔ صفحات کی تعداد ۱۶ ہے مصنف عبد الغفور نسآخ ہیں۔

حالت مصنف: عبدالغفور نسآخ کے حالات زندگی گذشتہ صفحات میں بیان کئے گئے ہیں۔

تاریخی اہمیت: یہ رسالہ اردو زبان کی بنا اور اس کی ترویج وترقی کی مختصر سی تاریخ ہے اس کی وجہ تصنیف کے بارے میں نسآخ کہتے ہیں:۔

> ''شعراء متقدمین ومتاخرین زبان اردو کے اشعار دیکھنے لگا۔ان کے زبان ومحاورے میں بہت فرق پایا گیا۔ پئے تحقیق کر ہمت چست باندھی خوب تفتیش کی۔برسوں اسی فکر میں رہا ایک عمر کو برباد کیا۔بارے جب بہت سے دیوان اور تذکرے نظر سے گزارے۔
>
> بہت سی اردو کتابیں دیکھیں۔بیشتر مسئلے اس کے حل ہو گئے بہت سی باتیں معلوم ہو گئیں۔تب جی میں آیا کہ زبان اردو کیفیت کو دل سے زبان لاؤں کہ اردو کسی زبان کو کہنے میں اور وجہ تسمیہ اس کی کیا ہے۔
>
> اور نظم اردو کو ریختہ کیوں کہتے ہیں۔
>
> کب سے یہ زبان اقلیم ہندی میں مروج ہوئی ہے اور کیوں کر اصل ہندی میں تصرف ہوتا گیا۔اور کس طرح پر تغیر وتبدل واقع ہوا۔اور کسی عہد کے شعراء کی زبان کا کیا طرز تھا۔''

اسی کے بعد اردو زبان کو اردو کہنے کی وجہ تسمیہ، نظم اردو کو ریختہ کہنے کا سبب اردو زبان کا دہلی

میں مروج ہونا۔دہلی سے دکن کو جانا، اس زبان پر وہاں کے مقامی اثرات، پھر اردو کی دلی آمد اور وہاں اس کا عروج، مرزا جان جانان کا اصلاح زبان کا بیڑہ اٹھانا۔مختلف بدیسی زبانوں نے مثلاً انگریزی اور فرانسیسی کے اثر سے اس میں تغیر وتبدل۔اس طرح اردو کی ترقی وعروج کا ایک مختصر خاکہ ہے۔جس کی وضاحت شعراء کے کلام سے کی گئی ہے۔

اشاعت: یہ رسالہ ۱۸۷۴ء مطابق جمادی الاولی ۱۲۹۱ھ میں مطبع نولکشور لکھنو سے چھپا۔ زبان ریختہ اس کا تاریخی نام ہے۔اس سے تاریخ ۱۲۸۵ھ نکلتی ہے۔ زبان ریختہ دوسری بار نولکشور سے اکتوبر ۱۸۹۰ء مطابق ماہ صفر ۱۳۰۸ھ میں طبع ہوا۔

تذکرۃ المعاصرین

''تذکرۃ المعاصرین'' فارسی گو شعراء کا تذکرہ ہے۔مصنف عبدالغفور نساخ ہیں۔

تاریخی اہمیت: اس تذکرے سے برصغیر میں فارسی گویاں کا سراغ ملتا ہے۔خصوصاً یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ بنگال میں بھی فارسی کا کتنا چرچا تھا۔یہ زبان یہاں سمجھی جاتی تھی اور اس میں شعر وشاعری کی جاتی تھی۔اس طرح یہ تذکرہ لسانی اہمیت کا حاصل ہے۔چنانچہ فارسی گو جو سرزمین بنگالہ سے تعلق رکھتے تھے ان کی تعداد کم نہیں تھی تقریباً ۱۸۴ ایسے شعرا کا ذکر ہے جو صرف اس سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔ایسے شعراء کی تعدا جو بنگال کی خاک نہ تھے اگر اس تعداد میں شامل کر لی جائے تو تعداد ۲۳۶ ہو جاتی ہے۔چنانچہ اس چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ ''سخن شعراء'' کی طرح اس تذکرے کی اہمیت کم نہیں۔ان شعراء میں محدود چند ایسے ہیں جن کا سراغ ''تذکرۃ المعاصرین'' کے علاوہ اور کہیں مل سکتا ہے۔

بہر حال نساخ کا یہ تذکرہ بھی ''سخن شعراء'' کی طرح ان کا شاہکار ہے اور ان کی جدت و ندرت کی غمازی بھی اس سے ہوتی ہے کہ انہوں نے فارسی گو اور ریختہ گو شعراء کو گڈ مڈ نہیں کر دیا بلکہ دونوں کی طرح کے شعراء کے لئے الگ الگ تذکرہ لکھا۔ ممکن ہے کہ مصحفی کے تذکرے ''عقد ثریا'' اور'' تذکرۂ ہندی'' کی مثال سے انہوں نے یہ جدت اختیار کی ہو۔[22]

یہ تذکرہ حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ مگر ''ع'' کی ردیف تک پہنچنے کے بعد آگے نہ بڑھ سکا۔ کہ نساخ کا انتقال ہوگیا۔ نساخ کا انتقال ۱۴ جون ۱۸۸۹ کو ہوا۔ یہ تذکرہ نساخ نے غالباً اپنی عمر کے آخری حصے میں لکھنا شروع کیا ہوگا، اس تذکرے کے مطالعے سے کسی صحیح تاریخ تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔

اس تذکرے کی اشاعت کے بارے میں اقبال عظیم کہتے ہیں: '' 'ع' کی ردیف تک پہنچے پایا تھا کہ ان کا انتقال ہوگیا''۔ علامہ وحشت لکھتے ہیں: '' پورا چھپنے نہ پایا کہ مؤلف نے قضا کی''

اس کی اہمیت کے بارے میں رضا علی وحشت اور لکھتے ہیں:

"Tazkirah-i-ma'aserin, an excellent unpublished tazkirah containing an account of the persian poets of his time."[23]

ڈاکٹر عندلیب شادانی اس کے بارے میں کہتے ہیں:

'' تذکرۃ المعاصرین'' اپنے عہد کے فارسی گو شعراء کا نہایت عمدہ تذکرہ ہے۔[24]

اس تذکرے کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اردو کے مشہور اساتذہ مثلاً امیر احمد امیر مینائی، الطاف حسین حالی، داغ دہلوی، رند اور سر سید احمد خان آہیؔ فارسی میں شعر و شاعری کرتے

تھے۔ اس کا ذکر مولانا رضا علی وحشت نے ماہ نو، کراچی مارچ ۱۹۵۱ء، ڈاکٹر عندلیب شادانی ساقی، کراچی ۱۹۵۵ء، اور اقبال عظیم نے مشرقی پاکستان میں اردو میں بھی کیا ہے۔

نساخ نے اس تذکرے میں فارسی کے علاوہ عربی کلام کے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔ جیسے عبدالمنعم ذوقیؔ۔[25] وعبدالغفور شہاز کی عربی غزلیں۔[26]

کہیں کہیں نثری نمونے بھی پیش کئے ہیں جیسے نصیر الدین حیدر سامیؔ کی نثر کے نمونے '' از پشہ نامہ''[27]

تذکرہ معاصرین میں سلطان محمد اعظم شاہزادہ کا لکھا ہوا ایک فارسی قصیدہ بعنوان '' درغرض حال زبان فارسی'' بھی درج ہے۔ جس کا موضوع ہے کہ فارسی نے کب ہندوستان میں رواج پایا اور فارسی شعر و شاعری کا آغاز کب ہوا۔[28]

''تذکرۃ المعاصرین'' میں بھی چند کے علاوہ کلام پر رائے دینے کے بارے میں اختصار برتا گیا ہے۔ بہر حال نساخ کی مصروفیتوں اور ذمہ داریوں کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ ان کا یہ کارنامہ یعنی'' تذکرۃ المعاصرین'' بھی کم اہمیت کا حامل نہیں۔ ''سخن شعراء'' کی طرح اس کی بھی افادیت ہے اور بنگال کے شعراء اور بنگال سے متعلق شعراء سے واقفیت حاصل کرنے کا فی زمانہ واحد ذریعہ ہے۔ اور بنگال پر کام کرنے والوں کے لئے مشغل راہ۔ بنگال کے اردو شعراء سے روشناس ہونے کے لئے ''تذکرۃ المعاصرین'' بھی ضروری اور لازم ہے اور ان دونوں تذکروں سے نساخؔ کی اہمیت سرزمین بنگال میں بہت بڑھ جاتی ہے۔ حقیقت یہ کہ ان دونوں تذکروں ہی نے نساخؔ کو اب تک ادبی طبقے اور خاص کر تحقیق دنیا میں زندہ و پائندہ رکھا ہے۔[29]

حوالہ جات

۱۔نساخ، ص ۲۳۸

۲۔سخن شعراء، ص ۳

۳۔اکرام احمد ضیغم کے صنائع لفظی و معنوی کا ذکر سخن شعراء میں ص ۲۹۶ تا ۲۹۸ ہے۔

۴۔نساخ،ص ۲۴۰

۵۔مشرقی بنگال میں اردو، ص ۵۶

۶۔اردوئے معلیٰ،اکتوبر نومبر ۱۹۰۷ ،ص ۲

۷۔قطعۂ منتخب، ص ۲

۸۔گنج تواریخ، ص ۶۰

۹۔ ایضا ،ص ۵۸

۱۰۔اردوئے معلیٰ اکتوبر،نومبر ۲

۱۱۔ساقی،کراچیم مارچ ۱۹۵۵ء ، ص ۱۱

۱۲۔عبدالسلام ندوی،شعرالہند(لاہور،عشرت پبلیشنگ پاوس ۱۹۶۵) ص ۳۳۔ ۳۴

۱۳۔نساخ ،ص ۲۴۸

۱۴۔نساخ، ص ۲۵۹

۱۵۔تاریخ ادب اردو، ص ۳۰۹

۱۶۔نساخ، ص ۲۵۹

۱۷۔ساقی،ماہ مارچ، ۱۹۵۵، ص ۱۱

۱۸۔اردوئے معلیٰ،اکتوبر نومبر ۱۹۰۷ ، ص ۲

۱۹۔گنج تواریخ، ص ۶۰

۲۰۔مشرقی بنگال میں اردو، ص ۵۸

۲۱۔تذکروں کا تذکرہ،ص ۱۹

۲۲۔نساخ، ص ۲۵۵

23.Journal of the Muslims Institute, July-September, 1908 , P. 10

۲۴۔ ساقی کراچی،مارچ ۱۹۵۵،ص ۱۲

۲۵۔ تذکرۃ المعاصرین، ص ۹۰

۲۶۔ایضا، ص ۱۴۶

۲۷۔ایضا،ص ۹۶

۲۸۔ایضا، ص ۱۴۳

۲۹۔نساخ،ص ۲۵۸

باب ہشتم

بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں

شخصی تاریخ کے مأخذ

خودنوشت سوانح حیات عبدالغفور نساخ

تعارف: اس کتاب میں عبدالغفور نساخ نے اپنی آپ بیتی بیان کی ہے۔
جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے یہ ان کے خاندانی حالات، تجربات ومشاہدات کی عکاسی ہے۔ ضمنی طور پر کتاب میں اس عہد کے سماجی، ادبی اور تاریخی واقعات بھی آگئے ہیں۔

تاریخی اہمیت: خودنوشت سوانح عمری عبدالغفور نساخ کی ایک تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اس کے مطالعے سے نساخ کے حالات زندگی، ان کا شجرہ نسب، تعلیم وتربیت، شادی بیاہ، ان کے عادات واطوار، ان کے مذہبی عقائد، ان کی شخصیت، ان کی ادبی سرگرمیاں، مختلف علاقوں میں ان کا سفر اور وہاں کے تجربات کے بارے میں مفید معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

خودنوشت سوانح عمری عبدالغفور نساخ کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ اس کے مطالعے سے انیسویں صدی کے بہت سے سربرآوردہ اشخاص سے ہمارا تعارف ہوتا ہے۔ نساخ چونکہ ڈپٹی

کلکٹر اور ڈپٹی مجسٹریٹ جیسے اہم عہدے پر فائز تھے۔ اس حیثیت سے انہیں سماج کے بہت سے لوگوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ سماج کے اونچے طبقے کے بہت سے لوگوں سے ان کا یارانہ تھا۔ ملک کے جس حصے میں بھی جاتے ان سے شناسائی قائم ہو جاتی تھی۔ اپنی خودنوشت لکھتے ہوئے ان دوست احباب کا ذکر ناگریز تھا۔ لہذا انہوں نے اپنے عہد کے بہت سے معتمد لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ جن کو پڑھ کر قارئین بھی سمان کے اس طبقے سے روشناس ہو جاتے ہیں۔
نساخ نے نہ صرف اونچے طبقے کا بلکہ انیسویں صدی کے اس عام سماج کا بھی خوبصورت نقشہ اتارا ہے جن کے ساتھ عدالت وکچہری میں واسطہ پڑتا تھا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے سماج کے اس طبقے کو جس طرح دیکھا تھا اس کا ویسا ہی بیان کیا ہے۔ ان کے عادات واطوار کا ذکر ہے۔ اس طبقے کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کیا ہے۔
جیسے بریسال کی سماجی زندگی کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہاں کے لوگوں کو مقدمہ بازی کا بے حد شوق ہے۔ اکثر جھوٹے مقدمے بناتے ہیں مثلاً ایک شخص نے اپنی شیرخوارہ بیٹی کو ایک دوسرے شخص کو سونپ دیا۔ اس شخص نے اس بچی کو مار ڈالا اور اپنے دشمن پر اس بچی کے قتل کا مقدمہ دائر کر دیا۔ ایک شخص نے اپنے چچا کو مار ڈالا اور اپنے دشمن پر مقدمہ کر دیا ایک شخص نے اپنے عزیزوں میں سے جس کی ہلاکت ہیضہ سے واقع ہوئی۔ ہلاک ہونے کے ساتھ ہی پیٹ کو برچھی سے کھال کر دیا اپنے دشمن پر خون کا مقدمہ کر دیا۔[1]

دریائی راستوں میں ڈکیتی اور رہزنی کثرت سے ہوتی تھی۔ اور کچھ لوگوں میں جعل سازی کا بھی رواج تھا۔ اس سلسلے میں ایک ہندو شخص، دیتو نامی جعل کے کاغذات بنانے میں بہت ماہر تھا۔[2]

بریسال کے اکثر عوام آسودہ حال تھے کیونکہ بریسال کی زمین نہایت زرخیز ہے۔ بالم چاول، ناریل اور سپاری کی افراط ہے۔ زمین نرم ہونے کی بنا پر کاشتکاری میں نہایت سہولت ہے۔ یہاں کی آب و ہوا بہت مرطوب ہے۔[۳]

راجشاہی میں قیام کے دوران انہوں نے ۱۴ اکتوبر ۱۸۶۴ء کے طوفان کا ذکر کیا ہے۔ یہ ایک ہولناک طوفان تھا۔ جس سے بہت سے مکان گر گئے، درخت جڑ سے اکھڑ گئے۔ اور دریا میں سینکڑوں کشتیاں ڈوب گئیں۔[۴]

سلہٹ میں عدالتی کارروایاں انجام دیتے ہوئے سماج کے جن مقدمہ باز لوگوں نے انہیں سروکار رہا۔ ان کے بارے میں اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان لوگوں میں جھوٹ بولنے کی عادت بے حد ہے۔ جھوٹی گواہی دینے کو عار نہیں سمجھتے مگر اس کے ساتھ نماز روزے کے بھی بہت پابند ہیں۔ کسبیاں تک نماز پڑھتی ہیں۔

سلہٹ حضرت شاہ جلال کا مزار ہے۔ جنہوں نے ۸۶۰ھ میں سلہٹ فتح کیا تھا۔ وہیں ۸۹۰ھ میں انتقال فرمایا۔ سلہٹ کے اکثر شرفا اپنے نسب کو حضرت شاہ جلال کے کسی ہمراہی سے منسوب کرتے ہیں۔ مزار میں جلالی کبوتر بہت افراط سے رہتے ہیں۔۔ لوگ احتراماً ان کبوتروں کو نہیں مارتے۔[۵] سلہٹ کے اکثر مسلمان سود نہیں کھاتے۔ جو سود کھاتا ہے عوام اسے بری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

ڈھاکہ کی سماجی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے نواب عبدالغنی صاحب کے ہاں منعقد کردہ ایک تقریب کا بیان کیا ہے۔ جس میں سولہ روز تک محفل رقص و سرور جاری رہتی جس میں لکھنو، کلکتہ اور پارسی تھیٹر کی طوائفوں نے حصہ لیا۔ اس محفل میں اپنے عمائدین شہر کو مدعو کیا گیا تھا۔[۶]

ڈھاکہ میں اپنے مزید تجربات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ڈھاکہ میں اکثر جگہوں پر مولود خوانی راگ و سر کے ساتھ ہوتی ہے جو شرعاً ناجائز ہے۔[۷]

ڈھاکہ میں ایک نیچ قوم ہے ''کٹی'' کہتے ہیں یہ لوگ وہابی عقیدہ کے قائل ہیں۔ یہ لوگ چاول اور چمڑے کا کاروبار کرتے ہیں۔[۸]

ڈھاکہ میں ایک اور ''پیر پرست'' قوم بستی ہے جس کا جاہلانہ عقیدہ ہے کہ ان کی پری ''عالم الغیب'' ہے۔ ان پیر پرستوں میں ایک مشہور شخص حافظ احمد تھے۔ مریدان اپنے پیروں کو سجدہ اور قدم بوسی کرتے تھے۔ شاہ نجیب اللہ شہبازی نامی ان کے پیر تھے۔ انہوں نے اپنے مریدوں کو ہدایت دے رکھی تھی کہ نماز میں رکوع کے سبحان ربی العظیم کے بعد بادشاہ نجیب اللہ اور سجدہ میں سبحان ربی الاعلی کے بعد بادشاہ نجیب اللہ پڑھا کریں۔[۹]

ڈھاکہ کے اکثر مسلمان مہوس ہیں۔ ان میں شراب نوشی و تماشہ بینی کا بہت شوق ہے۔[۱۰] یہاں ''طلاق بالخیار'' کا بھی بہت رواج ہے۔ یعنی عورتوں کو بھی طلاق دینے کا حق ہے۔[۱۱]

ڈھاکہ میں جھوٹ گواہی دینے کو معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے۔ پیچیدہ مقدموں میں گواہ پہلے اظہار کا مسودہ زبانی یاد کر لیتا ہے اور بعد میں اسے گواہی کے طور پر پیش کرتا ہے۔[۱۲]

آخر میں نساخ صاحب نے ایک تہوار میں ذکر کیا ہے جس میں بہت لوگوں کا مجمع تھا۔ جا بجا ناچ و تماشہ ہوتا تھا۔ اس تہوار میں ڈھاکہ کے شعراء اور بزرگان کشمیر نے حصہ لیا۔ لیکن یہ تہوار کس مقام پر منعقد ہوا اس کا کوئی ذکر نہیں[۱۳]

لکھنو کے لوگوں کے بارے میں ان کی رائے ہے:

"یہاں کے اکثر لوگ زبانی محبت دکھلاتے ہیں۔لیکن دل میں کچھ نہیں ہے۔لکھنو کے لوگ باتیں خوب بتاتے ہیں۔" [۱۴]

دلی میں انگریزی اثرات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"ماہ اکتوبر ۱۸۸۵ء کو تین مہینے کی رخصت لے کر دہلی کو گیا۔ اس دفعہ جو گیا تو دیکھا کہ بعض بعض ہندو، مسلمان انگریزی کپڑے پہنتے لگے ہیں۔"

دلی کے لوگوں کی متعلق ان کا خیال ہے۔

"دہلی کے لوگ عموماً اچھے ہیں دل وزبان ایک ہے۔" [۱۵]

ناسخ چونکہ خود شاعر وادیب تھے۔لہذا ان میں ادبی ذوق کا ہونا فطری تھا۔اس لئے "خود نوشت" لکھتے ہوئے اپنے ادیبانہ تجربوں کا بھی ذکر کیا ہے۔اسی لئے "خودنوشت" کا ایک پہلو " ادبی تاریخ" ہے۔اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت بنگلہ دیش کے اکثر علاقوں میں اردو اور فارسی شعر وادب اچھا خاصا چرچا تھا۔

ڈھاکہ کی ادبی محفلوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے کہ یہاں شعر وشاعری کا بڑا چرچا تھا اور محفل مشاعرہ منعقد ہوتی تھی۔ڈھاکہ کے نامی شعراء میں شیخ احمد خان عطشؔ، حکیم حسن مرزا حقؔ، خواجہ عبدالرحیم صباؔ ،اور خواجہ عبدالغفار اخترؔ تھے اور مولوی واحد علی مخمورؔ، حکیم حیدر علی بن حکیم قربان علی، منشی وارث علی صاحب، احمد حسن وافرؔ اور منشی عبدالغفور زائرؔ، ناسخؔ صاحب کے شاگردوں میں سے تھے۔ڈھاکہ میں قیام کے دوران زمین دار منشیءدلاور علی صاحب نے ناسخؔ کو محمد جان قدسی (وفات ۱۰۵۶ھ) کی مندرجہ ذیل غزل پر غزل لکھنے کی فرمائش کی۔

دارم ولی چہ دل صد گونہ حرمان در بغل
چشمی وخون در آستین اشکی وطوفان در بغل

ناسخ نے اس فرمائش کی تکمیل کی ۔

سلہٹ میں حکیم اشرف علی مستؔ اور ناظر محمد عبداللہ آشفتہؔ اردو کے اچھے شعراء تھے۔ ناظر محمد عبداللہ آشفتہؔ نے سلہٹ کی چائے کی تعریف میں ایک مثنوی لکھی سلہٹ کے قیام کے دوران مولوی نصیر الدین حیدر سامیؔ نے "پشہ نامہ" لکھا جہاں مچھروں کی بہت کثرت ہے۔ بنگلہ دیش کے علاوہ انہوں نے مٹیا برج، دہلی اور لکھنو کی ادبی محفلوں اور منعقدہ مشاعروں کا بھی ذکر کیا ہے۔دہلی میں قیام کے دوران ان کی ملاقات اساتذہ وقت جیسے مرزا اسد غالب، الطاف حسین حالی اور نواب محمد مصطفی خان شیفتہؔ جیسے لوگوں سے ہوئی۔

ناسخؔ نے بعض علاقوں کے مشہور پھلوں کا بھی ذکر کیا ہے۔مثلاً بنگال کا امرت ساگر، سلہٹ کے کینو لیموں، چائے عشبہ، چوب چینی اور اناناس، الہ آباد کے امرود اور لکھنو کے خربوزے وغیرہ۔

زبان واسلوب بیان:۔"خودنوشت سوانح حیات ناسخ" بزبان اردو لکھی گئی ہے۔زبان نہایت سادہ وعام فہم ہے۔

اشاعت: "خودنوشت سوانح حیات ناسخ" کا مخطوطہ بہت عرصے تک ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی لائبریری میں پڑا تھا۔اس کی صحیح سن تصنیف کا پتہ نہیں چلتا مگر اس کا ذکر ناسخؔ نے "ارمغانی" کے سرورق میں کیا تھا۔اور ارمغانی کا سن ترتیب ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء اور سال اشاعت ۱۳۰۴ھ مطابق نومبر ۱۸۸۶ء ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ ناسخ کی سوانح

عمری تکمیل کے آخری مراحل میں تھی اور چھپنے کے قریب تھی کہ شاید وقت نے انہیں مہلت نہ دی۔اوراس وقت سے اسی حالت میں پڑی تھی کہ اس کتاب کو مولانا آزاد کالج ،کلکتہ میں ادبیات فارسی کے استاد عبدالسبحان نے مقدمے کے ساتھ ۱۹۸۶ء میں ایشیاٹیک سوسائٹی کلکتہ سے چھپوایا۔

تحفۂ محبوب سبحانی

تعارف: ''تحفۂ محبوب سبحانی'' کے مصنف شاہ خلیل الرحمٰن صاحب ہیں۔اس رسالے سے اس خاندان کا شجرۂ نسب معلوم ہوتاہے۔جس میں صفحات کی تعداد ۵۳ ہے۔

تاریخی اہمیت: اس رسالے کی تاریخی اہمیت اس قدر ہے کہ اس کے مطالعے سے شاہ خلیل الرحمٰن صاحب کے آباءواجداد کی ہندوستان آمد،انیسویں صدی کے بنگلہ دیش میں ان کا ورود اورنواکھالی میں بودوباش اختیار کرنے کی تفصیلات کا پتہ چلتا ہے۔شاہ خلیل الرحمٰن کے والد کا نام حاجی شاہ تمرالدین ملاخوندکار اور دادا کا نام شاہ نعیم الدین ملاخوندکار تھا۔ان کے آباو اجداد میں ایک فرد شاہ شمس الدین تبریزی مع اپنے فرزند شاہ موسیٰ کاظم اور اپنے والد شاہ سداد اور چچا شاہ سیدو اور اپنے فرزند شاہ موسیٰ کاظم اور دیرافراد خانہ کے ساتھ ۷۵۵ھ/ ۱۳۵۴ء میں تبریزی سے سمرقند ہوتے ہوئے بعہد شاہ فیروز ، دہلی تشریف لائے اور جناب سید احمد تنوری توکلی عرفہ شاہ میران کے ہمراہ بنگال روانہ ہوئے کہ راستے میں شاہ شمس الدین نے انتقال فرمایا۔بعدازاں اس خاندان کے ایک اورفرد مولانا علاءالدین ملا بعہد شاہ عالم گیر اول ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۵ء میں برائے ہدایت خلق بنگال روانہ ہوئے اورنواکھالی میں بمقام زبورا

اوراس کے بعد دیگولی تشریف لے گئے۔جواس وقت ملاباڑی کے نام سے مشہور ہے۔بعدازاں شاہ خلیل الرحمٰن کے والد شاہ ثمیرالدین نے ترک مکان اختیار کر کے جامیرتلی میں سکونت اختیار کر لی۔مگراپنے پیر مولانا امام الدین صاحب کے حکم پر نندن پور رہنے کا ارادہ ک لیا۔اوروہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

زبان و اسلوب بیان: رسالہ کی زبان اردو ہے۔جونہایت سہل اور عام فہم ہے۔

اشاعت: یہ رسالہ ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۵ء میں مطبع قیومی واقع کانپور سے شائع ہوا۔

داستان عبرت بار

''داستان عبرت بار'' مولانا عبیداللہ عبیدی (۱۸۸۵۔۱۸۳۴) کی لکھی ہوئی سوانح عمری ہے۔یہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔صفحات کی تعداد ۱۵۵ ہے۔

تاریخی اہمیت:''داستان عبرت بار''مولانا عبیداللہ عبیدی کی حالات زندگی ہے مگر اس ضامن میں انیسویں صدی کے کچھ سماجی حالات اور تعلیمی کیفیات بھی قلم بند ہو گئے ہیں۔

ابتداء میں مصنف نے اپنی راد بوم۔اپنی پیدائش،بچپن کے حالات کمسنی میں ماں کی وفات، اس کے بعد اس خاندان کا نقل مکانی کر کے میدنی پور چلے آنا۔مولانا عبیداللہ کی ابتدائی تعلیم، ان کا پٹاس پور، ہوگلی اور جہان آباد میں مذکور ہے۔اس کے بعد وہ کلکتہ چلے آئے کلکتہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس زمانے میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کے علاوہ یہودی، ارمنی ، پارسی ، میمنی ، عربی ، چینی وغیرہ بہت سی قومیں آباد تھیں۔[16] کلکتہ میں اس وقت گھریلو سطح پر طالب علم کا شاگردوں کے پڑھانے کے طریق کار کو جاگیر کہتے تھے۔اس کی دو

اقسام تھیں۔ایک ظرفیہ دوسری شرطیہ۔اس کی وضاحت کرتے ہوئے عبیداللہ کہتے ہیں:

نخستین آنست کہ طالب علم را جائے سکونت و خور و پوش
بدون شرط کدامی خدمت حاصل آید و دو میں آنکہ دران
صاحب خانہ شرط خدمتی مثل تعلیم طفلان با نوشتہ حساب و
غیرہ برذمہ آں طالب العلم محول کند دریں صورت دربعض جا
علاوہ مونت مصارف خور و پوش چیزی از نقدھم بطریق
مشاہرہ باومید ہند۔

کلکتہ میں رہتے ہوئے عبیداللہ کی ملاقات مولانا رشید النبی وحشت سے ہوئی جو اس وقت کلکتہ میں ہی مقیم تھے۔ان سے انہوں نے اپنی شاعری میں اصلاح لی اور فلسفیانہ علوم میں مدد کے لئے مولوی عبدالرحیم معروف بہ دہری کے پاس جاتے تھے۔جو ریاضی ،طبیعات اور ہیئت قدیم وجدید میں یدطولی رکھتے تھے۔عبیداللہ نے مولوی عبدالرحیم کی زندگی اور کارناموں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

کلکتہ میں مولوی عبدالرؤف وحید کی زیرادارت فارسی اخبار دوربین کا نکلنا اور ان کی برکت سے فارسی شعروشاعری کا چرچا اور مولوی عبداللطیف کے زیراہتمام مجلس مذاکرہ علمیہ کی بنا اور مجلس مذاکرہ کے لئے رسالہ اور اس کے ان کا مضامین لکھنا مذکور ہے۔ٹیپو سلطان کے بیٹوں شاہزادہ محمد جلال اور بشیر الدین کا بھی ذکر ہے۔

۱۴ مارچ ۱۸۶۵ میں ہوگلی میں ہوگلی کالج کے پروفیسر کے حساب سے عبیداللہ کا تقرر اور وہاں مولانا کرامت علی اور امیر علی سے ملاقات اور علمی بحث ومباحثہ کا ذکر ہے۔ ہوگلی قیام کے دوران ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ حاجی محمد محسن فنڈ سے جو بچپن ہزار روپیہ اساتذہ کی تنخواہ کے

صرف کیا جاتا تھا۔ اسے بنگال کے لفٹنٹ سے منظور کرایا۔مزید فیصلہ کیا گیا کہ منظور شدہ روپیہ سے ڈھاکہ،راجشاہی اور چٹاگانگ میں مدرسے قائم کئے جائیں۔

چنانچہ ڈھاکہ مدرسہ کے سپرنٹنڈنٹ کے حساب عبیداللہ کی ڈھاکہ آمد کا بیان ہے۔ ڈھاکہ کا ذکر انہوں نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

ایں شہراست نیکوآباد۔ازمیان شہرہای بنگلہ ماعدای کلکتہ کدامی ہمال
این شہرنیست ۔ درشمال ومغرب جانب ایں شہرآثار ابنیہ قلاع و
دساگرفرمانروایان پیشین اسلامیہ ہنوز مشاہدہ می شود وایں بیت عرفی
رابیاد می آرد۔

ازنقش ونگار درودیوارشکستہ
آثار پدیداست صنادید عجم را۔[17]

ڈھاکہ مدرسہ کا افتتاح ۱۶ مارچ ۱۸۷۴ء میں ہوا۔ پھر مدرسہ کو دوحصوں یعنی عربی ڈیپارٹمنٹ اور ایک حصہ انگریزی پڑھنے والوں کے لئے منقسم کیا گیا۔ڈھاکہ رہنے کے تجربات میں یہاں عمائدین شہر سے ملاقات اور شعروشاعری کی محفلوں کے انعقاد کے ذکر ساتھ ” داستان عبرت بار“ کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

چنانچہ” داستان عبرت بار“ عبیداللہ عبیدی کی نجی زندگی کا ایک آئینہ ہے جس میں انہوں نے اپنے حالات طفولیت، بھائی بہن، بیٹے بیٹوں،ازواج کا ذکر اپنے والد کی صورت وسیر ت نگاری،مشاہیر زمانہ سے ملاقات،اساتذہ کا ذکر،عربی انگریزی، بنگلہ اور سنسکرت کا سیکھنا، ابتدائی شعر گفتن، اپنی تصنیف تالیف،مختلف اخباروں کا نامہ نگار اور قانونی مسودات کا مترجم ہونا،تلاش نوکری، اپنی نوکری کے زمانے کے تجربات،غرض کہ اپنی زندگی کے مختلف گوشوں

ہمیں روشناس کرایا ہے۔

زبان واسلوب بیان: ''داستان عبرت بار'' فارسی زبان میں لکھی ہوئی ہے انداز بیان دلکش ہے۔مگر زبان عربی آمیز ہے۔جگہ جگہ فارسی اشعار استعمال بھی کیا ہے۔

اشاعت: ''داستان عبرت بار'' ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔اس مخطوطے کی ایک کاپی ڈھاکہ یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔جو نستعلیق حروف میں لکھی ہوئی ہے۔'' داستان عبرت بار'' کو عبیداللہ نے ۱۸۷۹ء میں لکھنا شروع کیا تھا۔اور اس کا اختتام ۱۶مئی ۱۸۸۰ء بروز اتوار ہوا۔عبیداللہ کے ایک شاگرد حمید میاں عبدل لطیف حسینی نے اس کی نقل اتاری تھی جو ڈھاکہ مدرسہ میں ان کے ہردلعزیز شاگرد تھے۔[۱۸]

'' داستان عبرت بار'' کے متعلق حکیم حبیب الرحمٰن لکھتے ہیں:۔

> '' داستان عبرت بار'' مولانا عبیداللہ العبیدی نوراللہ (مرقدہ) کی خودنوشت سوانح عمری، خاندانی حالات، تعلیم وتربیت مشاغل علمی اور تصانیف کا ذکر نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ فرمایا ہے۔ ۱۸۸۰ء تک کے حالات ہیں۔ یہ سوانح عمری مولانا نے نواب سراحسن اللہ مرحوم کے اصرار سے لکھی ہے۔یہ اگرچہ مولانا مرحوم کی سوانح زندگی ہے لیکن سچ پوچھیے تو گذشتہ صدی کے بنگال کے علمی حالات کا آئینہ ہے۔اور باوجود افلاس ونکبت، علمی جدوجہدی کی روئداد۔'' [۱۹]

حوالہ جات

۱۔ خودنوشت سوانح حیات نساخ، ص ۶۴

۲۔ ایضاً، ص ۶۴

۳۔ ایضاً، ص ۶۴

۴۔ ایضاً، ص ۸۶

۵۔ ایضاً، ص ۱۴۴

۶۔ ایضاً، ص ۱۵۵

۷۔ ایضاً، ص ۱۶۳

۸۔ ایضاً، ص ۱۶۴

۹۔ ایضاً، ص ۱۶۴۔۱۶۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۶۵

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۷۸

۱۲۔ ایضاً،ص ۱۶۵

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۷۸

۱۴۔ ایضاً، ص ۹۷

۱۵۔ نساخ، ص ۹۵

۱۶۔ داستان عبرت بار، ص ۲۳

۱۷۔ داستان عبرت بار ،ص ۱۳۲

۱۸۔ داستان عبرت بار ،ص ۱۵۵

۱۹۔ مجلّہ کتاب شناسی (ثلاثہ غسالہ حصہ فارسی) (اسلام آباد، ادارۂ معارف نوشاہیہ ۱۹۸۸ء) ص ۳۵۔۳۴

اختتام

''بنگلہ دیش کے فارسی اردو ادب میں تاریخی ماخذ۔انیسویں صدی'' لکھتے ہوئے مجھے ذاتی طور پر یہ تجربہ حاصل ہوا کہ فارسی اور اردو کی خدمات انجام دینے میں بنگال بھی برصغیر کے دوسرے کسی علاقے سے کم نہیں۔اختیار الدین بن بختیار نے بنگال میں مسلم حکومت کی بنیاد ڈالی اور اس وقت بنگال کا راجہ لکشن سن مسلمانوں کی آمد کی خبر پا کر فرار ہو گیا اور بنگال مسلمانوں کے ہاتھ چلا آیا اور اس کے بعد مسلم فاتحین کے قدم بنگال میں مضبوطی سے جم گئے۔اکثریت نے اسلام قبول کرلیا۔اور اس کے ساتھ فاتحین کی زبان جو فارسی تھی وہ بھی عوام میں مروج ہوگئی کیونکہ سرکاری اور درباری زبان کی حیثیت سے فارسی کو سیکھنا سب فرض منصبی سمجھتے تھے۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی اس زبان کو سیکھنے میں اپنی دلچسپی ظاہر کرتے ہیں۔اور اس دور میں کچھ تصنیف وتالیف کا کام بھی کیا۔

لیکن فارسی کا اثر مغلیہ عہد میں زیادہ پھیلا۔مغل سپاہ نے پورے بنگال کو اپنے تحت لانے کے لئے جگہ جگہ لشکر کشی کی اور اپنے ساتھ فارسی زبان کو بھی لیتے جاتے۔جہاں ان کے قدم جمتے فارسی اپنا رسوخ بڑھاتی جاتی مغلیہ عہد میں بنگال میں فارسی کا اثر اتنا پڑھا کہ سید محمد سلطان، نصر اللہ خان، محمد خان، حاجی محمد، شیخ مطلب ان میں ہر ایک کو بنگلہ زبان کے

ذریعے تبلیغ اسلام کرنے میں دقتیں پیش آئیں۔سید سلطان کو تو'' قریبی'' اور ''سیاہ کار'' کہہ دیا۔اس زمانے میں قدامت پسند طبقے نے ایک تحریک شروع کردی تھی۔جس کا مقصد

اس بات کی مخالفت تھا کہ ہندوؤں کی زبان (بنگالی) میں اسلام کی باتیں بیان نہ کی جائیں۔ شاعر عبدالحکیم کے زمانے میں یہ تحریک اپنے پورے شباب پر تھی۔ورنہ شاعر نے اپنے مخالفوں کے لئے ایسے سخت لفظ استعمال نہ کئے ہوئے۔ جیسا کہ ان کی ایک نظم میں ان اشعار میں پائے جاتے ہیں:

خدا اپنے سب بندوں کی بولی سمجھتا ہے
وہ ہندوؤں کی زبان سے بھی واقف ہے
اور بنگالیوں کی زبان بھی سمجھتا ہے
مجھ ان لوگوں کی ولایت میں شبہ معلوم ہوتا ہے۔
جو پیدا تو بنگال میں ہوئے اور بنگلہ زبان سے نفرت کرتے ہیں۔
اگر وہ زبان نہیں سیکھنا چاہتے۔
تو وہ کیوں نہیں اس ملک کو چھوڑ کر کسی دوسرے دیس میں چلے جاتے۔ان کے والدین اور آبا و اجداد بنگال میں رہے۔یقیناً بنگلہ زبان کے ذریعے تبلیغ کا اخلاقی اثر زیادہ ہوتا ہے۔[1]

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ سترہویں صدی کے اواخر میں بنگالی زبان کے استعمال ''خدا کی ناراضگی کا خوف'' لوگوں کے دلوں پر طاری تھا۔

چاٹگام کے شاعر عبدالنبی نے'' امیر نامہ'' ۱۰۹۶ھ/۱۶۸۴ میں تصنیف کی۔اس کا رسالہ فارسی تصنیف ''داستان امیر حمزہ'' سے ماخوذ ہے۔چنانچہ کہتے ہیں:

لوگوں کو بڑی پریشانی تھی کیونکہ سارے بنگالیوں کو فارسی نہیں آتی تھی۔بعض تو سمجھ لیتے تھے بعض نہیں سمجھتے تھے۔اس کہانی کا تعلق

ایک مسلمان سے ہے۔ اس لئے میں ڈرا کہ کہیں خدا مجھ سے خفا نہ
ہو جائے کہ میں بنگلہ زبان میں یہ کہانی کیوں لکھی لیکن عوام کو چونکہ
اس کہانی سے فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ اس لئے میں نے نڈر ہو کے لکھنے
کا فیصلہ کر ہی لیا۔[۲]

چنانچہ مندرجہ بالا بیانات سے بنگال میں فارسی کے اثرات اور اس کا قبول عام صاف ظاہر ہوتا ہے۔

اس مقالے کے باب اول میں ''بنگلہ دیش :ایک مختصر تعارف'' ہے کہ پڑھنے والا شروع سے ہی بنگلہ دیش، اس کا وجود میں آنا، اس کا حدود اربعہ، زمین، اس کی ساخت، زبان و بیان ، یہاں کے باشندے، اس کی معاشی و صنعتی ترقی سے متعارف ہو جاتا ہے۔

دوسرا باب: ''بنگال میں فارسی ادب'' کی ایک مختصر سی تاریخ ہے۔

یہ بنگال میں فارسی کے عروج ، ارتقا اور زوال کی ایک داستان ہے۔ اس باب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ فارسی نے کیوں کر اس علاقے میں قدم جمائے۔ لوگوں کے دلوں میں گھر لیا۔ اس میں تصنیف و تالیف کے کتنے کام ہوئے۔ یہ باب ایک واضح تاثر پیدا کرتا ہے کہ فارسی زبان کا یہاں کتنا گہرا اثر تھا اور لوگوں کو اس زبان سے کتنا دلی لگاؤ تھا۔ ورنہ عام طور پر لوگ یہی سمجھتے رہے ہیں کہ بنگال جو دلی اور لکھنو سے کتنا دور افتادہ علاقہ ہے یہاں فارسی کا اثر پذیر ہونا ناممکن سی بات ہے۔'' باب اول'' ''زبان فارسی خیلی شیرین است'' اس مقولے کی اصلیت اور حقیقی ہونے پر واضح دال ہے۔ اگر چہ انگریزوں کی ہندوستان آمد نے فارسی کی مقبولیت میں کمی پیدا کر دی اور اپنی انتظامی اور سیاسی ضروریات کے تحت انہوں نے فارسی زبان کی ادبی اور سماجی حیثیت کو ختم کر دیا۔ جس کے نتیجے میں انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں اس کا اثر یکسر منسوخ ہو گیا۔

تیسرا باب: ''بنگال میں اردو ادب'' کی تاریخ ہے۔ اس باب کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ فارسی کی مانند اردو کو بھی اس علاقے میں قبول عام حاصل تھا۔ اردو زبان میں وہ قوت جاذبہ ہے جس نے اس زبان کو اس علاقے کی شیریں، وسیع اور آسان بات چیت کا ذریعہ بنا دیا۔ بنگال میں اردو کہ ہمہ گیری اور ہر دل عزیزی سے انکار کرنا ایسا ہی ہے جیسے یہ کہنا کہ سورج میں نہ تو روشنی ہے اور نہ گرمی۔

اگر چہ بنگال میں اردو ادب کی اصل ترقی فورٹ ولیم کالج کی ابتدا سے ہوتی ہے چنانچہ اردو ادب کی تاریخوں میں فورٹ ولیم کالج کا ذکر تو ضروری ملتا ہے مگر کسی بھی ادبی تاریخ اور تذکرے میں بنگال میں اردو زبان و ادب کی خدمت کرنے والوں کا سرسری سا بھی ذکر نہیں ملتا۔ کیونکہ تاریخ و تذکرے لکھنے والوں کا یہ گمان غالب رہا ہے کہ بنگال میں اردو کا کبھی رواج ہی نہیں رہا۔ اگر اس کا چلن رہا بھی تو صرف اس قدر کہ اس علاقے میں اسے ایک بولی کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہاں اسے کبھی ادبی مرتبہ حاصل نہیں ہوا۔ مگر میں نے اس باب میں مختصر طور پر یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے اردو زبان کلکتہ، مرشد آباد، ہوگلی، مٹیا برج، ٹالی گنج، ڈھاکہ، سلہٹ، چٹا گانگ اور بنگال کے دیگر علاقوں میں نہ صرف مروج رہی ہے۔ بلکہ اس علاقے میں بہت سے ادبی پاروں نے بھی جنم لیا ہے۔ اس حصے اردو کو جو ادبی حیثیت حاصل رہی ہے اسے لکھنے کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ ان چند صفحوں میں ان کو سمو دینا ممکن نہیں۔ یہ ایک ہمہ گیر موضوع ہے۔

چوتھا باب: ''بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں سیاسی تاریخ کے ماخذ'' ہے۔ اس باب میں انیسویں صدی میں اردو و فارسی زبان میں لکھی گئی تیرہ تاریخ کی کتابوں کا تذکرہ ہے۔ ان کتابوں کا موضوع ڈھاکہ، چٹا گانگ، بنگلہ دیش کل ہندوستان بلکہ کل عالم کی تاریخ

ہے۔'' جنگ ہفت سالہ'' میں امریکہ کی جنگ آزادی کی مختصر سی تاریخ ہے۔'' گنج تواریخ'' ، ''کنز التواریخ'' اور'' ریاض النور'' میں مشاہیر کی تاریخ وفات درج ہیں۔

پانچواں باب: اس میں سماجی تاریخ ہے۔اس باب میں دس کتابیں اور کتابچے شامل ہیں۔ جن میں ناول، ڈرامہ، روئداد، مثنوی اور قصیدہ مختصر یہ کہ ہر صنف سخن پر لکھی کتاب درج ہے۔ اس باب سے پتہ چلتا ہے اہل بنگلہ دیش کو ہر صنف پر دخل حاصل تھا۔ بنگلہ دیش میں اردو فارسی لکھنے والے تعلیم نسواں، انگریزی تعلیم، جدید علوم فنون، سائنس کی ترقی اور ہندوستان میں اس کے اثرات سے باخبر تھے۔اور ان میں سماجی بیداری کا اچھا احساس تھا۔

چھٹا باب: مذہبی تاریخ ہے۔اس ضمن میں ستائیس کتابیں زیر بحث آئی ہیں۔اس باب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انیسویں صدی میں بنگلہ دیش میں مذہبی معاملات میں لوگوں میں کافی اختلاف رائے تھا۔اس سلسلے میں کافی تنازعات پیدا ہوئے تھے۔خصوصاً مولانا کرامت علی اور ان کے مخالف جناب دودو میاں کے درمیان ہندوستان کا دار الحرب اور دار الامان ہونا، جمعہ اور عیدین کی نماز پڑھنا اور اس کا فرض ہونا نہ ہونا کے بارے میں بحث و مباحثہ ہوا کرتے تھے۔انیسویں صدی میں بنگلہ دیش میں مذہبی معاملات کی کتابیں زیادہ تر اردو میں لکھی جاتی تھیں۔ کیونکہ اس زمانے میں برصغیر میں دینی علم حاصل کرنے اور دین کی اشاعت کے لئے علماء اور طلباء ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں جاتے تھے تو ایک دوسرے سے رابطہ پیدا کرنے کے لئے ایک مشترک زبان کی ضرورت تھی اس کے لئے اردو ہی موزون اور سب سے قابل قبول زبان سمجھی جاتی تھی۔اس لئے ہمارے بنگال کے علماء اور بزرگان دین نے مسلمانوں کی فلاح اور بہبود اور ملت کی رفاہ کو اپنا مقصد اور منتہا بنا کر تمام مدارس دینی کا ذریعہ تعلیم اردو ہی کو رکھا۔ اس کے علاوہ عربی اور فارسی کے بعد اردو ہی

ہندوستان کی ایسی زبان تھی جس میں تمام دینی علوم کے خزانے اصل یا ترجمہ کی شکل میں موجود تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا کرامت علی نے مذہبی معاملات کی کتابیں لکھنے کے لئے زیادہ تر اردو زبان ہی کا سہارا لیا ہے۔

ساتواں باب: ادبی تاریخ ہے۔اس میں زیادہ تر نساخ کے لکھے ہوئے ادبی تذکرے شامل ہیں۔ بنگال کے اردو و فارسی ادب پر نساخ نے جو احسانات کئے ہیں وہ ہمیشہ امر رہیں گے۔ کیونکہ برصغیر کی ادبی دنیا میں نساخ وہ واحد شخص ہیں جنہوں نے بنگال پر قلم اٹھایا۔انہوں نے معروف وغیر معروف لکھنے والے کو صفحہ قرطاس پر اٹھایا اور اس سے ہمیں متعارف کرایا۔اور یہ ثابت کر دکھایا کہ انیسویں صدی میں بنگال میں اردو فارسی لکھنے والوں کی کمی نہ تھی۔اور یہ مقام حیرت ہے کہ اس صدی میں اردو فارسی لکھنے والوں کو اتنا قبول عام حاصل تھا۔

آٹھواں باب: شخصی تاریخ ہے اس باب میں خود نوشت سوانح عمریاں شامل ہیں۔جس سے لکھنے والے کے ذاتی حالات و کردار اور اس ضمن میں اس زمانے کے کچھ سماجی، معاشرتی، تعلیمی و ادبی کوائف بھی قلم بند ہو گئے ہیں۔ کیونکہ ادب سماج کی زندگی کا آئینہ ہے۔''فن کار، آئینہ ساز اور اس کا فن آئینہ خانہ ہے۔'' اس آئینے میں زندگی کے گونا گوں گوشوں اور زاویوں کا عکس نظر آتا ہے۔

آخری حصہ: کتابیات پر مشتمل ہے۔ان میں وہ کتابیں شامل ہیں جس سے میں نے مقالہ لکھتے وقت حوالے لئے ہیں اور وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو مقالہ لکھنے میں سہولت پیدا کرنے کے لئے میرے زیر مطالعہ رہیں اور جنہوں نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔

تمت بالاخیر

کتابیات

(اردو، فارسی اور عربی)

☆(الف)☆

آفتاب اصغر، دکتر : تاریخ نویسی در ہندو پاکستان، لاہور خانہ، فرہنگ جمہوری اسلامی ایران ۱۳۶۴ھ

ابراہیم میر سیالکوٹی : تاریخ اہل حدیث، لاہور، اسلامی پبلیشنگ کمپنی، 1951ء

ابوالفضل فیاضی رنگپوری : صولت عالمگیری (سن اشاعت ومقام اشاعت درج نہیں)

ابویحیی امام خان : ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات، دہلی برقی پریس، ۱۹۶۷

ابواللیث صدیقی : لکھنؤ کا دبستان شاعری، دہلی، ادبی دنیا، ۱۹۵۰

اجیرالدین مولوی : ریاض النور، کانپور، نظامی پریس، ۱۲۹۹ء

احتشام حسین : داستان اردو، کراچی الکتاب ۱۹۶۵ء

احسن فاروقی : اردو ناول کی تنقیدی تاریخ لکھنو، دانش محل، ۱۹۵۱ء

احتشام حسین : اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، نئی دہلی، ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۳ء

احمد علی، احمد آقا : ہفت آسمان، کلکتہ، بپٹسٹ مشن پریس ۱۸۹۳ء

: موئد برہان، کلکتہ، مظہرالعجائب پریس، ۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۵ء

: رسالہ ترانہ، کلکتہ بپٹسٹ مشن پریس ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء

: شمشیر تیز تر، کلکتہ غلامی نبی خان پریس ۱۸۶۸ء

رسالہ مختصر الاشفاق، کلکتہ بشیری پریس ۱۸۷۱ء

احمد فاروقی : اردو میں وہاب ادب، دہلی شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، ۱۹۶۹

احسن اللہ شاہین خواجہ : کلیات شاہین، ڈھاکہ

احمد حسین وافر : بیمار بلبل، مطبع محمدی ۱۸۶۸ء

اختر اورینوی داکتر : بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا، پٹنہ، لیتھو پریس ۱۹۵۷ء

اسداللہ غالب : اردو معلیٰ کان پور مجیدی پریس، ۱۹۶۶ء

اسماعیل محمد مرزا جان طپش : بہار دانش، لاہور مجلس ترقی ادب۔ ۱۹۶۳ء

اعجاز حسین سید : مختصر تاریخ ادب اردو، الہ آباد، انڈین پریس، لمیٹڈ، ۱۹۴۰ء

اقبال عظیم : مشرقی بنگال میں اردو، ڈھاکہ مشرق کوآپریٹو پبلیکیشنز ۱۹۵۴ء

اکرام سید : آب کوثر، لاہور سنز، ۱۹۶۶ء

: رود کوثر، لاہور فیروز سنز، ۱۹۶۸ء

: موج کوثر، لاہور فیروز سنز ۱۹۶۷ء

: ارمغان پاک، کراچی پاکستان پبلیکیشنز ۱۹۵۹ ء

: دربار ملی، لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۱ء

الطاف حسین حالی : یادگار غالب، لاہور بابر پرنٹنگ پریس، ۱۹۶۸ء

: مقدمہ شعروشاعری، دہلی کتب خانہ علم وادب، ۱۹۵۰ء

الہ بخش حامد، مجموعہ دار : تحفۃ المحسنین، کوملا، ۱۹۶۹ ء

امیر علی نواب : امیر نامہ، کلکتہ، ۱۸۹۰ء

: وزیر نامہ، کلکتہ، مظہر العجائب پریس، ۱۸۷۱ء

: بیرنگ نامہ، کانپور، نظامی پریس ۱۸۹۵ ء

امیں الحق اسلام آبادی : دافع الشبہات فی جواز الاستجارت علی الطاعات

الطاف فاطمہ : اردو میں سوانح نگاری کا ارتقا۔

انشاء اللہ خان : داستان رانی کیتکی، اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۳ء

: دریائے لطافت، لکھنو، الناظر پریس، ۱۹۶۰ء

انصار ابوالفیض سحر : خسروشناسی، دہلی نیشنل بوک ٹرسٹ انڈیا، ۱۹۷۵ ء

انعام الحق : مسلم بنگالی ادب، کراچی، ادارۂ مطبوعات، پاکستان ۱۹۵۷

☆ب☆

باقر محمد سید : دیوان باقر، کلکتہ، ۱۸۹۱ء

برہان اللہ شاہ قادری : دیوان برہان، کلکتہ، ہادی پریس، ۱۸۹۹ء

: برہان العارفین، کلکتہ، ہادی پریس، ۱۸۹۹ء

: مخزن حقیقت (حصہ اول) کلکتہ ہادی پریس، ۱۸۹۹

: مخزن حقیقت (حصہ دوم) کلکتہ ہادی پریسی، ۱۹۰۰ء

بھٹاچاریہ شانتی رنجن : بنگال میں اردو، لکھنو، نصرت پبلیشرز ۱۹۸۶ء

☆ت☆

تاراچند رڈاکٹر : تاریخ تحریک آزادی، نئی دہلی، ترقی اردو، بیرو، ۱۹۸۰ء

مترجم (قاضی محمد عدیل عباسی) بیرو، ۱۹۸۰ء

تنہا محمد یحیی : سیر المصنفین، لاہور، شیخ مبارک علی، ۱۹۴۸ء

☆ث☆

ثناء اللہ ندوی : عبدالقادر جیلانی، لاہور، شیخ علی اینڈ سنز، ۱۹۶۲ء

☆ ج ☆

جالیسی جمیل : تاریخ ادب اردو، دہلی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس ۱۹۷۷ء

جان طپش مرزا : بہار دانش، لاہور مجلس ترقی ادب ۱۹۶۳ء

جاوید نہال ڈاکٹر : بنگال کا اردو ادب، کلکتہ عثمانیہ بک ڈپو، ۱۹۸۴ء

☆ ح ☆

حافظ شیرازی : دیوان حافظ، لاہور شیخ مبارک علی، ۱۹۶۰ء

حافظ حسین قادری : داستان تاریخ اردو، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۶ء

حامد علی خان : تاریخ واجد علی شاہ، لکھنو، نولکشور، ۱۸۹۶ء

حبیب الرحمٰن حکیم : ڈھاکہ پچاس برس پہلے، لاہور کتاب منزل، ۱۹۴۹

: آسودگان ڈھاکہ، ڈھاکہ امدادیہ لائبریری، ۹۶۰ء

حسین ابراہیم خان : مسلمانوں کی سیاسی تاریخ، لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۵۹ء

حسین برنی، سید : تمہید مثنوی قران السعدین خسرو، علی گڑھ، مطبع انسٹی ٹیوٹ ۱۸۱۷ء

حافظ ہوشیاری پوری : مشرقی پاکستان کے اردو ادیب، کراچی، پاکستان پبلیکشنز ۱۹۵۹ء

حمید اللہ خان بہادر : احادیث الخوانین، کلکتہ مظہر العجائب پریس 1891 ء

حمید اللہ ڈاکٹر : تاریخ الاسلام، کراچی فیروز سنز، ۱۹۵۳ء

☆ خ ☆

خلیل الرحمٰن شاہ قادری نندن پوری : تحفۂ محبوب سبحانی، کان پور پریس، ۱۳۴۴ھ ، ۱۹۲۵ء

: صحیح شمس العارفین، کان پور رزاقی پریس، ۱۳۱۷ھ ۱۸۹۹ء

: فتویٰ شوکت محبوب سبحانی، کان پور، قیومی پریس، ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۱ء

: مقامات محبوب سبحانی، کانپور، قیومی پریس

☆ ذ ☆

ذبیح اللہ صفا : تاریخ ادبیات در ایران (فارسی) تہران، دانشگاہ ۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۲ء

ذکاء اللہ خان بہادر : تاریخ ہندوستان، علی گڑھ، مطبع انسی ٹیوٹ، ۱۹۱۹ء

☆ ر ☆

رام موہن رائے راجہ : تحفۃ الموحدین، کلکتہ، سدھارن برہم ساز، ۱۹۵۰ء

رام بابو سکسینہ : تاریخ ادب اردو، لکھنو، مطبع نولکشور، ۱۹۵۵ء

رضا زادہ شفق : تاریخ ادبیات ایران، تہران، وزارت فرہنگ، ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء

رئیس احمد جعفری : واجد علی شاہ اور ان کا عہد، لاہور، کتاب منزل، ۱۹۵۸ء

رحمان علی طیش : تواریخ ڈھاکہ، آرہ، سٹار آف انڈیا پریس، ۱۹۱۰ء

: گلزار نعت، کانپور، مطبع نظامی ۱۸۶۸ء

رحیم اللہ : رکن اعظم، لکھنو، مطبع نولکشور، ۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۰ء

☆ ز ☆

زین العابدین : حیات ویسی، کلکتہ، ۱۹۲۵ء

☆ س ☆

سراج الدین ظفر : صحیفۂ ادب لاہور، فیروز سنز

سلیم اللہ منشی : تواریخ بنگالہ، ڈھاکہ، ایشیاٹیک سوسائٹی، ۱۹۷۱ء

سہروردیہ بیگم : کوکب دری، کلکتہ ۱۹۳۵ء

سید ہاشمی سید : تاریخ ہند، دکن، جامعہ عثمانیہ، ۱۹۲۱ء

سیف اللہ محمد : نظم العقائد، پٹنہ مطبع خفیہ ۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۲ء

☆ش ☆

شانتی رنجن بھٹاچاریہ : بنگال میں اردو، لکھنو، نصرف پبلیشنز، ۱۹۷۲ء

شبلی نعمانی : شعرالعجم، اعظم گڑھ، مطبع معارف ۱۹۴۰ء

شجاعت علی : اورنگ عالم گیر پر ایک نظر، لاہور، ثناء اللہ خان اینڈ سنز، ۱۹۶۰ء

: تعارف تاریخ اردو، لکھنو، ادارۂ فروغ اردو، ۱۹۶۳ء

شرف الدین بخاری : نام حق، کان پور، مصطفائی پریس، ۱۲۵۷ھ/ ۱۸۴۱ء

شہید اللہ محمد داکتر : بنگلہ ادب کی تاریخ، ڈھاکہ یونیورسٹی، ۱۹۵۷ء (مترجم عبدالرحمٰن بیخود)

☆☆ص ☆☆

صادق خان قاضی اختر : مثنوی سراپا سوز، لکھنو، ۱۲۳۱ھ / ۱۸۱۵ء

صدر الحق محمد، ڈاکٹر : نساخ حیات وتصانیف، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۰ء

صفدر حیات صفدر : وفات عالم گیر سے وفات ظہر تک، لاہور، ٹپو بک پبلیس، اردو بازار، ۱۹۶۰ء

صدیق حسین خان محمد نواب : شمع انجمن، بھوپال، ریاست بھوپال، ۱۲۹۳ھ/ ۱۸۷۶ء

☆ظ ☆

ظہور الدین احمد ڈاکٹر : پاکستان میں فارسی ادب، لاہور، یونیورسٹی بک ایجنسی ۱۹۶۴ء

: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء

☆ع ☆

عارف نوشاہی، سید : کتاب شناسی، اسلام آباد، ادارۂ معارف نوشاہیہ، ۱۹۸۸ء

عبدالباری آسی : خندۂ گل، تذکرہ

عبدالباطن وابوالبشر : سیرت مولانا عبدالاول جونپوری

عبدالاول جونپوری : رویدادزلزلہ، لکھنو ''مطبع اصح'' ۱۸۹۸ء

عبدالجلیل محمد بسمل : سلہٹ میں اردو، کراچی انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۰ء

عبدالکریم خاکی : رموز اخلاق، کلکتہ، رحمانی پریس، ۱۳۰۶ھ /۱۸۸۸ء

:تنویرالقلوب، کلکتہ، مظہرالعجائب پریس، ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء

: فوادالکلم، کلکتہ، اردوگائیڈ پریس ۱۸۸۷ء

: فوائد خاکیہ، (غیر مطبوعہ)

: مصباح الجنہ (غیر مطبوعہ)

: دیوان خاکی (غیر مطبوعہ)

: چراغ ایمان، کلکتہ، پریس ۱۳۰۶ھ ۱۸۸۸ء

: ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ دہلی، انجمن ترقی اردو، ہند، ۱۹۴۲

عبداللہ محمد، ڈاکٹر : بنگلہ دیشے فارسی ساہتیہ (بنگلہ) ڈھاکہ، اسلامیک

فائنڈیشن، ۱۹۸۳ء

عبدالحق : چمنستان شعراء، اورنگ آباد دکن ۱۹۲۷ء

عبدالحی : گل رعنا، اعظم گڑھ، مطبع معارف، ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء

عبداللہ قریشی : تاریخ اسلام، لاہور شیخ برکت علی اینڈ سنز ۱۹۵۲ء

عبدالکریم ڈاکٹر : بنگلار ایتہاش، (سلطانی عمل) ڈھاکہ، بنگلہ اکاڈیمی ۱۹۷۷ء

عبداللہ ملک : بنگالی مسلمانوں کی صدسالہ جہد آزادی (۱۷۵۷ تا ۱۸۵۷ء) لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۷ء

عبداللہ یوسف علی : ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، کراچی، کریم سنز، ۱۹۶۷ء

عتیق اللہ محمد صدیقی : ہندوستانی اخبارنویسی، انجمن ترقی اردو علی گڑھ، ۱۹۵۵ء

عبدالرشید شہزادپوری : جام توحید، کلکتہ، ستارہ ہند پریس، ۱۹۳۳ء

:تحفہ مجددیہ، ستارہ ہند پریس، ۱۹۳۱

عبدالرحیم گورگھوپری : پندنامہ بہرامی، کلکتہ ۱۸۶۰ء

: کارنامہ حیدری، کلکتہ پٹیسٹ میشن پریس، ۱۸۴۸ء

عبدالرحمٰن : گنج راز، چاٹگام، ۱۵۵۹ء

عبدالرحمٰن کاشغری وعبدالستار: مدرسہ عالیہ کا کتب خانہ

عبدالرحمٰن : احسن الفوائد، کانپور، مطبع نظامی، ۱۸۸۲ ء

عبدالرؤف وحیدی : دیوان وحیدی، کلکتہ، نیم تلا کھاٹ ۱۸۹۱ء

عبدالستار : تاریخ مدرسہ عالیہ ڈھاکہ، مدرسہ عالیہ، ۱۹۵۹ ء

عبدالسلام خورشید : صحافت پاکستان و ہند میں، لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء

: کاروان صحافت ،کراچی، انجمن ترقی اردو ۱۹۶۴ء

عبدالسلام ندوی : شعر الہند، لاہور، عشرت پبلیشنگ ہاوس ۱۹۶۵ ء

عبدالضحیٰ نور احمد : انیسویں صدی میں ڈھاکہ کی سماجی زندگی، ڈھاکہ بنگلہ اکیڈیمی، ۱۹۷۵ ء

عبدالعلی دری : ارمگان احباب، دبدبہ احمد پریس، ۱۸۹۰ء

: صحیفۃ الاعمال و مراۃ الاحوال، کلکتہ، ۱۸۸۸ء

: مصدر فیض محمدی، کلکتہ انوار محمدی پریس، ۱۹۱۰ء

عبدالغفور شہباز : زندگانی بے نظیر، لکھنو، نولکشور، ۱۹۰۰ء

: خیالات شہباز ،کانپور، نظامی پریس، ۱۹۰۰ء

: بتفریح القلوب، کلکتہ ستارہ ہند پریس، ۱۹۴۲ء

عبدالغفور نساخ : سخن شعراء، نولکشور، لکھنو ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۴ء

: نصرت المسلمین فی الرد علی غیر المقلدین ،دہلی، مطبع حامی الاسلام، ۱۸۸۵ ء

: زبان ریختہ لکھنو، نول کشور، ۱۸۵۷ء

: دفتر بے مثال، کلکتہ مظہر العجائب پریس، ۱۸۶۳ء

: اشعار نساخ، لکھنو، منشی نولکشور، ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء

: ارمغان، نظامی پریس کان پور، ۱۸۹۵ ء

: ارمغانی، لکھنو، مطبع نظامی، ۱۸۸۶ء

: کنز التواریخ ،کان پور، نظامی پریس، ۱۸۷۷ء

: قطعۂ منتخب، لکھنو، مطبع نولکشور، ۱۸۸۴ء

: مظہر معماء، لکھنو، بحر العلوم پریس، ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء

: قند پارسی، لکھنو، نولکشور پریس، ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۴

: چشمۂ فیض، لکھنو، نول کشور ، ۱۹۱۴ء

عبدالقادر ملا بدایونی : منتخب التواریخ، لاہور، شیخ غلام علی، ۱۹۶۲ ء

عبدالکریم خاکی : تنویر القلوب، کلکتہ مظہر العجائب پریس، ۱۸۹۹ء

: تذکیۃ القلوب ،نظامی پریس کاپور، ۱۸۸۸ ء

: چراغ ایمان، کلکتہ، رپن پریس، ۱۸۸۸ء

عبدالکریم مولوی : تاریخ ہندوستان

عبدالضعم ذوقی : دبستان دانش،رضوانی پریس کلکتہ، ۱۸۹۱ء
: اخلاق احمدی،اکبر پریس،آگرہ ، ۱۸۹۱ء

عبداللہ عبیدی : دیوان عبیدی (فارسی) کلکتہ،ستارہ ہند پریس، ۱۳۵۸ء
:دیوان عبیدی ، (اردو) آگرہ میڈکل پریس، ۱۸۷۴ ء
: دستور فارسی آموز،آگرہ،میڈیکل پریس، ۱۸۸۲ء
: قصیدہ در تہنیت ملکۂ معظّمہ وکٹوریا،کلکتہ اردو گائیڈ پریس، ۱۸۷۷ء
:طریق الرشاد فی تحقیق جواز اقامۃ الجمعۃ والاعیاد فی ہذہ البلاد ،آگرہ،میڈیکل پریس، ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ ء
:داستان عبرت بار(غیر مطبوعہ) ڈھاکہ یونیورسٹی لائبریری

عبیدالحق : تذکرۂ اولیاء بنگالہ،نواکھالی،حمیدیہ لائبریری

عبدالحی اختر : کلمۃ الحق (مقام اشاعت وسن اشاعت مذکور نہیں)
: براہین جیاد فی سد باب الالحاد، کان پور،احمدی پریس ۱۳۰۲ھ /۱۸۸۴ء
: تربیت الاطفال،کلکتہ،کلیمی پریس، ۱۹۰۶ء

عبدالحلیم عاصم :نالۂ عاصم، لکھنو،نول کشور پریس

عتیق اللہ شیدا :خدا کی شان،لکھنو،قومی پریس،۱۸۸۹ء

عتیق صدیقی :گل کرسٹ اور اس کا عہد ،دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۷۹ء

عشرت رحمانی : اردو ڈراما کا ارتقا، لاہور،شیخ غلام علی، ۱۹۷۸ء

علی حسن خان : صبح گلشن، پھوپال، ۱۲۹۵ ھ

علی عباس حسینی : ناول کی تاریخ و تنقید،لکھنو،انڈین بک ڈپو، ۱۹۷۸ ء

علی قلی : بادشاہی و بادشاہان ایران،(فارسی) وزارت فرہنگ،ایران

علی لطف میرزا : گلشن ہند،لاہور،دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۰۶ء

☆☆ غ ☆☆

غلام احمد فرقت کاکوروی : اردو ادب میں طنز و مزاح،لکھنو،ادارۂ فروغ اردو،۱۹۵۷ء

غلام حسین طباطبائی : سیر المتاخرین، کراچی،اکیڈیمی، ۱۹۶۸ء

غلام حسن سلیم : ریاض السلاطین، (تاریخ بنگلہ) کلکتہ، پٹیس

غلام رسول مہر : مختصر تاریخ الاسلام، لاہور، شیخ غلام علی سنز، ۱۹۶۲ء

غلام ہمدانی : تذکرہ ہندی، لکھنو، محمدی پبلیشرز، ۱۹۸۰ء

☆ف☆

فرمان فتح پوری :اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، لاہور، مجلس ترقی ادب،۱۹۷۲ء

:فن تاریخ گوئی اور اس کی روایت، لاہور، سنگ میل،۱۹۸۴

فیاض محمود و عبدالقیوم : تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، لاہور پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء

فقیر محمد : جامع التواریخ، لکھنو، نول کشور پریس، ۱۸۹۷ء

فتح اللہ ویسی : دیوان ویسی، کان پور، قومی پریس، ۱۹۳۵ء

فضل ربی خوندکار : حقیقت مسلمانان بنگالہ، مرشد آباد، رئیس الاخبار پریس مرشد آباد، ۱۸۹۱ء

فیروز الدین : فیروز اللغات (فارسی) لاہور، فیروز سنز، ۱۹۸۶ء

: فیروز اللغات (اردو) لاہور، فیروز سنز، ۱۹۷۶ء

☆ک☆

کارنوالس، ایم : ہند کے حکمران، دکن، جامع عثمانیہ، حیدر آباد، ۱۹۲۳ء (مترجم عبدالستار)

:فریاد عاصی، کلکتہ، رضوانی پریس، ۱۹۱۲ء

کرامت علی مولانا جونپوری : ذخیرہ کرامت (اول) کان پور، محمدی پریس ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۴ء

: ذخیرہ کرامت (دوم) کان پور، مطبع مجیدی، ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۹ء

: ذخیرہ کرامت (سوم) ڈھاکہ، امدادیہ لائبریری، ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۶۲ء

☆گ☆

گل کرسٹ : قواعد زبان اردو

☆ل☆

لالہ سرام : خمخانۂ جاوید، لکھنو، نولکشور، ۱۹۵۷ء

لطف مرزا، علی : تذکرۂ گلشن ہند، پٹنہ، ادارہ تحقیقات عربی، ۱۹۷۲ء

لطیف الرحمٰن، سید : نساخ سے وحشت تک، کلکتہ عثمانیہ بک ڈپو، ۱۹۵۱ء

لیتکر علیم ایل : انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم، لاہور، شیخ غلام علی، ۱۹۵۸ء

(مترجم غلام رسول مہر)

☆م☆

مارشمن، جے۔ سی : تاریخ ہند (عہد برطانیہ) حیدر آباد، جامعہ عثمانیہ،۱۹۲۳

مارشمین جان کلارک : تواریخ ہند (زمانہ قدیم سے مغلوں کے آغاز سلطنت تک)
کلکتہ بیپٹسٹ مشن پریس،۱۸۹۳ء

مانفرید ۔اے : مختصر تاریخ عالم، ماسکو، دارالاشاعت،۱۹۸۹ء

محمد آزاد، نواب : نوابی دربار، لاہور، مکتبہ خیابان ادب ۱۹۶۶ ء
:خیالات آزاد، لاہور مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۶۷ء

محمد اصغر نقشبندی : جنگ ہفت سالہ لکھنو، قومی پریس، ۱۸۸۹ ء

محمود آزاد ،نواب : دیوان آزاد، جلیل المطابع ، ۱۳۰۷ھ /۱۸۸۹ء

محمد اکرام شیخ : حیات غالب، لاہور فیروز سنز، (سن اشاعت درج نہیں)

محمد حسین تبریزی : برہان قاطع لکھنو، نولکشور پریس، ۱۳۰۷ ھ /۱۸۸۸ء

محمود احمد فاروقی : ترجمہ منتخب التواریخ بدایونی، لاہور،
شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۶۲ء

محمود خان شیروانی : پنجاب میں اردو، لاہور، معین الادب، ۱۹۴۹ء

منیر ابوالبرکات ؛ مثنوی در صفت بنگالہ، کراچی، پاکستان پبلیکیشنز
سن اشاعت مذکور نہیں

مطیع الرحمٰن ،محمد : آئینہ ولیسی، پٹنہ، لیبل لیتھو پریس،۱۹۷۶ء

منیر الدین یوسف : اردو ساہتیہ ایتیہاش، ڈھاکہ، بنگلہ اکیڈیمی،۱۹۶۷ء

محی الدین قادری زور : دکنی ادب کی تاریخ، کراچی، اردو اکیڈیمی، سندھ ۱۹۶۰ء

مسعود حسن رضوی : اردو ڈراما اور اسٹیج لکھنو، کتاب نگر، ۱۹۵۶ء

مسعود حسین داکتر : اردو زبان اور ادب، علی گڑھ ایجوکیشنل ہاوس ۱۹۵۶ء

مسعود عالم ندوی : محمد بن عبدالوہاب، کراچی، مکتبہ خدام ملت، ۱۹۴۹ء

مرزا علی لطف : گلشن ہند ،لاہور، دارالاشاعت، ۱۹۰۶ء

مشتاق احمد : مغربی بنگال کے اردو شعراء، کلکتہ،
اقبال احمد اینڈ برادرس، ۱۹۷۲ء

میلکم سرجان : سیاسی تاریخ ہند ،حیدر آباد، جامعہ عثمانیہ ،۱۹۲۳ء

☆ن☆

نصرت جنگ،نواب : تاریخ نصرت جنگی،کلکتہ،ایشیاٹیک سوسائٹی، ۱۹۰۸ء

نصیرالدین ہاشمی :دکن میں اردو،حیدرآباد،مکتبہ ابراہیمیہ ،۱۹۳۶ء

نصیرالدین حیدرسامی[ؑ] : سہیل یمن،کلکتہ،غوثیہ پریس، ۱۹۱۱ء

نصیرحسین خیال : داستان اردو،حیدرآباد ادارۂ اشاعت اردو،دکن

نوراحمد : انیس شوتو کے ڈھاکا رشاج جیون،ڈھاکہ
بنگلہ اکیڈیمی ۱۹۷۵ء

نور حسین سید : نگارستان سکن ،ریاست بھوپال،بھوپال، ۱۸۹۶[ؑ]

☆و☆

وفاراشدی : بنگال میں اردو،حیدرآباد،مکتبہ اشاعت اردو، ۱۹۵۵ء

وزیرآغا : اردوادب میں طنزومزاح،لاہور،پنجاب اکیڈیمی،۱۹۵۷

ہاشمی سید : تاریخ مسلمانان پاکستان وبھارت،کراچی،انجمن ترقی
اردو،۱۹۵۳ء

BIBLIOGRAPHY

(English)

Abdul Karim, *Social History of the Muslims in Bengal*, Chittagong: Baithsh Sharaf Islamic Research Institute, 1985

Abdur Rahim, *Social and Cultural History of Bengal,*Karachi: Pakistan Publishing House, 1967

Abdus Subhan Dr. (ed), *Tarikh .i. Bangla i Mahabatjangi,* Calcutta: Asiatic Society, 1982

Abeda Hafez Dr, *Tarikh-i- Shah Shujaee* (unpublished Ph.D Thesis), Dhaka University, 1968

Ahmed Kazi, S., *A Geography of Pakistan*, Karachi: Pakistan Publishing House, 1959

Ali Azam, Muhammad, *Life of Moulavi Abdul Karim*, Calcutta: 1939

Azimusshan Haidar (ed), *A City and its Civic body*, Dacca: Dacca Municipality, 1966

Bangladesh Bureau of Statistics, *Statistical Yearbook of Bangladesh*, Dhaka: Secretariate, 1989

Bhatnagar Yatindra, *Bangladesh Birth of Nation*, New Delhi: ISSD Publication, 1971

Borah, M.I. (tr), *Baharistan -i-Ghaybi,* Assam: Department of Historical and Antiquarian Studies, 1938

Bradley-Birth, F.B, *Twelve men of Bengal*, *in the nineteenth Century*, Calcutta: S,K, Lahiri Co, 1968

*The New Encyclopaedia Britannica Vol, I ,*Chicago: The University of Chicago, 1986

The World Bood Encyclopaedia Vol.II Chicago: World Book Inc, 1988

Fazlul Karim, M, *Geography*, Dacca: Dacca Press, 1968

Government of Bangladesh,*The Constitution of the People's Republic of Bangladesh*, 1972

:

Government of Bangladesh, *Preliminary Report of Bangladesh Population Census*, 1981

Government of Bangladesh, *Meet Bangladesh* (Third Edition) Dhaka, Department of Filmes and Publication, 1987.

Government of Bengal, *Report of the Madrasah Education Committee Alipore,* Bengal Gov- Press, 1941

Hussain, S. Syed, *Descriptive Catalogue of Bengali Manuscript*.

Ikram S.M. and Spear P (ed.), *Cultural Heritage of Pakistan*, London: Oxford University Press, 1955

Imamuddin, S.M. (ed), *Tarikhe-i-Bengalah*, Dacca: Asiatic Society, 1979

Imtiaz Hussain Qureshi, *The Administration of the Sultanate of Delhi,* Lahore: Kasmiri Bazar, 1944

Buckland C.C., Bengal Under the Lieutenant Governors.New Dehli: Deep Publications, 1976

Chakravarty, S.R. (ed), *Bangladesh, History and Culture*, New Delhi: South Asian Publishers, 1985

Charles D,Oyly, *Antiquities of Dacca*, London: John Landseer, 1930

Charles peter O, Donnell, Bangladesh Biography of a Muslim Nation, USA: Westview Press: 1984

Charless Steward, *The History of Bengal*, Calcutta: 1910

Dani, Ahmed Hasan, *A Record of its Changing Fortunes Dacca,* Dacca: Saogat Press, 1956

Elliot and Dowson, *History of India as told by its Historians,* Calcutta: Susit Gupta, 1956

Enamuul Haq, Muhammad, *A History of Sufiism in Bengal*, Dacca; Asiatic Society of Bangladesh, 1975

Enamuul Haq, Muhammad, *Abdul Latif his Writings and Related Documents,* Dacca; Samudra Prakashani,1968

Encyclopaedia, Encyclopaedia of the Third World Vol. I London: Mansell Publishing Limited, 1982

Encyclopaedia of the Nation, Asian and Australia, London: The New Caxton Library Serve Limited, 1976

The Far East and Australia, England: Europe Publications Limited, 1984

Momtazur Rahman Tarafdar, *Hussain Shahi Bengal*, Dacca: Asiatic Society of Pakistan, 1965

Muhith, A.M.A, *Bangladesh Emergence of a Nation*, Dacca: Bangladesh Books Intern Ltd, 1978.

Mujeeb, M, *The Indian Muslims*, London: Geo Allen and unwin Ltd., 1957.

Murtaza Ali, Syed, *Personality Profiles*, Dacca: Nipa, 1965.

Murtaza Ali, Syed, *Saints of Bangladesh,* Dacca: 1971.

Nafis Ahmed, *An Economic Geography of East Pakistan*, New Delhi: Vikas Publishing House, 1976

Nafis Ahmed, *Geography of Bangladesh*.

Narendra Nath Law, *Promotion of Learning during Muhammadan Rule*, London: Longmans Green and Co, 1916

Naresh Kumar Jain (ed), *Muslims in India*, New Delhi: Monohar Publication, 1979.

Nazimiddin Ahmed, *Islamic Heritage of Bangladesh*, Dacca, 1982.

Nazimiddin Ahmed, *Discover the Monuments of Bangladesh*, Dacca: The University Press Ltd. 1984.

Rashid, H., *A Systematic Regional Geography*, Lahore: Sk. Ghulam Ali and Sons, 1965

Risley, H.H, *Tribes and Castes of Benga*l, Calcutta: Swcretarial Press, 1981

Jadu Nath Sarkar, *The History of the Bengal*, Vol. II, Dacca University, 1976.

Jadu Nath Sarkar, *Bengal's Nawab*, Calcutta: Asiatic Society, 1952

James Taylor, *Topography and Statistics of Dacca*, Calcutta: Mann Military Orphan Press, 1810

Javerend James Long, *Calcutta and Its Neibourhood*, Calcutta: Indian's Publication, 1974

J.A. Campos, *History of the Portuguese in Bengal*, London: 1913

J.N. Das Gupta, *Bengal in the 16th Century*, Calcutta University, 1914.

Jyotis Chandra Das Gupta, *National Biography for India*, New Delhi: Shahitya Akademi, 1952

Mahamad Bukth Mujadar, *Mujamdar Family of Sylhet*, Calcutta: New Age Press, ND.

Mahmood, Syed, *History of Engilish Education*, Aligarh: M.A.O. College, Aligarh, 1895

Mahmood, S. Haider, *Resurrection of Bangladesh*, Dhaka: National Book Centre, 1983

Mohar Ali, Muhammad(ed), *Nawab Abdul Latif Khan Bahadur-Autobiography and other Writings*, Chittagong: Mehrab Publication, 1968

Mohar Ali, Muhammad(ed),*: History of the Muslims of Bengal, Vol.I*, Riyadh: Imam Muhammad Ibn Saud Islamic University, 1985

SOURCE MATERIAL OF HISTORY
IN PERSIAN AND URDU LITERATURE OF NINETEENTH CENTURY-BANGLADESH

Professor Dr. Umme Salma
Department of Urdu
University of Dhaka, Bangladesh

Preface
Professor Dr. Aslam Jamshedpuri
CCS University, Meerut, UP, India

Edited by
Dr. Mohammad Golam Rabbani
Professor, Department of Urdu
University of Dhaka, Bangladesh

সাহিত্য ও গবেষণা কেন্দ্র
(Center for Literature & Research)

Rounaq Jahan, *akistan's Failure in National Integration,* Dacca: Oxford University Press,1977.

Sajjad Hussain, *East Pakistan: A Profile*, Dacca, 1952.

Spate, O,H,K, *India, Pakistan and Ceylon, The Region*, London: Methuen, 1966.

Sranley Lane-Poole, *The Mohammadan Dynasties*, Delhi: Idarah-I Adabiyat, 1893.

Storey, C.A, *Persian Literature, II*. London: Luzac and Company, 1927.

Sukhwant Singh, *The Liberation of Bangladesh*, Dacca: Bangladesh Edition, 1980

Tafroor Muhammad, Syed, *Glimpses of old Dacca*, Dacca: Eskaton Garden, 1952

Tayyeb A, *Pakistan, A Political Geography*, London: Oxford University Press, 1966

Thomos Roebuck, *The Annals of the College of Fort William,* Calcutta: Hindoostanee Press, 1819

Whitaker's Almanack : 115 th Editon, London: 1983.